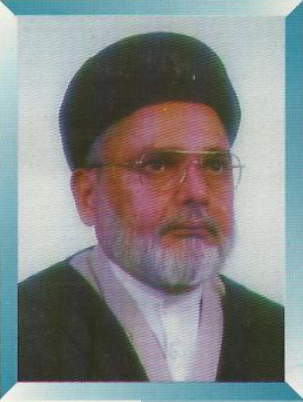


آيَاتُ مَن حُسَيْن دَعَا

ذیشان مجاہد



عَلَامَةُ السَّيِّدِ ذِشَانِ جَدِيدِ جَوَادِي طَائِرُ

عَمَلِ پبلیکیشنز کا بہت کتب

کتاب	قیمت
قرآن مجید (ترجمہ و تفسیر)	350/-
مکالمہ قرآن	200/-
فتح مکہ	250/-
تفصیل ایمان (مکرم)	300/-
نوشہ مصدق (چودہ سارے)	150/-
فہرست کتب	150/-
انعام بنو نصر بن قریش	130/-
نور و فخر	نہیں
امول و فروع	نہیں
ابو طالب بن مومن قریش	150/-
نص و اجتہاد	نہیں
فدک تاریخ کی روشنی میں	50/-
مجھے راستہ مل گیا	50/-
خاندان و انسان	نہیں
کربلا	40/-

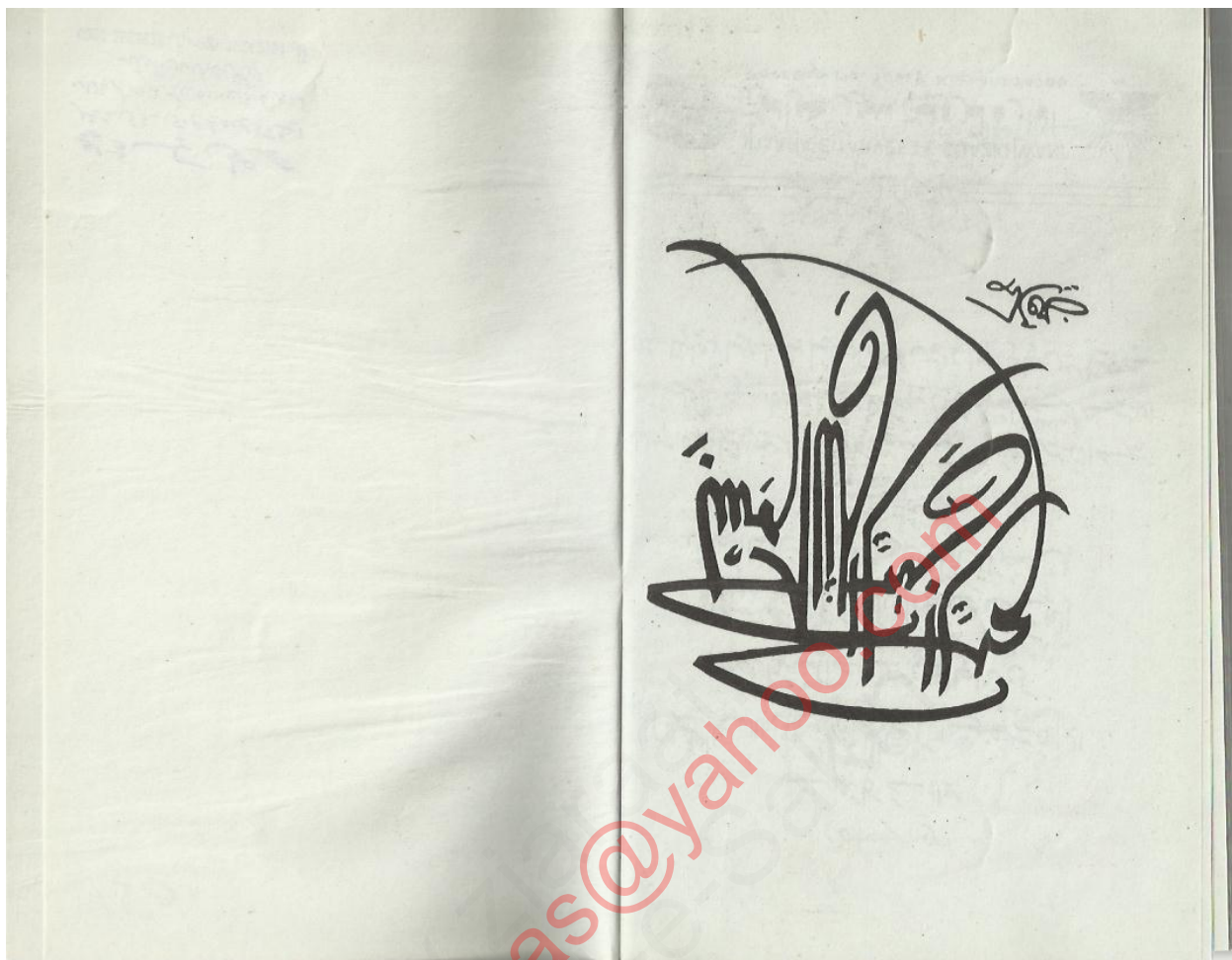
ذیشان مجاہد

مغل و مجاہد	150/-
کربلا سنہ ثانی	100/-
خلق عظیم	100/-
ہفتاد آیت	100/-
عرفان و عبادت	50/-
اسلام دین عقیدہ و فن	50/-
عقیدہ و پیمانہ	50/-

علامہ حسین رضا جعفر نقوی

خطبات جناب قمر	50/-
انعام حسن ابن علی علیہ السلام	50/-
انعام حسین ابن علی علیہ السلام	50/-
مولانا کی زندگی 1993ء	20/-

Phone: 6625610 پاکستان 74700 کراچی 18168



بسمہ سبحانہ

اِنَّا مِنْ حُسَيْنٍ

مجاہد عشرہ محرم الحرام ۱۴۱۶ھ امام بارگاہ اہل بیت

علامہ سید نیشاں حیدر جواد بنی اعلیٰ اللہ تعالیٰ

عصرہ پبلیکیشنز

بنی۔ او باکس نمبر ۱۸۱۶۸ کراچی ۷۴۷۰۰ پاکستان

(۷۸۶ / ۱۱۰)

مولائے کائنات

ابوالائمہ حضرت امام علی بن ابی طالب علیہ السلام

کی مناجاتوں میں سے ایک مناجات

إِلٰهِ كَفَىٰ بِي عِزًّا أَنْ أَكُونَ لَكَ عَبْدًا أَوْ كَفَىٰ
بِي فَخْرًا أَنْ تَكُونَ لِي رَبًّا أَنْتَ كَمَا أُحِبُّ
فَاَجْعَلْنِي كَمَا تُحِبُّ

میرے اللہ میری عزت کے لئے یہی کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں
اور میرے فخر کے لئے یہی کافی ہے کہ تو میرا پروردگار ہے۔ تو ویسا ہی
ہے جیسا میں چاہتا ہوں، پس تو مجھ کو ویسا بنالے جیسا تو چاہتا ہے۔

اشتراک:



IDAARA-E-TARVEEJ-E-SOAZKHWANI

ادارۂ ترویج سوز خوانی

Post Box No. 10979, Karachi-74700



jabir.abbas@yahoo.com

○ جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں ○

نام کتاب :	آنا بین حسین
مؤلف :	علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ
ناشر :	عصمہ پبلیکیشنز کراچی
تعداد اشاعت :	500
تاریخ اشاعت :	اگست ۲۰۰۴ء
طبعات :	عاصم پرنٹنگ ناظم آباد نمبر ۲ کراچی
سیر ڈیلنگ ایجنٹ :	پہلا ایڈیشن
ہدایت :	دوسری
مبشر قانون :	پروفیسر سید سبط جعفر زیدی ایڈووکیٹ
سرو حق (ٹائٹل پرکشش) :	جناب شیخ رفیع زیدی ایڈووکیٹ (ہائی کورٹ)
	سید امتیاز عباس

اشاعت

افتخار کتب ڈپو - اسلام پورہ محرم بچہ لاہور
منہاج الصالحین قرنی اعرف اردو بازار لاہور
مکتبہ ارفضا - ۸ بیمنٹ میاں مارکیٹ - اردو بازار - لاہور
کریم پبلیکیشنز سمیع سینٹر اردو بازار لاہور
کتبائیں دہلی شہر دہلی راولپنڈی
سید عبدالقادر نقوی جی ۵/۲ - اسلام آباد
محرم علی بک ڈپو - G-9/2 کراچی چینی - اسلام آباد
سوہی سچس لائبریری ایڈیشنز سکروہ - بلتستان
عباس سچس بک ایجنسی - وچتر بچہ کھنڈ
حسن علی بک ڈپو - کھارادر - کولہی
رحمت اللہ بک ایجنسی کھارادر - کولہی
صوفی بک ایجنسی - مارتن روڈ - کولہی
ظہران بک سینٹر بریڈ روڈ - کولہی
اوس بک ڈپو - رضویہ سوسائٹی کراچی
انجمن پبلیکیشنز بریڈ روڈ کراچی
میل تحریکات سینٹر بریڈ روڈ کراچی
امجد تحریکات سینٹر انچولی کراچی
مکتبہ علمیہ مرکز تحریکات دھائف رضویہ سوسائٹی کراچی

بسمہ سبحانہ

فہرست مجامع

عرض تنظیم	۵
مجلس استقبال عزرا	۷
پہلی مجلس	۲۹
دوسری مجلس	۵۵
تیسری مجلس	۸۱
چوتھی مجلس	۱۰۳
پانچویں مجلس	۱۲۵
چھٹی مجلس	۱۴۵
ساتویں مجلس	۱۶۹
آٹھویں مجلس	۱۹۱
نویں مجلس	۲۱۵
دسویں مجلس	۲۳۷
گیارہویں مجلس	۲۵۵

jabir.abbas@yahoo.com

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مجلس استقبال عزا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى
سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا اَبِي
الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَاٰلِهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ الَّذِيْنَ
اَذْهَبَ اللّٰهُ عَنْهُمْ الرِّجْسَ وَطَهَّرَهُمْ تَطْهِيرًا
اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهِ
حُسَيْنٌ وَمِثِّيْ وَ اَنَا مِنْ حُسَيْنٍ۔

حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔ اللہ اس سے

محبت کرے جو حسین سے محبت کرے۔

سرکارِ دو عالم کے اس ارشادِ گرامی کی روشنی میں سالِ گذشتہ عرفانِ امام حسینؑ کے ذیل میں جو موضوعات آپ کے سامنے پیش کئے جا رہے تھے ان کے اختتام پر یہ اعلان کیا گیا تھا کہ انشاء اللہ یہ سلسلہ کلام اگلے سال بھی جاری رہے گا چنانچہ اس سال اسی کی تکمیل کے لئے جو سلسلہ کلام کل سے شروع ہو گا اس میں اسی موضوع سے متعلق اپنے گزارشات آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔ آج استقبالِ عزا کے سلسلہ سے چند باتیں مختصر گزارش کرنا ہیں اور اصل موضوع کا آغاز انشاء اللہ کل سے ہو گا۔

ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جو ہر صاحبِ فہم اور دیندار انسان کے لئے قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا کا کوئی موضوع اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو شریعت کے

ادعیہ و زیارات

گوہر یگانہ

امام عصر عجل اللہ فرجہ
لنصلی اللہ علیہ وسلم

علامہ السید ذیشان حیدر خاں اعلیٰ اللہ تعالیٰ

عصمہ ایڈیٹنگ سٹیشن

بلی۔ او باکس نمبر 18168 کراچی 74700 پاکستان

حدود سے بالاتر ہو "ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِّ ذِيكَ مِنَ الْأُمَمِ" پروردگار عالم نے اپنے پیغمبر سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ ہم نے آپ کو حکم کے راستہ پر لگا دیا ہے۔ آپ اسی راستہ پر چلتے رہیں۔ یعنی پیغمبر اسلام کی پوری زندگی کا کمال ہی یہ ہے کہ یہ زندگی پابند شریعت تھی اور سرکار کی زندگی میں کوئی عمل ایسا نہیں تھا جو قانون الہی سے ہٹ گیا ہو یا مرضی الہی کے خلاف ہو گیا ہو۔ کسی صاحب عصمت کا سب سے بڑا کمال کہ درایہ ہوتا ہے کہ وہ معصوم ہوتا ہے یعنی کوئی کام مرضی پروردگار کے خلاف نہیں کرتا ہے اور اسی مرضی پروردگار کے بیان کا نام ہوتا ہے شریعت۔

پروردگار اپنی مرضی کا اعلان مرضی کے نام سے نہیں کرتا ہے۔ بلکہ جس چیز کو پسند کرتا ہے اسے واجب بنا دیتا ہے یا مستحب بنا دیتا ہے۔ اور جس چیز کو ناپسند قرار دیتا ہے اگر صرف ناپسند ہے تو بخود کہہ دیتا ہے اور اگر ناقابلِ برداشت ہو تو اسے حرام قرار دے دیتا ہے۔ یہ احکام شریعت کے الفاظ و حقیقت رضائے الہی کے بیان کے لئے بہترین ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ اکثر لوگوں کو خیال پیدا ہوتا ہے کہ رضائے خدا کوئی الگ چیز ہے اور واجب و حرام کے چمکانے الگ ہیں یعنی ہو سکتا ہے کہ انسان نواہیات کی پابندی کرے نہ حرام سے پرہیز کرے اور اس کے بعد بھی رضائے الہی حاصل کر لے۔ یہ بچا رہے شائد خیال کر رہے ہیں کہ رضائے الہی شائد کسی دکان پر ملتی ہے جہاں سے جا کے خرید لیں گے جب کہ رضائے پروردگار پروردگار کے قوانین اور اس کی اطاعت میں ہے۔ اطاعت سے ہٹنے کے بعد کوئی شخص بندہ کی رضا حاصل نہیں کر سکتا ہے تو پروردگار کی رضا کیا حاصل کرے گا۔ اگر باپ بیٹے کو حکم دے اور بیٹا یہ چاہتا ہے کہ اس کا باپ اس سے راضی رہے تو اسے باپ کے احکام پر عمل کرنا ہو گا۔ باپ کی بات کو ٹھکرا کے اگر یہ سوچے کہ باپ راضی رہے گا تو یہ دیوانگی ہے۔ باپ کا تو ایک مرتبہ ہوتا ہے۔ مگر دو دوست ہیں اور ایک دوست نے دوسرے دوست سے کسی بات کا مطالبہ کر دیا تو اگر وہ چاہتا ہے کہ اس کا دوست اس سے راضی رہے تو اسے اس مطالبہ کو بہر حال پورا کرنا ہو گا ورنہ مطالبات کو ٹھکرانے کے بعد یہ امید

رکھنا کہ وہ دوست ہم سے راضی رہے گا ایک خیال خام کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ انسان برا مرد والا ہو یا چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔ جس کو راضی کرنا چاہتا ہے اسے اس کی بات کو ماننا پڑے گا۔ حد یہ ہے کہ اگر باپ بھی اپنی اولاد کو خوش رکھنا چاہتا ہے تو اسے معلوم ہے کہ جب تک اس کے مطالبات پر عمل نہ کرے گا بیٹا خوش نہیں ہو سکتا ہے۔ رضا حاصل کرنے کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ انسان اس کے مطالبات کو پورا کرے جس کی رضا درکار ہے۔ یہ سوچنا جنوں سے کم نہیں ہے کہ انسان احکام کو ٹھکرا دے گا اور اس کے بعد بھی حاکم کو راضی کر لے گا۔ یہ نہ گھر میں ہوتا نہ بازار میں، نہ حکومتوں میں ہوتا ہے نہ شریعتوں میں، نہ دنیا میں ہوتا ہے نہ دین میں، نہ کہیں ہوتا ہے اور نہ کہیں ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جنھیں معصوم کہتے ہیں ان کی تعریف ہی یہ کرتے ہیں کہ معصوم اسے کہتے ہیں جو کوئی گناہ نہیں کرتا ہے۔ یعنی اللہ کے سارے احکام پر عمل کرتا ہے۔ معصوم کے معنی یہ نہیں ہیں کہ احکام خدا سے اونچا ہوتا ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ احکام خدا نیچے ہوتے ہیں اور معصوم اس سے اونچا ہوتا ہے۔

بھلا وہ کون سا انسان پیدا ہو گا جو خدا سے اونچا ہو جائے گا۔ صلوات احکام الہی، احکام الہی ہیں۔ نہ کوئی خدا سے بالاتر ہو سکتا ہے اور نہ کوئی حکم خدا سے بالاتر ہو سکتا ہے۔ ناممکن ہے کہ کوئی بندہ ایسا پیدا ہو جائے کہ جس کا مرتبہ حکم الہی سے بلند تر ہو جائے۔ یہ جو آپ سنتے رہتے ہیں کہ بعض اوقات بعض جاہل لوگ جو نہ حکم خدا کو جانیں نہ خدا کو پہچانیں، نہ شریعت جانیں نہ اس کے قوانین جانیں، ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ احکام خدا کی کوئی اوقات نہیں ہوتی ہے پیغمبر یا امام کے آگے۔ یہ وہ بچا ہے جو یہی نہیں جانتے ہیں کہ حکم خدا کہتے کسے ہیں۔ وہ صرف چند حرکات اور اعمال کا حساب لگاتے ہیں اور یہ طے کر دیتے ہیں کہ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ جب کہ اگر آپ غور کریں تو سرکارِ دو عالم نے جو اعلان فرمایا ہے کہ میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، کتاب خدا اور اپنے اہلیت۔ اسی روایت میں خود آپ نے نقلین کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ان میں جو نقل اکبر ہے وہ کتاب خدا ہے اور اس کے بعد میرے اہلیت ہیں۔ بعض افراد کو تعجب

ہوتا ہے کہ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔ حالانکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ کتاب اللہ چند اوراقی کا نام نہیں ہے کہ اس کا یوں حساب لگا جائے کہ ورق کی حیثیت کیا ہے اور آدمی کا مرتبہ کیا ہے جیسا کہ بعض لوگ حساب لگاتے ہیں کہ کتاب اللہ چند اوراقی ہیں چند تحریروں ہیں، ایک دفعتی ہے کچھ کاغذ ہے۔ اور کہاں یہ سامان اور کہاں انسان لیکن عزیزو! مسئلہ دفعتی اور کاغذ یا اوراقی کا نہیں ہے۔ کتاب خدا کلام الہی ہے احکام پروردگار کا مجموعہ ہے اور احکام پروردگار کی اطاعت ہر انسان پر لازم ہے۔ لہذا حکم ہمیشہ آگے رہے گا اور انسان ہمیشہ پیچھے رہے گا اور انسان کی بلندی یہی ہوگی کہ وہ حکم خدا کو سامنے رکھے۔ جو انسان حکم خدا سے اونچا ہونا چاہتا ہے وہی درحقیقت پست ہو جاتا ہے حکم الہی سے بالاتر دنیا میں کوئی شے نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں جو حکم خدا پر اتنا عمل کرتے ہیں کہ ان کا عمل ہی علامت حکم خدا بن جاتا ہے۔

یہ دنیا داری میں بھی ہوتا ہے اور مذہب میں بھی ہوتا ہے۔ دنیا داری میں اگر دو آدمیوں میں اتنے گہرے تعلقات ہو جائیں کہ یہ وہی کہتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور وہ وہی کہتے ہوں جو یہ کہتے ہوں اور آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ وہ صاحب کیا کہتے ہیں اور ان تک آپ کی رسائی ممکن نہیں ہے تو آپ یہ دیکھ لیتے ہیں کہ یہ صاحب کیا کہتے۔ اور ان کے بیان کو دیکھ کے یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں کسی ملک کا سربراہ عوام کے سامنے اگر نہیں بیٹھتا ہے اور نہ کوئی وزیر اگر بیٹھتا ہے مگر عوام الناس پتہ لگا پتے ہیں کہ سربراہ مملکت یا کوئی منصب دار یا عہدہ دار کیا چاہتا ہے اور اس کا ذریعہ اس کے آس پاس بیٹھنے والوں کی تقریریں اور ان کے بیانات ہوتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب حکومت کا رخ کیلئے اس لئے کہ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں اور ہم کبھی نہیں رہتے ہیں۔ یہی حیثیت ان حضرات کی ہوتی ہے جن کو ہم مصطفیٰ کہتے ہیں کہ وہ خدا کے ساتھ اتنا رہتے ہیں کہ ان کا کوئی ایک عمل بھی مرضی خدا سے الگ نہیں ہوتا ہے وہ ہمیشہ مرضی خدا کی اطاعت کرتے ہیں اور ہم ان کی اطاعت سے مرضی خدا کا اندازہ کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا ہے کہ وہ جو کہہ دیں وہ مرضی خدا ہو جاتا ہے۔ بات

وہی ہوتی ہے کہ ہمارے پاس مرضی کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا ہے اور ان کے قول و عمل سے مرضی خدا کا علم ہوتا ہے۔ ان کا کہنا مرضی خدا ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ مرضی خدا کے پابند ہوتے ہیں۔ منطقی زبان میں دو لفظیں ہیں کہ جب ایک چیز کو دوسری سے پہچانا جاتا ہے تو اس کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بنیاد کو پہچان لیا جاتا ہے تو اس کے آثار پہچان لئے جاتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آثار کو پہچان لیا جاتا ہے تو ان کی بنیاد کو جان لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کسی دروازہ کا قفل کھولنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ دروازہ کھلایا نہیں تو آپ دروازہ کے قفل کو کھلتے ہوئے نہ دیکھیں جیسے ہی آپ دیکھتے ہیں کہ آدمی کے ہاتھ میں کبھی گھوم رہی ہے آپ سمجھ جاتے ہیں کہ دروازہ کھل گیا ہے اس لئے کہ کبھی ذریعہ ہے دروازہ کھلے گا۔ تو جیسے ہی بنیاد کو پہچان لیا آگاہ معلوم ہو گئے۔ اس کے برخلاف اگر ہم نے یہ دیکھنا چاہا کہ کسی گھر میں آگ جلی یا نہیں تو گھر کے اندر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے ہی باہر سے اٹھتا ہوا دھواں دیکھا ہم سمجھ گئے کہ گھر میں آگ جل رہی ہے۔ تو کیا دھوئیں سے آگ جل گئی ہے؟۔ نہیں بات صرف یہ ہے کہ وہاں سبب کے ذریعہ اثر کو پہچانا ہے اور یہاں اثر کے ذریعہ سبب کو پہچانا ہے کہ دونوں میں اتنا گہرا رشتہ ہے کہ کبھی سبب سے اثر معلوم ہوتا ہے اور کبھی اثر سے سبب معلوم ہوتا ہے۔ یہی حال رضائے خدا اور کردار آل محمد کا ہے کہ اگر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ رضائے خدا کیا ہے تو سمجھ لیں کہ یہی کردار آل محمد کا ہے اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ خدا اس عمل سے راضی نہیں ہوتا ہے تو سمجھو کہ آل محمد نے کبھی یہ کام انجام نہیں دیا ہے یعنی اصل کو پہچان لیا تو اثر خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ رضائے خدا کیا ہے تو کردار اہلبیت کو دیکھنے کے بعد رضائے خدا کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ صلوات

تو کبھی رضائے الہی سے کردار معلوم ہوتا ہے اور کبھی کردار سے رضائے الہی معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ فرق اپنی جگہ پر ہے کہ رضائے خدا اصل ہے اور کردار اس کی

فرع ہے۔ اگرچہ دونوں ہوتے ایک ہی وقت میں ہیں مگر صاحبان عقل پہچانتے ہیں کہ کردار سے رضا نہیں پیدا ہوتی ہے بلکہ رضا سے کردار پیدا ہوتا ہے۔ یعنی عمل رضائے خدا کے لئے ہو رہا ہے تاکہ خدا راضی ہو جائے۔ اس کی بہترین مثال قرآن مجید نے پیش کی ہے کہ ایسا نہیں ہوا ہے کہ علیؑ نے نفس ہیچ ڈالا تو خدا راضی ہو گیا بلکہ رضائے خدا ایسا ہی لہذا اس کے لئے نفس ہیچا جا رہا تھا۔ صلوات

مختصر یہ ہے کہ معصوم کا کردار ہو یا غیر معصوم کا کردار ہو، ہر کردار قانون الہی کا پابند ہوتا ہے اور کردار، کردار اسی وقت کہا جاتا ہے جب قانون الہی کا پابند ہو جائے۔ ورنہ اگر قانون خدا سے آزاد ہو جائے گا تو اس کا نام بدکرداری ہوگا کردار نہیں ہوگا تو قانون الہی ایک ایسی شے ہے جو پوری کائنات سے بالاتر ہے اور ہر ایک کا فریضہ ہے کہ وہ قانون الہی پر عمل کرے۔ کوئی بندہ خدا سے اونچا نہیں ہو سکتا ہے لہذا دنیا کا کوئی عمل بھی عمل ایسا نہیں ہو سکتا ہے جو قانون الہی سے بالاتر ہو جائے اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ تو بندگی خدا کا معاملہ ہے، یہاں قانون کی کوئی اوقات نہیں ہے۔ تو اگر قانون کی کوئی اوقات ہی نہیں ہے تو بندگی ہو کیسے؟ اگر کوئی آدمی نماز میں شروع کر دے، ایک نماز پڑھ رکعت کی، ایک ڈھائی رکعت کی، ایک ساڑھے تین رکعت کی، ایک پونے چار رکعت کی، تو سب دریافت کر لے گا۔ اسے بھی یہ کیا ہو رہا ہے اور وہ یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ یہ تو بندگی کا معاملہ ہے۔ اس میں قانون کی کیا ضرورت ہے۔ بندگی، بندگی جتنی ہی اس وقت ہے جب قانون کی پابند ہو ورنہ اگر قانون سے آزاد ہو جائے تو اس کا نام بندگی نہیں آداری ہے۔ آداری الگ ہوتی ہے اور بندگی الگ ہوتی ہے۔ بندگی معنی یہی ہے کہ وہ قانون کی پابند ہو۔ لہذا نہ کوئی نماز ایسی ہو سکتی ہے جو قانون سے بالاتر ہو۔ اور نہ کوئی روزہ ایسا ہے جو قانون خدا سے بالاتر ہو جائے۔ نہ زندگی کا کوئی عمل ایسا ہو سکتا ہے، چاہے وہ دین کا ہو یا دنیا کا۔ ہر عمل کو قانون خدا کا پابند بنا پڑے گا اور جب تک پابند رہے گا اسی وقت تک اس کا نام اطاعت رہے گا، عمل خیر ہے گا اور جیسے ہی قانون خدا سے خوف ہو جائے گا عمل بدترین عمل ہو جائے گا ایک بڑا مسئلہ ہے معرفت کا جس سے نہ جانے دنیا کی کتنی بڑی اکثریت ہے جو غافل اور بے خبر

ہے۔ خدا کے بندے ہیں مگر خدا کو نہیں پہچانتے ہیں۔ جتنی کے امتی ہیں مگر جتنی کو نہیں پہچانتے ہیں، امام کے ماننے والے ہیں مگر امام کو نہیں پہچانتے ہیں۔ بس الفاظ کا کاروبار ہو رہا ہے کہ وہ بندہ خدا کہے جاتے ہیں وہ امتی کہے جاتے ہیں اور وہ چاہنے والے کہے جاتے ہیں، مگر جس کا چاہنے والا ہے وہ اسی کو نہیں پہچانتا ہے۔ ورنہ اگر بندہ خدا کہے تو اسے عظمت خدا کو پہچاننا چاہئے امتی مگر نہیں پہچانتا امتی ہے تو اسے بیوقوفی کی اطاعت کرنا پڑے گی چاہئے والا اگر امام کا چاہنے والا ہے تو جو امام کی زندگی ہے وہی زندگی گزارنا پڑے گی۔ اس زندگی سے ہٹ کے کوئی کام نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر کہیں تاریخ میں کوئی ایک واقعہ چھوٹا، بڑا، معتبر غیر معتبر مل جائے جس کی لوگ تلاش میں رہتے ہیں کہ کہیں سے کوئی کہانی، قصہ، واقعہ مل جائے جس کے کوئی راستہ نکل آئے اور ہم آزاد ہو جائیں اور قانون الہی کے پابند نہ رہیں اور سب سے زیادہ معتبر وہی واقعہ ہو جائے حالانکہ واقعات کی صحت قرآن وحدیث کی پابند ہے۔ واقعات سے قرآن مجید کی تائید یا تردید نہیں کی جا سکتی ہے۔ میں ایک مقام پر تھا اور یہ گزارش کر رہا تھا کہ کسی روایت کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کے دو ذریعہ ہوتے ہیں۔ ایک ذریعہ علماء نے ایجاد کیا ہے وہ سولے در دوسرے کچھ نہیں ہے۔ راوی کے حالات دیکھئے کہ اگر ایک روایت میں پچیس نام آگئے ہیں تو چالیس پچیس لوگوں کے حالات پڑھے جس آدمی کے حالات اٹھا کے دیکھئے اس کے حالات لکھنے والوں میں بھی اختلاف ہے۔ ایک صاحب کہہ رہے ہیں کہ معتبر دوسرے صاحب کہہ رہے ہیں کہ غیر معتبر ہے۔ اب پہلے ان کے حالات پڑھے کہ معتبر کہنے والے کی اوقات کیا ہے، اور غیر معتبر کہنے والے کے حالات کیا ہیں۔ جب ان کے حالات پڑھا شروع کئے تو معلوم ہوا کہ ان کے حالات لکھنے والوں میں بھی اختلاف ہے۔ ایک کا کہنا ہے کہ نہایت ہی محقق و دہشت تھے۔ دوسرا کہتا ہے کہ ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے جس کو چاہا اونچا کر دیا، جس کو چاہا گرا دیا۔ اب جانیے ان کے حالات پڑھے کہ جن صاحب نے تعریف کی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، ان کی اوقات کیا ہے، اور جو صاحب مذمت کر رہے ہیں ان کی اوقات کیا ہے۔ یوں ہی لگے رہے۔ ایک روایت کو طے کرنے کے لئے سیکڑوں انسانوں کے حالات پڑھے اور جب حالات تک پہنچے تو پھر ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ یہ تو راویوں کے حالات

jabir.abbas@yahoo.com

ہو گئے اب روایت کے حالات بڑھے کہ الفاظ کیا ہیں۔ لغت کیا ہے، معاوہہ کیلئے، اصطلاح کیلئے۔ اُس زمانہ میں معنی کیا تھے۔ آج معنی کیا ہیں یہ ایک طویل درد سر کا سلسلہ ہے جو علمائے ایجاد کیلئے اور ایسا راستہ ہے جس پر چلنے کے لئے پچاس سال، سو سال کی عمر چاہیے۔ جب کہ ایک دوسرا آسان ترین راستہ اور ہے جو مومنین نے نکال لیا ہے کہ جو روایت اپنے مطلب کی ہو، وہ یقیناً معتبر ہے اور جو ذرا اپنے مزاج کے خلاف ہو وہ امام بھی فرمائیں تو اس پر غور کرنا پڑے گا۔ یہی ہے معیار جس پر سارا کاروبار چل رہا ہے۔ باقی سب تو کتابوں میں ہے اور علماء جانتے ہیں۔ ایک نہیں اس سلسلہ میں ایک سو تجربات ہیں۔ کہنے تو ابھی یہیں بیان کر دوں اور آپ سب لوگ میرا ساتھ دیں گے۔ اسی موضوع پر آپ کے مزاج سے ملتی کوئی بات بیان کر دوں تو کوئی مجھ سے نہیں پوچھے گا کہ یہ کہاں لکھا ہے۔ مثلاً اگر میں کہہ دوں کہ جو حضرات باہر بیٹھے ہوئے ہیں انھیں مجلس کا ثواب کم ملے گا اور جو اندر آکے بیٹھ جائیں انھیں ثواب زیادہ ملے گا تو سب گھبرا کر اندر آکے بیٹھ جائیں گے اور کوئی نہ پوچھے گا کہ یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ باہر کا ثواب الگ ہوتا ہے اور اندر کا ثواب الگ ہوتا ہے۔ کتنے ہی علاقہ ہیں جو ماڈرن علاقہ کہے جاتے ہیں اور بیچارے مومنین وہاں مجلسیں کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ انھوں نے کوئی ہال کرایہ پر لے لیا ہے تو ہال آپ کے لئے تو بنا نہیں ہے نہ آپ کی مجلسوں کے لئے بنا ہے وہ تو بنا ہے اپنے کام کے لئے۔ پانچ سو گریبان لگی ہوئی ہیں ہال دینے والا کرایہ پر دے گا تو اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ آپ گریبان اٹھا کر باہر بھٹک دیں۔ لہذا اگر آپ کو مجلس کرنا ہے تو اسی پر کیجیے۔ ذکرنا ہو تو نہ کیجیے۔ اب وہاں یہ بحث شروع ہو جاتی ہے کہ کس پر بیٹھ کر مجلس مٹنی جائے تو ثواب کتنا ملے گا اور اس کو اٹھا کر پیٹھ کیا جائے اور زمین پر بیٹھ جائیں تو ثواب کتنا ملے گا۔ ایک نے کہا جناب ہم تو بیچنے سے مستنہ جلتے آ رہے ہیں "فرش عرا" کرسی عرا تو ہم نے کہیں مٹی ہی نہیں ہے۔ لہذا اگر کرسی کو ہٹا دیں گے تو ثواب زیادہ ہو جائے گا اور رکھ دیں گے تو ثواب کم ہو جائے گا۔ اب ان سے پوچھیں کہ یہ کس کتاب میں لکھا ہے، یہ کس امام نے بتایا ہے کہ چٹائی پر ثواب زیادہ ہے، قبا میں

پر کچھ کم ہو جاتا ہے۔ کرسی پر بیٹھ کر ہو جاتا ہے اور بہترین کرسی ہو تو اور کچھ کم ہو جاتا ہے۔ کسی روایت میں کہیں دیکھ لیں۔ کسی امام نے فرمایا ہے۔ اور اگر فرمایا بھی ہے تو کون چھتا ہے کہ کہاں لکھا ہے۔ کوئی نہیں پوچھتا ہے۔ اس لئے کہ یہ بات مطلب کی ہے لیکن اگر کوئی آدمی یہ کہہ دے کہ میں نے ایک روایت دیکھی ہے کہ جو مجلس میں آگے بیٹھے اس کا فیض ہے کہ پہلے پچاس درہم جمع کرے اس کے بعد مجلس میں بیٹھے تو فزرا کہیں گے کس کتاب میں دیکھا ہے آپ نے۔ کہی امام کی روایت ہے۔ اس کا راوی کون ہے یہ روایت تو ہم نے کبھی نہیں سنی ہے۔ آپ کے سننے نہ سننے کے کوئی روایت معتبر یا غیر معتبر نہیں ہو جاتی ہے۔ ہاں پچاس درہم ملنے کی روایت ہو تو کوئی نہیں پوچھتا کہ کہاں لکھی ہے، اور پچاس درہم دینے کی روایت ہو تو ہر ایک پوچھتا ہے کہ کہاں لکھی ہے۔ اب تو اندازہ ہو گیا کہ نہ معیار راوی ہے اور نہ روایت۔ معیار اپنا مزاج ہے۔ مزاج سے مل جلتے تو سب معتبر ہے چاہے کتنی ہی غیر معتبر کیوں نہ ہو اور مزاج سے الگ ہو جائے تو بالکل غیر معتبر ہے۔ تو جو شخص اپنے مزاج ہی کو معیار شریعت بنالے گا وہ بیچارہ رضائے خدا کے معنی کیا سمجھے گا یا رضائے خدا کس طرح حاصل کر سکے گا۔ صلوات

تو عزیزان محترم! میں یہ گزارش کر رہا تھا کہ کوئی مسئلہ بھی ہو چاہے زندگی کا ہو یا موت کا ہو۔ علم کا مسئلہ ہو یا خوشی کا مسئلہ ہو۔ نماز کا ہو یا روزہ کا۔ مجلس کا ہو یا ماتم کا۔ ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ قانون خدا سے بالاتر ہو جائے۔ ہر مسئلہ کو قانون خدا کی حدود کے اندر رکھنا ہو گا کہ نماز جیسی عبادت جس کو مستون دین کہا گیا ہے وہ بھی دو رکعت سے سواد نہیں ہو سکتی ہے۔ صرف اس لئے کہ قانون خدا کے خلاف ہے تو دنیا کا کوئی عمل بھی ایسا نہیں ہو سکتا ہے جو قانون خدا سے آزاد ہو جائے۔ ہر عمل کو قانون خدا کا پابند بننا پڑے گا اور جب تک پابند رہے گا عمل، عمل کہے جانے کے قابل رہے گا اور جیسے ہی پابندی سے آزاد ہو جائے گا پھر اس عمل کی کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔ خالی ہم سوچتے رہیں گے کہ بہترین عمل ہے۔ کتنے تجربات ہمارے سامنے آتے ہیں جہاں مومنین کے پاس ایک ہی دلیل ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں کچھ نہ بولے۔ سوال یہ ہے کہ آپ اپنے گھر میں بھگڑا کریں ہم کو بولنے

کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اپنے گھریں حلوہ بنائیں، کھائیں ہم سے کیا تعلق ہے۔ لیکن دین کے معاملے میں ہم یا آپ بولتے ہیں تو نہ آپ پروردگار ہوتے ہیں اور نہ ہم پروردگار ہوتے ہیں۔ نہ آپ پیغمبر ہوتے ہیں اور نہ ہم پیغمبر ہوتے ہیں۔ نہ آپ امام ہیں نہ ہم امام ہیں۔ آپ ہم جب بولتے ہیں تو قانون خدا بیان کرتے ہیں۔ اور کس بندہ کی مجال ہے جو خدا سے یہ کہے کہ ہمارے معاملے میں آپ کو بولنے کا حق نہیں ہے۔ وہ امتی بھی کیا بڑے تھے جنہوں نے جو چاہے کر لیا اور کہا کہ نبی کی کیا ضرورت ہے، یہ ہماری ریاست کا معاملہ ہے ہم جس کو چاہیں گے اپنا رئیس بنالیں گے۔ یہ ہماری زندگی کا معاملہ ہے ہم جس کو چاہیں گے اپنا بنالیں گے۔ یہ ہماری قوم کا مسئلہ ہے ہم جس کو چاہیں گے امام بنالیں گے، خدا سے کیا تعلق ہے۔ تو خدا اگر ایسے ہی بے تعلقی ہو جائے تو وہ کون سی دنیا ہے جس کا خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خدا سے بے تعلق تو دنیا نہیں ہو سکتی ہے دین کیسے ہو جائے گا۔ کسی انسان کو یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا ہے کہ انسان یہ طے کر لے کہ جو ہم چاہیں گے ہم طے کر لیں گے۔ نہیں ہر مسئلہ حیات و مصیبت کے ساتھ اگر مسئلہ کا تعلق دین سے ہے تو اسے ہر حال پابند شریعت ہونا پڑے گا۔ اس لئے کہ دین نام ہی قانون خدا کا ہے۔ دنیا داری تو قانون سے الگ ہو بھی سکتی ہے دین تو قانون خدا سے الگ نہیں ہو سکتا ہے۔ تو ہر وہ عمل جس کو آپ دین سمجھتے ہیں ہر وہ عمل جس کو ہم دین سمجھتے ہیں ہر وہ عمل جس کو ہم عبادت سمجھتے ہیں، اُسے سو فیصد قانون پروردگار کا پابند ہونا پڑے گا۔ قانون خدا سے ہٹا نہیں کہ پھر نہ دین ہے نہ مذہب۔ بندگی ہے نہ اطاعت۔ سب سے بڑا تقاضہ معرفتِ حقین کا ہے کہ انسان اس حقیقت کو پہچان لے کہ قانون خدا سے بالاتر کوئی شے نہیں ہے اور سارا کمال کو دارِ انسان کا یہ ہے کہ اپنے کو قانون خدا کا پابند بنا دے۔ جو کام پوری زندگی امام حسین نے انجام دیا ہے۔ امام حسین کی حیات میں کوئی ایک عمل، کوئی ایک لفظ نہیں تلاش کیا جاسکتا ہے جو قانون خدا سے الگ ہو۔ بلکہ سخت ترین اوقات میں بھی انہوں نے پہچنوا یا ہے کہ قانون الہی کا احترام کیا ہے اور یہی ان کی معرفت کا

تقاضہ ہے کہ اگر کوئی انہیں پہچان لے تو اس کی زندگی میں اتنا اثر پیدا ہو ہی جائے گا کہ اس کی زندگی کا ہر عمل حکم خدا کا پابند ہو جائے گا۔ کتنی خالص حیات امام حسین میں اس جو اس انشاؤں کے اندر گواہی دے کر رہا۔ سال گذشتہ تو فقط شخصیتِ امام کے بارے میں باتیں عرض کی تھیں، کردار کے بارے میں تو اسال عرض کروں گا تاکہ آپ کو قہم قدم پر یہ احساس پیدا ہو کہ کردار امام حسین کا سب سے بڑا امتیاز یہی ہے کہ امام حسین کی زندگی کا کوئی ایک عمل بھی قانون الہی اور رضاء پروردگار سے الگ نہیں ہے اور اس سلسلے میں یہ بنیادی نکتہ آپ اپنے ذہن میں محفوظ کر لیں جو آئندہ بھی کام آئے گا کہ کوئی عمل زندگی کا نہ دنیا میں اور نہ دین میں قانون الہی سے بالاتر نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ ہماری زندگی کا اور ہمارے دین و مذہب کا پہلا بنیادی اصول ہے۔ دوسرا مسئلہ جو ہمارے قانون پروردگار کی زندگی کا ہے، کہ کسی شخص کے جذبات و خواہشات کو مذہب کے مقابل میں آزار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ ہر وہ چیز جو مذہب کے خواہشات کی بھی مذہب کے مقابل میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ مقابل میں آئے ہی نہیں ہیں اور ان کے پاس کوئی خواہش مذہب کے مقابل میں پیدا ہی نہیں ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان یہ سوچنے کے لئے تیار ہو جائے تو قانون خدا سے اس کے آگے کسی کی خواہش کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور اس کی بہترین علامت یہ آیت شریفہ ہے جسے آپ صبح و شام پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں اور شاید کتنے آدمیوں نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ خدا نے اس آیت میں کس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے پروردگار عالم یہی سمجھانا چاہتا ہے کہ قانون خدا کے مقابل میں کسی کے خواہشات اور جذبات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ“ پیغمبر اپنی خواہش سے نہیں بولتا ہے۔ خدا کو یہ صفائی دینے کی کیا ضرورت ہے کہ پیغمبر اپنی خواہش سے نہیں بولتا ہے۔ اگر پیغمبر اپنی خواہش سے بولے گا تو کیا ویسے ہی بولنا شروع کر دے گا جیسے ہم اور آپ بولتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ پیغمبر پیغمبر ہے اس کے تو خواہشات بھی مطابق تقویٰ ہوں گے پھر اگر وہ خواہش سے بولتا ہے تو کیا پریشانی ہے۔ مگر پروردگار نے کہا یہ برا نہیں ہے۔ مگر پیغمبر ہونے کے بعد بھی خواہشات سے نہیں بولتا ہے یعنی یہاں پیغمبر

jabir.abbas@yaho

کے خواہشات کا بھی گزر نہیں ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ بولتا کیسے ہے۔ اگر خواہش سے نہیں بولتا ہے تو بولتا کیسے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "اِنَّ هُوَ اِلَّا وَجْہٌ یُّدْعٰی" یہ وہ وحی ہے جو براہِ نازل ہو رہی ہے یعنی پیغمبر کے خواہشات مکمل طور پر وحی خدا کے پابند ہیں اور یہی کمال کر دار ہے۔ تو جب پیغمبر کی خواہش وحی خدا کے مقابلہ میں نہیں ہے تو دنیا میں کسی کو یہ کہنے کا حق کیا ہے کہ یہ ہمارے جذبات کا معاملہ ہے، اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ کے خواہشات کیا مذہب سے اونچے ہو گئے ہیں؟ آپ کے جذبات کیا برد و گار سے بالاتر ہو گئے ہیں؟ مذہب قانونِ خدا ہے کہ جہاں خدا کے علاوہ کسی کو بولنے کا حق نہیں ہے۔ تو جب پیغمبر وحی خدا کے مقابلہ میں نہیں بول سکتا ہے اور جو بولتا ہے وہ خدا کی وحی ہوتی ہے تو امتی کو کیا اختیار ہے کہ وحی کا راستہ الگ ہو جائے اور خواہشات کا راستہ الگ ہو جائے۔ قانون آیا ہے خواہشات کو پابند بنانے کے لئے۔ لہذا ہر انسان کو اپنے خواہشات اور جذبات کو قانونِ خدا کا پابند بنانا پڑے گا، ورنہ ذرا آزاد چھوڑ دے گئے تو مذہب کا نام بھی نہیں رہ جائے گا۔ دنیا میں صرف لامذہبیت ہے گی اور صرف بیدینی کا رواج رہے گا۔ مالک نے اہلبیت کے بارے میں بھی ارشاد فرمایا ہے "وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰهُ" تم کچھ چاہتے ہی نہیں ہو، بس وہی چاہتے ہو جو خدا چاہتا ہے۔ گویا وہاں بولنے کو پابند بنادیا اور یہاں چاہت پر پابندی لگا دی۔ تو جب معصوم پابند ہو گئے تو آزاد کے چھوڑا جائے گا۔ صلوات

مذہب میں نہ کسی جذبہ کو آزاد چھوڑا جاسکتا ہے اور نہ کسی خواہش کو آزاد چھوڑا جاسکتا ہے۔ اور ہمیں سے کردار پہچانے جاتے ہیں کہ انسان جذبات کو کیسے پابند قانون بناتا ہے اور ہم میں یہ صلاحیت ہے یا نہیں۔ آپ جہاں سے چاہتے ہیں پڑھنا شروع کر دیجئے۔ جتنے واقعات ہم اور آپ صبح و شام سنتے رہتے ہیں انہیں کی حقیقت کو پہچان لیں۔ جس دن مولائے کائنات کے گلے میں رسی باندھ کر گھر سے نکالا گیا، مدینہ رسول میں پیغمبر کے بعد سب سے پہلا حادثہ تاریخ اسلام کا

پیش آیا۔ شہزادی کائنات کا دروازہ جلا اور مولائے کائنات کو رسی میں باندھ کے گھر سے نکالا گیا۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت سلمان کہاں تھے؟ کیا کسی اور ملک کی طرف سفر کر گئے تھے۔ ابوذر کہاں تھے؟ عمار کہاں تھے؟ مقداد کہاں تھے؟ اور چاہنے والے کہاں تھے؟ سب مدینہ میں تھے یا سب کو فیلے گئے تھے؟ اسی مدینہ میں ہی تو تھے کہیں باہر تو نہیں چلے گئے تھے؟ تو آخر یہ سب چاہنے والے تھے یا نہیں؟ اگر ہم وہاں ہوتے تو ہم تو اس کا انتظار بھی نہ کرتے کہ مولائے کائنات فرما رہے ہیں۔ مولائے اجازت دیتے یا نہ دیتے ہمارے جذبات تو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ مولائے گلے میں رسی ہو اور ہم کھڑے دیکھتے رہ جائیں، ہم تو وہیں لڑکھڑکے ختم ہو جاتے لیکن مشکل یہ ہے کہ ختم ہو جاتے مسلمان نہ ہوتے۔ مرنے جاتے لیکن ابوذر نہ ہوتے۔ ابوذر وہی ہے جو زندہ رہ گئے۔ سلمان وہی ہے جو زندہ رہ گئے۔ وہی دسویں اور نویں درجہ پر فائز ہوئے ہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیان فرق یہی ہے کہ ہم جو سوچ رہے ہیں کہ ہم یہ واقعہ دیکھتے تو مولائی بدواہ بھی نہ کرتے اور اپنے جذبات کی بنا پر میدان میں کود پڑتے۔ مگر وہ وہ تھے جو جذبات کو روکے ہوئے تھے اور مولائی مرضی دیکھ رہے تھے کہ کردار جذبہ سے طے نہیں ہوتا ہے۔ کردار مرضی سے طے ہوتا ہے۔ صلوات

یہ چاہنے والے جو صاحبانِ کردار ہیں ان کے صاحبانِ کردار ہونے کا راز یہی ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ مولائے میں ابھی اشارہ کر دیں تو جان دیدیں گے اور ظالموں کی جان لے لیں گے۔ لیکن اگر مولائے خاموش رہیں گے اور اجازت نہیں دیں گے تو پھر کچھ وہ برداشت کر رہے ہیں ہم بھی برداشت کر لیں گے۔ یہ ایک جذباتی مسئلہ تھا جس کو آپ نے دیکھ لیا۔ اس سے بالاتر ایک اور جذباتی مسئلہ تھا جو اس کے بعد پیش آیا کہ سپاہی، مجاہد ختم کھانا ہوا اڑتا ہوا، جہاد کرتا ہوا میدان میں آگے بڑھتا ہوا چلا جا رہا ہے اور وہاں تک پہنچ گیا ہے کہ اک دو قدم آگے بڑھائے تو ایک تلوار سے جنگ کا فیصلہ ہو جائے۔ فتح قہوں میں ہے کچھ بچا نہیں ہے۔ یہ سب رحمتیں برداشت کرنا چاہی ہیں۔ ایک دو دن نہیں ایک رات سے مجاہدین لڑ رہے ہیں

مرہے ہیں، جائیں زے رہے ہیں اور وہ موقع آگیا ہے کہ اب فتح قدوں میں آگئی ہے۔ فقط دو قدم آگے بڑھنے کی دیر ہے۔ غیے میں داخل ہوں حملہ کریں اور ظالم کا خاتمہ کر دیں۔ لشکر فرار کر جائے اور سارا میدان جہاد اپنے قبضہ میں آجائے کہ ایک مرتبہ آواز دی مالک ہیں! خبردار قدم آگے نہ بڑھنے پائیں۔ اور مالک نے اٹھی ہوئی تلوار کو روک لیا۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کا کیا حال ہوتا۔ لیکن اگر مجھ میں اتنی ہیست ہوتی اس طرح جہاد کرنے کی اور میں نے اتنی محنت کی ہوتی اور زخمی ہو کر اپنے کو دہاں تک پہنچا دیا ہوتا تو میں تو دو قدم آگے بڑھا کر ظالم کا خاتمہ ہی کر دیتا۔ اگر بعد میں مولا کہتے کہ یہ تم نے کیا کیا، میں تو منع کیا تھا، تو میں عرض کرتا۔ حضور! اگر میں نے غلط کیا تو یہ گردن بھی حاضر ہے اسے آپ کاٹ دیجئے لیکن میں اس ظالم کو بہر حال برداشت نہیں کر سکتا۔ اتنی محنت کے بعد میں اسے زندہ چھوڑ دوں اور فتح قدوں میں اگر نکل جا مجھ سے نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ میں نے غلط کیا ہے تو گردن حاضر ہے۔ میں مرجانا گوارہ کروں گا لیکن اتنی زحمت کو ضائع کرنا گوارہ نہیں کروں گا۔ لیکن عزیزو! یہ کام اگر نکل ہو گیا ہوتا اور مالک نے بڑھ کر حاکم شام کا گلا کاٹ دیا ہوتا اور بظاہر میدان حیت لیا ہوتا تو شاید علیؑ یہ کہہ دیتے کہ بڑا اچھی تھا، بڑا جری تھا، بڑا بہادر تھا، بڑا سورا اور اذیت تھا، بڑا لڑنے والا تھا۔ مگر یہ بھی نہ کہتے کہ میرے لئے ویسا ہی تھا جیسے میں رسول اللہ کے لئے تھا۔ صلوات

یہ سند جو مالک اشتر نے حاصل کی ہے یہ طاقت کا نتیجہ نہیں ہے اطاعت کا نتیجہ ہے۔ میں نے کبھی مرضی رسولؐ سے ایک قدم آگے نہیں بڑھا یا ہے اسی طرح مالک بھی کبھی میری مرضی سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ نہ میں نے مرضی پیغمبرؐ سے انحراف کیا تھا اور نہ مالک نے میری مرضی سے انحراف کیا ہے۔ بہادری کوئی ہنر نہیں ہے، بہادری کا پابند رہنا ہونا ہنر ہے۔ ورنہ بہادری کا تقاضہ تو یہی تھا کہ خیر تک پہنچ گئے تھے تو غلا کاٹ دیتے۔ مگر گلا کاٹ دینا شجاعت اور بہادری نہیں ہے، اس کی شان کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ اگر نفس درمیان میں نہ آنے پائے تو شجاعت ہے، ورنہ مار پیٹ ہے عجمت نہیں ہے۔ قتل و خون کی دنیا الگ ہوتی ہے اور دین و مذہب کی دنیا الگ ہوتی ہے۔

تو ایک منزل مدینہ میں دیکھی اور ایک مرحلہ صفین میں دیکھا کہ اگر وہاں جذبات پر قابو پایا تو سلمان، الذہر، مقداد اور عمار ہو گئے۔ اور یہاں جذبات پر کنٹرول کر لیا تو مالک اشتر ہو گئے۔ اور پھر لوہی آپ آگے بڑھنے چلے جائیں۔ تاریخ میں دونوں طرح کے نام ہیں اور دونوں طرح کے چاہنے والے ہیں۔ امام حسن کی صلح کے بعد ایک چاہنے والے نے آکر کہہ دیا، "اَللّٰهُمَّ عَلَیْکَ یَا مُذِلُّ الْمُؤْمِنِیْنَ" آپ مولا ہیں سلام تو ہم کریں گے جی، مگر کام آپ نے بہت غلط کیا ہے۔ یہ بھی ایک عجیب قسم ہے مولا ہونے کی۔ سلام بھی کریں گے اور اعتراض بھی کریں گے کہ کام جو آپ نے کیا ہے اس سے آپ نے ہم کو گول کو ذلیل کر دیا ہے۔ استغفر اللہ۔ یہی ایک لفظ ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہ گیا ہے اور کر دار کے دامن پر ایک دھبہ بن گیا ہے کہ اگر وہ امام ہیں تو ان کے عمل پر تبصرہ کرنا یہ غلام کام نہیں ہے۔ اگر وہ جانشین پیغمبرؐ ہیں تو وہ جو کچھ کر رہے ہیں آپ کا کام یہ ہے کہ آنکھ بند کر کے اسے قبول کر لیں۔ کسی آدمی کو یہ حق نہیں دیا گیا ہے کہ وہ امام کے بارے میں کہے کہ آپ نے ہم کو ذلیل کر دیا ہے۔ امام کے صدقہ میں تو صاحبانِ ایمان کو عزت حاصل ہوتی ہے اب امام کے بارے میں یہ کہنے کا کون سا حق ہے اور ایمان کی یہ کون سی قسم ہے برداشت نہ کرنے کا نام مذہب نہیں ہے۔ تو عزیزو! ایک لفظ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جزو تاریخ بن گیا ہے تو ان لوگوں کی بات کا کیا اعتبار رہ گیا جو قدم قدم پر پیغمبرؐ پر اعتراض کرتے رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ امام حسن کا کام عوامی جذبات کے خلاف تھا مگر مسئلہ جذبات کا نہیں تھا۔ مسئلہ مصلحت دین اور قانون پر درکار کا تھا۔ اگر رضائے الہی میں ہے کہ تخت پر وہ بیٹھ جائے تو بیٹھ جائے اگر رضائے الہی میں ہے کہ مصیبتیں ہم برداشت کر لیں تو ہم مصیبتیں برداشت کر لیں گے اس لئے کہ مذہب میں کسی کے جذبات کا کوئی دخل نہیں ہے۔ مذہب قانون پر درکار کی پابندی کا نام ہے۔ لہذا!

jabir.abbas@yahoo.com

اگر محمد کا یہی شمار اور یہی طریقہ کار رہا ہے کہ کوئی قدم بھی راہِ رضائے پروردگار سے ہٹنے نہ پایا۔ پس میرا اپنے سلسلہ بیان کو اس منزل پر لے آیا جہاں جذبات آپ سے اور ہم سے لاکھ گنا زیادہ ہیں مگر فرق یہ ہے کہ ہمارے پاس ادنیٰ جذبات ہیں تو ہم تباہ حاصل کرنا نہیں جانتے ہیں ان کے پاس ہم سے کروڑوں گنا زیادہ جذبات بہت پائے جلتے تھے مگر جیسے جذبات تھے ویسے ہی قوت برداشت بھی تھی۔ وہ جذبات پر قابو حاصل کرنا بھی جانتے تھے تاکہ دنیا یہ پہچان لے کہ قانونِ الہی سے بالاتر کوئی چیز نہیں ہے ورنہ کون ایسا انسان ہے جس کے پاس جذبات نہیں ہیں اور اسی فرق کو مورخین نے نہیں پہچانا اور خاصا خدا کی تاریخ کو اپنی تاریخ پر قیاس کرنا شروع کر دیا اور بے شمار غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ یہ استقبالِ عزاء کی مجلس ہے لہذا محرم سے قبل کے واقعات کی طرف آپ کے لے جانا چاہتا ہوں تاکہ آپ وہاں پہچانیں کہ اللہ کے بندے کیسے اپنے جذبات پر قابو حاصل کرتے ہیں اور جن لوگوں نے ان کے کردار کو نہیں پہچانا ہے وہ کیسے ان کی زندگی اور ان کے کردار کو جذبات کے سانچے میں ڈھال دینا چاہتے ہیں۔

دو روایتیں مورخین اسلام نے بنائی ہیں اور دونوں میں صاحبانِ کردار کے کردار کو نہیں پہچانا ہے۔ ایک روایت یہ تیار ہوئی کہ جب امام حسینؑ نے جنابِ اہل کو بھیجا اور اس اجتماع کے ساتھ بھیجا کہ "انی باعث الیکم احی و ابن عقی و ثقی مسلم بن عقیل" کو فدوا لو! پس اسے بھیج رہا ہوں جو میرا بھائی ہے، میرے چچا کا بیٹا ہے اور میرا معتدلیہ ہے جس کا نام ہے مسلم بن عقیل۔ امام حسینؑ نے مسلم کو بھیج دیا۔ مورخ کہتا ہے کہ مسلم چلے اور جو آدمی اپنے ساتھ لے کر چلے تھے راستہ بتانے کے لئے۔ راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا تو مسلم نے ایک مقام پر ٹھہر کر امام حسینؑ کو خط لکھا کہ میرے ساتھ جو لوگ جا رہے تھے وہ سب دنیا سے رخصت ہو گئے اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سفر مبارک نہیں ہے۔ لہذا حضور اگر آپ مجھے معاف کر دیں تو میں واپس چلا آؤں۔

یہ مورخ بچارہ کون ہے؟ یہ وہی ہے جس نے اپنے جیسے مسلمان دیکھے ہیں اور انھیں مسلمانوں پر مسلم کا بھی قیاس کر لیا ہے۔ حالانکہ مسلم صرف بُزدلی اور بہت کا نہیں ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کے اعتبار سے شریعت اسلام میں نال نیک کی جگہ تو ہے لیکن نال بد کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ اسلام میں اصلاً جائز ہی نہیں ہے۔ آپ اچھے حالات کو دیکھ کر اچھے مستقبل کا اندازہ کر لیں اس کی اجازت تو اسلام نے دی ہے۔ لیکن برے حالات کو دیکھ کر سوچیں کہ انجامِ برا ہوگا اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔

سرکارِ دو عالمؐ جب خود ہجرت کر کے چلے مکہ سے مدینہ کی طرف تو راستہ میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ حضورؐ نے پوچھا بھائی تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا سالم۔ فرمایا "لَقَدْ سَلِمْتُمْ" یعنی ہماری اس راہ میں سلامتی ہے۔ لفظ سالم سے حضورؐ نے سلامتی کی طرف اشارہ فرمایا۔ اس کے بعد آگے بڑھے۔ ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ بھائی تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا ناصر۔ فرمایا "لَقَدْ نُصِرْتُمْ" ہماری نصرت کا بھی انتظام ہو گیا یعنی اچھے اثرات کو دیکھ کر اچھے حالات کا اندازہ کرنا، یہ اسلام میں جائز ہے۔ لیکن بلی نے راستہ کاٹ دیا یا سامنے سے کوئی خالی گھڑا لے کر گذر گیا یا گھر سے نکلے اور کوئی عورت سامنے آگئی اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی خطرہ ہے۔ اسلام نے اسی کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اب یہ مسلمان معاشرہ کی بدقسمتی ہے کہ جو ناجائز تھا وہ کہیں نہیں رہ گیا اور جس کو اسلام نے ناجائز قرار دیا تھا اس کے سامنے دلے ہر گھر میں مل جائیں گے۔ خاص طریقہ سے صنفِ خواتین میں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مذہب انھیں کے دم سے قائم ہے۔ سچ ہے یہ قلیوں کا روگ، یہ خانی برتن کا مذہب، یہ کسی کے راستہ کاٹ دینے کا قانون یہ انھیں کے دم سے قائم ہے ورنہ بچوں کو خبر بھی نہ ہوتی کہ ایسا بھی کچھ ہوتا ہے اور یہ آج کی بات نہیں ہے اور صرف ہندوستان و پاکستان کی بیماری نہیں ہے یہ دور قدیم کی بیماری ہے ہمیشہ سے رہی ہے۔ میں نے ایک روایت میں دیکھا کہ معصوم سے کسی نے آکر پوچھا کہ اگر ہم گھر سے باہر نکلے اور بلی نے راستہ کاٹ دیا تو کیا کریں؟ فرمایا کوئی بریشائی کی بات نہیں ہے اس نے تمہارا راستہ کاٹ دیا ہے تم اس کا راستہ کاٹ دو۔ ارے بلی بیچاری کوئی مزدور تو ہے نہیں کہ وہ گدال لے کر آئی اور اس نے راستہ کھود دیا ہے کہ اب آپ آگے بڑھیں گے تو کیسے بڑھیں؟ کاٹ دیا

کے صرف یہ معنی ہیں کہ آپ یوں جا رہے تھے وہ یوں گزر گئی تو اگر اس کے یوں گزر جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے آپ کا راستہ کاٹ دیا تو کیا اس کا راستہ ہے دہانے سے بائیں۔ اب آپ سیدھے چلے جائیے تو اس کا راستہ کٹ چلے گا۔ اگر انسان اتنا کمزور ہو گیا کہ کئی انسان کا راستہ کاٹ سکتی ہے اور انسان میں اتنا دم نہیں ہے کہ کئی راستہ کاٹ سکے۔ تو یہ انسان دنیا میں کیا کرے گا؟ اب میں نہیں جانتا کہ آپوں کو اتنی اہمیت کس گھر آنے سے حاصل ہو گئی ہے اور کون ان کا باپ تھا جس کی وراثت میں یہ عظمت حاصل ہو گئی ہے۔

تو میں یہ گزارش کر رہا تھا کہ اس غریب مورتی کو یہی نہیں معلوم کہ مسلم مسلم ہیں۔ مسلم قانون الہی جانتے ہیں اور ایسی غلط اور ایسے ہی ہملٹ کو واضح کرنے کے لئے امام حسینؑ نے پہلے دن فرمایا تھا ”تھنچی“ اسے بھیج رہا ہوں جو میرا معتدلیہ ہے۔ اس کا کوئی عمل خلاف شریعت ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میرے اعتقاد کو ٹھیس لگ گئی ہے۔ میں کسی ایسے براعتقاد نہیں کر سکتا جو قانون خدا کا پابند نہ ہو۔ جب میں نے کہہ دیا کہ میرا معتدلیہ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کوئی عمل قانون خدا کے خلاف نہیں کر سکتا ہے۔ یہ ایک روایت تھی جو ابن زیاد کی حمایت میں جناب مسلم کے کردار کو کمزور بنانے کے لئے تیار کی گئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ امام حسینؑ ایک منزل پر ٹھہرے ہوئے تھے جب یہ خبر آئی کہ جناب مسلم کو فد میں شہید کر دئے گئے ہیں تو امام حسینؑ نے اپنے چاہنے والوں کے سامنے یہ خبر بیان کی کہ جس کو میں نے اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا، کو فد والوں نے غداری کر کے اسے شہید کر دیا۔ ابھی آنے والے مسافروں نے یہ خبر سنا لی ہے تو اب بتاؤ تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟ مورتی نے روایت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ اولاً عقیل کو جلال آگیا اور کہنے لگے کہ اب تو ہم کو فد ہی جائیں گے اور جب تک مسلم کا بدلہ نہیں لے لیں گے اس وقت تک ہم کو کون نہیں مل سکتا ہے۔ یعنی سارے جہاد امام حسینؑ کو انتقام خون مسلم کا دنگ دے دیا گیا اور اس کے بعد ایک فقرہ اور جوڑ دیا گیا کہ جب ان لوگوں نے یہ کہا کہ جب تک

ہم بدلہ خون مسلم کا نہ لے لیں گے واپس نہ جائیں گے۔ تو امام حسینؑ نے فرمایا کہ خدا تم کو بڑے خیر دے۔ اچھا تم نے ایسا سوچا ہے تو ہم بھی ساتھ چلیں گے اور پل کے مسلم کے خون کا بدلہ لیں گے۔ گویا امام حسینؑ کو فد میں وارد ہوئے ہیں انتقام خون مسلم کے لئے۔ نہ حق کہیں وہ گیا ہے نہ باطل کہیں وہ گیا۔ نہ اسلام کہیں وہ گیا نہ کفر کہیں وہ گیا۔ جب کہ حسن اتفاق سے امام حسینؑ کو فد گئے بھی نہیں۔ کہ اگر وہ اذنا و لا عقیل نے یہ بات کہی تھی کہ ہم جائیں گے اور جا کر خون مسلم کا بدلہ لیں گے تو بدلہ کہاں لیں گے؟ بدلہ تو کو فد میں لیا جائے گا جہاں والوں نے جناب مسلم کو مارا ہے۔ امام حسینؑ تو کو فد گئے بھی نہیں ہیں بلکہ جب درمیان راہ حرم کا رسالہ حائل ہو گیا۔ ہے تو جو منزل روز اول سے معین تھی امام حسینؑ کا قافلہ اسی منزل پر پہنچ گیا۔ تو نہ جناب مسلم کے کردار میں کوئی کمزوری ہے اور نہ مسلم کے خاندان کے کردار میں کوئی کمزوری ہے کہ وہ صرف انتقام کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ یہ ساری باتیں انھیں لوگوں نے تیار کی ہیں جو کردار امام یا کردار اصحاب امام کو کمزور کرنا چاہتے ہیں اور ان کے سوچنے کے خلاف وہی ہے جو اپنی زندگی کا انداز ہے۔ وہ نہیں جانتے ہیں کہ انصاریہ جیسی کی زندگی الگ ہے۔ خافوہ آل محمد کے کردار کو اس دنیا کے باقی انسانوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اب اگر انھیں پہچانا چاہتے ہیں کہ واقفان کی زندگیاں کیا ہیں، تو زبان میں پست ہنسی پائی جاتی ہے کہ دو آدمی مر جائیں تو سفر ملتوی کر دیا جائے جس کی جہالت و بہمت کا یہ عالم ہو کہ سر سے پیر تک زخموں سے پورے اور چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے۔ لڑنے والے بھی کو فد کی گلیوں میں ہیں کہ اگر مقابلہ میں فوجیں سامنے آئیں، تلواریں چلیں، ہتھیاروں کا مقابلہ ہوتا، طاقتوں کا مقابلہ ہوتا، زور بازو کا مقابلہ ہوتا تو معلوم ہوتا کہ بنی ہاشم کا شیر کیسا ہوتا ہے۔ لیکن ارباب عدا ایک عقیل کا لال اور پانچ شہو کا لشکر سامنے ہے جو جناب مسلم سے جنگ کر رہا ہے۔ تلواریں ہیں، نیزے ہیں، خنجر ہیں اور پشت بام پر عورتیں ہیں۔ ان میں سے کوئی پتھر مار رہا ہے، کوئی انگلیں مار رہا ہے اور ایک مسلم ہیں جو اتنی مصیبتوں کا بیک وقت مقابلہ کر رہے ہیں مگر نہ کہیں

jabir.abbas@yaho

ہمت میں کوئی فرق ہے نہ جرات و شجاعت میں کوئی فرق ہے۔ حدیث ہے کہ جب ظالموں نے محسوس کر لیا کہ اتنے سطوں کے بعد بھی مسلم کو کتنا نہیں کیا جاسکتا ہے اور عقل کا شیر اسی شان سے آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے تو بالآخر راستہ میں ایک گڈھا کھودا گیا اور کرو جیلہ سے اسے بند کر دیا۔ جب جناب سلم اس گڑھے میں گر گئے تو چاروں طرف سے حملے شروع ہو گئے۔ ادھر سے تھوڑے دھڑے آگ درمیان میں جناب سلم۔ کوئی تلوار مار رہا ہے۔ کوئی نیزہ چبھ رہا ہے۔ لیکن اتنے زخم کھانے کے بعد بھی جرات و ہمت کا یہ عالم ہے کہ جب ظالم کے سامنے لاکھ کھڑے کئے گئے تو اطمینان کے ساتھ کھڑے ہو گئے کسی نے کہا تم نے امیر کو سلام نہیں کیا۔ فرمایا کیا میں اس کو اس قابل سمجھتا ہوں کہ سلام کروں اور انجیکٹر علی اللہی خدا آپ کو کسی علم میں نہ ڈالے سولے غم آل محمد کے۔ یہ وہ قرآنی ہے جو اہل حق میں کہلائے پہلے دی گئی ہے مگر راہ پر ملا میں حسین بن علی کی یہ پہلی قربانی ہے۔ اب آپ دیکھیں کہ بندہ رضائے خدا کا کیسا پابند ہوتا ہے۔ اتنا جہاد کیا رضائے خدا کے واسطے لیتے زخم کھائے مرضی الہی کے واسطے، ساری مصیبتیں برداشت کیں ایک پروردگار کو رضائی کھنے کے لئے۔ اب اس کے بعد آخری مرحلہ آیا ہے دیکھیں زندگی کا خاتمہ کس طرح ہوتا ہے۔ ظالم نے کہا کہ انہیں پشت بام پر لے جاؤ اور ان کا گلا کاٹ دو اور لاش کو پشت بام سے نیچے پھینک دو۔ مسلم کو کوئی پروا نہیں ہے۔ ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ پشت بام پر لائے گئے۔ تلوار چلنے والی ہے اور لاش کو ذرہ کی ٹکڑیوں میں بھینچ جانے والی ہے مگر آخری لمحہ میں بھی مسلم نے کہا کہ اتنی ہمت سے دو کرو رکعت نماز پڑھ لوں تاکہ دنیا یہ تو یاد رکھے کہ اتنی مصیبتیں برداشت کیں فقط ایک بندگی کی راہ میں۔ ہمت ملی مسلم نے نماز ادا کی۔ دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد رخ کیا اور دھڑے دھڑے امام حسین آئے تھے۔ آواز دی السلام علیکم خیرکم یا ابا عبد اللہ! مولانا چاہنے والا دنیا سے جا رہا ہے۔ آغا غلام کا آخری سلام لے لیجئے۔ اس کے بعد تلوار ظالم کی چل گئی، سر و تن میں چھرائی ہوئی۔ لاش کو پشت بام سے نیچے پھینک دیا گیا۔ بیروں میں رتی بانہی گئی اور اب کو ذرہ کی ٹکڑیاں ہیں جہاں سلم کی لاش کو کھینچا جا رہا ہے۔ میں کہوں گا مسلم اگر آج تمہاری لاش کو کھینچا جا رہا ہے تو تم نے مولائی غلامی کا حق ادا کر دیا۔ کل علی کے گھٹے میں

رتی تھی اور انہیں کھینچا جا رہا تھا اور آج تمہاری لاش کو کھینچا جا رہا ہے اور اگر آج چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں تو تم نے سفارت کا حق ادا کر دیا کہ کل جب زہرا کا لالہ اکیسلا رہ جائے گا تو چاروں طرف سے حسین پر حملے ہوں گے۔ مسلم اگر آج ایک گھونٹ پانی نہ پی سکے تو تم نے محبت حسین کا حق ادا کر دیا۔ مولانا کو بھی وقت آخر پانی نہ ملے گا۔ اگر آج تم پر کو ذرہ کی ٹکڑیوں میں آگ پھینکی گئی تو تم نے بنی ہاشم کے گھرانے کا حق ادا کر دیا کہ کل ہاشمی گھرانے کے بچوں میں چاروں طرف سے آگ لگی ہوگی اور سیدائیاں ایک خیمہ سے دوسرے خیمہ میں جا رہی ہوں گی اور جب سارے خیمے جل جائیں گے تو خیمے سے یوں باہر نکلیں گی کہ سر کے بال بکھرے ہوں، منہ پر طمانچہ مارتی ہوئی۔ واحمد ادا۔ وا

علیہا۔ واحسیناہ۔

سَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْصَلِبُونَ۔

jabir.abbas@yahoo.com

پہلی مجلس

علم امام حسین علیہ السلام

”حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔ پروردگار اسے دوست رکھے جو میرے حسین سے محبت کرے۔“

۱۸ سالہ ہجری کے آغاز کے ساتھ عشرہ محرم الحرام کی جن مجالس کا آج آغاز ہو رہا ہے ان مجالس کے لئے عنوان کلام وہی ہے جو سال گذشتہ تھا۔ یعنی عرفان امام حسین علیہ السلام۔ سال گذشتہ میں نے یہ گزارش کی تھی کہ کسی انسان کی معرفت کے لئے دو راستے ہوتے ہیں: ایک راستہ اس کی شخصیت کا ہے اور ایک راستہ اس کے کردار اور کارناموں کا ہے۔ سال گذشتہ میں نے جو باتیں آپ کے سامنے گزارش کیں ان کا تعلق تھا شخصیت امام حسین علیہ السلام سے قرآن مجید کی روشنی میں سکر و ظلم کے ارشادات کی روشنی میں، صحابہ کرام کے اعترافات کی روشنی میں اور دنیا اسلام کے مومنین کے بیانات کی روشنی میں۔ آج جو سلسلہ کلام شروع ہو رہا ہے اس کا تعلق امام حسین کے کردار اور آپ کے کارناموں سے ہے، تاکہ میرے سننے والے یہ محسوس کر سکیں کہ ساری دنیا میں جن مظلوم کی صفت عزا بچھائی جاتی ہے اس کا قیاس دنیا کے عام انسانوں پر نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اکثر لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ دنیا میں اتنے بڑے بڑے لوگ زندگیاں گزار کر چلے گئے اور کتنے ایسے ہیں جو مختلف راہوں میں ما

مکمل، ممتاز

وظائف الابرار

ترجمہ:

مولانا سید فرمان علی اعلیٰ الشہ قاضی

ترتیب و پیشکش

علامہ السید جواد حیدر جوادنی

فرزند

علامہ السید فیضان حیدر جوادنی اعلیٰ الشہ قاضی

عصمت پبلیکیشنز

بنی۔ او پاکس نمبر:- 18168 کراچی 74700 پاکستان

jabir.abbas@yahoo.com

گئے، قتل کئے گئے اور کتنے ایسے ہیں جو مفہوم مقامات پر مارے گئے لیکن ان کا تذکرہ چند دنوں سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ آخر ایک ذکر امام حسینؑ میں کی خصوصیت پائی جاتی ہے جو اس تذکرے کو ساری دنیا میں دہرایا جاتا ہے اور ہر سال دہرایا جاتا ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں کچھ گزارش نہیں کرنا ہے صرف اتنی ہی بات کہنا ہے کہ اگر امام حسینؑ کے علاوہ دنیا کے اسلام یا دنیا کے غیر اسلام میں کوئی شخصیت ایسی ہے کہ جس کے ذکر کو اتنا دوام حاصل ہو سکتا ہے اور جس کا تذکرہ ساری دنیا میں ہر سال کیا جاسکتا ہے تو کب اس قوم سے امام حسینؑ نے مطالبہ کیا تھا اور کب دوسرے افراد کو شخصیتوں نے روکا ہے۔ جن کا خیال یہ ہے کہ شخصیتیں امام حسینؑ جیسی یا امام سے بالاتر ہیں۔ انھیں ان شخصیتوں کی یاد ماننے سے کس نے منع کیا ہے کس نے روکا ہے، ان کے چاہنے والوں کے پاس اقتدار بھی ہے، ان کے چاہنے والوں کے پاس دولت بھی ہے، ان کے چاہنے والوں کے پاس دنیا کے سارے وسائلِ اعلام و ابلاغ بھی ہیں کس نے منع کیا ہے نہ جانے والا کوئی وصیت کر گیا ہے کہ میرا ذکر نہ ہونے پائے۔ نہ رہنے والوں میں کوئی روکنے والا اور منع کو نبھالا ہے۔ اگر یہی خیال ہے کہ ایک ہی ذکر کیوں ہوتا ہے باقی تذکرے بھی ہونا چاہئیں تو ایک ذکر ہمارے حصہ میں آیا ہے باقی ذکر آپ کے حصہ میں آئے ہیں نہ آپ میں منع کس نے ہم آپ سے کچھ گزارش کریں گے۔ دونوں میدانِ عمل میں قدم رکھیں اس کے بعد خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ کس ذکر میں باقی رہنے کی صلاحیت ہے اور کس ذکر میں بقا کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ جس ذکر میں باقی رہنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے وہ ذکر باقی نہیں رہتا ہے ذکر کرنے والوں سے۔ اس ذکر میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ذکر کرنے والوں کو باقی رکھتا ہے۔ مٹ گئے وہ لوگ جن کے تذکرے ذکر کرنے والوں سے زندہ تھے اور وہ گئے وہ ظلو میں جن کے تذکروں نے اپنے ذکر کرنے والوں کو زندہ رکھا ہے۔

حسینؑ نہ کسی کے محتاج تھے اور نہ کسی کے محتاج ہیں۔ حسینؑ کل دین کو زندگی

دے رہے تھے آج دین والوں کو زندگی دے رہے ہیں۔ یہ بقیہ دوام اگر قوموں کو حاصل ہوا ہے تو یہ ذکر حسینؑ ابن علیؑ کا صدقہ ہے۔ لہذا اس سلسلے میں نہ کوئی سوال کرنے کی گنجائش ہے اور نہ کسی اعتراض کے اٹھانے کی گنجائش ہے، فقط اتنا پہچان لینا کافی ہے کہ وہ صاحبِ کردار کون تھا جس کا ذکر ساری دنیا میں ہو رہا ہے اور باقی افراد میں وہ کیا کسی پائی جاتی تھی جس کے بنا پر کوشش کرنے کے بعد بھی ان کے تذکرہ کو دوام حاصل نہ ہو سکا۔

میں اس سلسلہ بیان کا آغاز اوصاف و کمالات کی دنیا میں سب سے پہلے تذکرہ علم سرکار سید الشہداء سے کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ ہماری تاریخ مذہب میں کمالات کا آغاز ہی ہوا ہے علم سے۔ اور سب سے پہلے اللہ والوں کے جن کمالات کو پہچانا گیا ہے وہ کمالِ علم ہی تھا۔ اللہ والوں کے کردار میں ان کی شانِ بندگی میں کوئی کمی نہیں تھی، کوئی نقص نہیں تھا مگر پروردگارِ عالم نے اپنے منتخب بندوں کے کردار میں جس صفت کو اولیت کا شرف دیا اور جس صفت کے ذریعہ ان کی عظمتوں کو پہنچوایا ہے ان صفات میں سرفہرست تذکرہ ہے علم کا۔ وہ سب سے پہلا انسان جس کو پروردگارِ عالم نے اس روئے زمین پر اپنا خلیفہ و جانشین بنا کر بھیجا اس کے کمال کا بھی اعلان کیا تو اسی علم کی بنیاد پر۔ بلاشبہ جاہل نہیں تھے، ناواقف نہیں تھے، وہ اپنے پاس سے تو علم لے کر نہیں آئے تھے وہ بھی صاحبانِ علم تھے انھیں بھی پروردگارِ ہی نے علم دیا تھا اور جنابِ آدمؑ کو بھی اللہ ہی نے دولتِ علم سے نوازا تھا۔ مگر جس کو جانشین اور اپنا خلیفہ بنانا تھا اسے بہر حال اتنا علم اور اتنا کمال دینا ہو گا جس کی بنیاد پر کوئی انسان خلافت الہیہ کا اہل ہو سکے۔ مالک نے جنابِ آدمؑ کو تمام اسرارِ علم دے کر اس دنیا میں بھیجا تاکہ وہ اندازہ ہو جائے کہ جس کو خدا اپنا جانشین بناتا ہے اس کے بارے میں اس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ وہ دنیا میں جا کے کچھ سیکھ لے، دنیا میں جا کے کوئی کمال پیدا کر لے، وہ اپنے نمائندہ کو صاحبِ کمال بنا کر بھیجتا ہے اور شانِ اکبر و اوقورت پر بھی رہا ہو کہ آدمؑ کو نہ ماں کے ذریعہ بھیجا نہ باپ کے ذریعہ بھیجا اور صاحبِ کمال بنا کر بھیجا تاکہ اتنا تو معلوم ہو جائے کہ خلیفہ الہی کو کمال لینا

jabir.abbas@yahoo.com

کوئی ہے ہی نہیں۔ کمال میں گئے تو کس سے لیں گے، یعنی خلیفۃ اللہ اگر اس دنیا میں سکھنا چاہے تو آدم کس سے سیکھیں گے؟ کون ہے؟ نہ باپ ہے کہ جس کے ذریعہ تربیت کی جائے نہ ماں ہے کہ جس کے ذریعہ سے کمالات دیئے جائیں۔ اگر جناب آدم کے پاس کوئی بھی کمال ہے تو وہ کمال نہ باپ کا طفیل ہے نہ ماں کا صدقہ ہے، نہ کوئی معاشرہ ہے نہ کوئی ماحول ہے۔ لے دے کے آسمان پر فرشتے ہیں تو فرشتے خود ہی افراد کر رہے ہیں لَٰ اَعْلَمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا بدور و گار ہمارے پاس تو اتنا ہی ہے جتنا تو نے عنایت فرمایا ہے۔ تو آدم کے پاس جو کمال علم ہے وہ بدور و گار ہی کا دیباہ ماحول کی ذین نہیں ہے۔ میں ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں آپ اسے پہچانیں۔ یعنی پہلے دن جب بدور و گار نے جناب آدم کو خلیفۃ الہی بنا کر اس زمین پر بھیجا تو اتنا باکمال بنا کر بھیجا کہ جس کے بارے میں خود قرآن مجید کا اعلان ہے عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا اللہ نے آدم کو تمام اسماء کا علم دے کر بھیجا، باکمال بنا کر بھیجا اور دنیا میں پہلے کوئی ایسا نہیں رکھا جس سے آدم کمال حاصل کر سکیں، جس سے جناب آدم علم لے سکیں۔ تو قدرت کا اک انتظام یہ بھی ہوتا ہے کہ بدور و گار اپنے جانشین کو جب باکمال بنا کر بھیجتا ہے تو ایسے ماحول میں بھیجتا ہے کہ جہاں کوئی کمال لینے والا نہ ہو۔ تاکہ دنیا کو یہ اندازہ ہو جائے کہ کمال لے کر آیا ہے اس نے کمال یہاں اگر لیا نہیں ہے۔ تو آدم کو کس دنیا میں بھیجا کہ جہاں نہ کوئی بشر تھا نہ کوئی معلم تھا نہ کوئی انسان تھا نہ کوئی باپ تھا نہ کوئی مائیں تھیں نہ کوئی معاشرہ تھا نہ کوئی مدرسہ تھا، جتنا جو کچھ بھی آدم کے پاس ہے سب وہیں کا دیا ہوا اور وہیں سے لے کر آئے ہیں۔ یہ پہلا انتظام قدرت تھا اور آخر میں بدور و گار نے جب دوسرا سلسلہ خلقت شروع کیا تو وہاں بھی صاحب کمال کو بھیجا تو ایسی جگہ پر بھیجا جہاں نہ کوئی پڑھنے والا تھا نہ کوئی سکھانے والا تھا، نہ کوئی بنانے والا تھا اور جیسے ہی اس گھر سے باہر آیا غرض بیخبر میں آئے ہی پڑھنا شروع کر دیا۔ اگر دنیا محسوس کرے کہ اس سلسلہ کا پہلا آیا تھا تو وہ بھی اپنا علم لے کر آیا تھا اس نے سلسلہ کا پہلا آیا ہے تو یہ بھی اپنا علم لے کر آیا ہے، اب جسے بھی خلافت الہی کا دعویٰ ہو پہلے ایسا صاحب کمال بنے اس کے بعد خلافت الہی کا دعویٰ کرے۔ صلوات

اس مقام پر ضمنتاً ایک جملہ ربط کلام کے لئے گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ملائکہ کو بھی بدور و گار عالم نے علم دیا تھا جو اکثر کہہ دیا جاتا ہے کہ کون سا امتحان ہے، یہ کیسی آزمائش ہے، ایک کو پڑھا دیا ایک کو نہیں پڑھا یا۔ ملائکہ تو خود ہی کہتے ہیں اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا بدور و گار ہمارے پاس وہی علم ہے جو تو نے ہم کو دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے ملائکہ کو تعلیم دی ہے، خدا نے ملائکہ کو علم دیا ہے ایسا نہیں ہے کہ ایک کو بتایا اور ایک کو نہیں بتایا اور دونوں کو منزل امتحان میں لا کر کھڑا کر دیا۔ لیکن جناب آدم کے اور ملائکہ کے علم میں جو فرق پایا جاتا ہے۔ میں اپنے عزیز بچوں اور نوجوانوں کو سمجھانے کے لئے ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں اور انشاء اللہ آپ اس حقیقت کو بہ آسانی پہچان لیں گے اور شاید اس مثال سے بات واضح بھی ہو جائے اور یاد بھی رہ جائے۔ ایک آدمی سے آپ کی ملاقات ہوئی، آپ نے اس کی خیریت دریافت کی، آپ کیسے ہیں، گھر والے کیسے ہیں، ماشاء اللہ۔ بدور و گار عالم نے کتنی اولاد سے آپ کو نوازا ہے۔ آپ نے کہا ہمارے چار بیٹے ہیں۔ پوچھا ان کے نام کیا ہیں؟ آپ نے چاروں کے نام بتا دیئے۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان کے چار بیٹے ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ چاروں کے نام کیا ہیں۔ چند دنوں کے بعد ان میں سے ایک بیٹا آپ کے سامنے آگیا اور جس سے آپ نے ملاقات کر کے دریافت کیا تھا انھوں نے تعارف بھی کر دیا یہ میرا بیٹا ہے۔ آپ بتا سکتے ہیں اس کا نام کیا ہے؟ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے چار بیٹے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ چاروں کے نام کیا ہیں، لیکن ان میں سے ایک کو لا کر کھڑا کر دیا تو کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان میں سے چاروں کے نام کیا ہیں نہیں جانتے۔ تصویر ڈی ویر کے بعد دوسرا بیٹا آیا کہا بتائیے اس کا نام کیا ہے؟ کہا نہیں معلوم۔ تیسرا بیٹا آیا اس کا نام کیا ہے؟ کہا اس کا نام بھی نہیں معلوم ہے۔ چوتھا بیٹا آیا اس کا نام کیا ہے؟ کہا وہ بھی نہیں معلوم ہے۔ چاروں بیٹے بھی معلوم ہیں چاروں نام بھی معلوم ہیں۔ تو کمزوری کیا رہ گئی کہ آپ بتا نہیں پا رہے ہیں کہ ان میں کس کا نام کیا ہے۔ نہ ناموں سے خبر نہ بیٹوں سے۔ چار بیٹے ہیں یہ بھی معلوم ہے چار نام ہیں، یہ بھی معلوم ہے کہ کہاں رہ گئی۔

jabir.abbas@yahoo.com

توجہ کریں، شخصیتوں کے علم میں کوئی کمی ہے، نہ ناموں کے علم میں کوئی کمی پائی جاتی۔ فقط ایک مسئلہ نازک سا رہ گیا ہے کہ فقط چار بیٹے چار نام مگر کس کا کون سا نام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک علم وہ ہوتا ہے جو بعنوان عام حاصل ہوتا ہے۔ بعنوان کلی چار بیٹے چار نام۔ لیکن جب چار نام آپ کو معلوم ہیں اور بیٹا آپ کے سامنے کھڑا ہو جائے تو جب تک باپ یہ نہ کہے گا کہ میرا بیٹا ہے اس وقت تک یہ نہ معلوم ہو سکے گا کہ یہ بیٹا ہے اور جب بتا دیا یہ بیٹا ہے تو جب تک نام نہ بتائے گا یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ ان کا نام کیا ہے۔ تو بعنوان عام یہ بھی معلوم ہے کہ بیٹے چار ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ نام چار ہیں مگر کس نام کا مصداق کون سا بیٹا ہے اور کس بیٹے کا نام کیا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو یہ بتانے کے بعد بھی معلوم نہ ہو سکا۔ میں نے ایک لفظ کہا ہے غور فرما رہے ہیں؟۔ بتانے کے بعد بھی یہ نہ معلوم ہو سکا۔ پروردگار عالم نے کہا ہم نے آدم کو تمام اسرار بتا دیئے، سارے نام بتا دیئے، اب اس کے بعد کوئی کہے خدا نے سب بتا ہی دیا تو آدم کا کمال کیا تھا۔ مگر خدا نے نام کہاں پوچھے تھے شَمْسُ عَرَضَتْ عَلَى الْمَلِكِ آدَمُ کو نام بتائے پھر اس کے بعد خدا نے ان سب کو ان ملائکہ کے سامنے پیش کیا اور اس کے بعد کہا اَنْذِرْهُمْ بِاسْمَاعِیْلَ اَهْلُوْکُمْ ان کے نام بتاؤ۔ توجہ کریں قرآن مجید کیا کہتا ہے۔ خدا نے کہا ان کے نام بتاؤ۔ نام نہیں پوچھے ہیں ان کے نام۔ یعنی مسئلہ وہ کیا ہے کہ شخصیت سامنے ہے نام معلوم ہے۔ لیکن یہ کون بتائے کہ اس شخصیت کا نام کیا ہے۔ یہ کون بتائے کہ وہ نام کس کے لئے ہے، ان کے لئے ہے یا ان کے لئے ہے۔ یہی وہ مرحلہ تھا جو پروردگار عالم منزلی امتحان میں رکھنا چاہتا تھا۔ اگر نام بتا دیئے تو اب سوال ناموں کا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کے نام کیا ہیں۔ یہی وہ منزل تھی جہاں ملک خاموش رہ گیا اور جناب آدم امتحان علم میں کامیاب ہو گئے۔ پروردگار عالم نے انکی خلافت الیہ کا اعلان کر دیا لیکن یہ بات تو آپ کے ذہن میں ہے۔

ہے۔ لیکن اس نکتہ کی طرف آپ توجہ فرمائیں۔ شاید اگر میرے بچوں نے کبھی غور نہ کیا ہو تو آج غور کریں کہ آخر ان دونوں میں مناسبت کیا ہے کہ نام خدا نے بتا دیئے شخصیتوں کو سامنے لاکے کھڑا کر دیا کہا بتاؤ ان کے نام کیا ہیں، ملائکہ نہیں بتا سکے، آدم نے بتا دیا وہ میدان امتحان میں پیچھے رہ گئے اور جناب آدم میدان امتحان میں آگے بڑھ گئے مگر جناب آدم سے بتا سکتے دیا کہ ان کا نام کیا ہے۔ میں پھر لٹ کر اپنی مثال پر آتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ ان کے چاروں بیٹوں کے نام کیا ہیں، مجھے معلوم ہے کہ ان کے چار بیٹے ہیں دونوں باتیں معلوم ہیں۔ مگر بیٹا سامنے آیا تو نہیں معلوم کہ اس بیٹے کا نام کیا ہے، نہیں معلوم کہ اس بیٹے کا نام کیا ہے۔ چاروں بیٹے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور چاروں نام ذہن کے اندر محفوظ ہیں، مگر ہم نہ بتا سکے کہ کس بیٹے کا نام کیا ہے۔ کیوں کیوں نہ بتا سکے یہ ہمارے علم کی کمزوری نہیں ہے۔ یہ آپ کے نام رکھنے کی کمزوری ہے۔ میں نے ایک بات کہی ہے اگر آپ توجہ فرمائیں۔ یہ ہمارے آپ کے نام رکھنے کی کمزوری ہے یہ ہمارے علم کی کمزوری نہیں ہے۔ ہم لاکھ ذہن ہوں، کتنے ہی ہوشیار ہوں مگر مسئلہ تو آپ کے ذوق کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ نے ایک بیٹے کا نام رکھ دیا عالم جب کہ بالکل جاہل تھا۔ ایک بیٹے کا نام رکھ دیا یوسف جب کہ اس میں کوئی مہن نہیں تھا۔ ایک بیٹے کا نام رکھ دیا فاضل جب کہ اس میں کوئی فضل نہیں تھا۔ ایک بیٹے کا نام رکھ دیا قادر جب کہ انتہائی عاجز تھا۔ تو چونکہ ہمارے یہاں شخصیت اور نام میں کوئی رابطہ نہیں ہوتا اس لئے ہم کمال علم رکھنے کے بعد بھی منطقی نہیں کر پاتے ہیں۔ پروردگار نے جن شخصیتوں کو آدم کے سامنے پیش کیا اور جن کے نام خدا نے پہلے بتائے رکھے تھے اگر ان دونوں میں کوئی رابطہ نہ ہوتا تو مسئلہ مشکل ہو جاتا۔ مگر قدرت نے روزِ اول یہ انتظام کیا کہ جس کا نام محمد رکھا اس کو محمد بنایا۔ جس کا نام علی رکھا اس کو بلند بنایا۔ جس کا نام حسن و حسین رکھا اس کو صاحبِ حسن بنایا۔ تو چونکہ نام اور کردار میں مناسبت موجود ہے لہذا آدم کی ذہانت کے لئے فیصلہ کر لینا مشکل نہیں ہے وصولات اسی لئے اگر آپ انوار الہیہ پر نظر کریں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ پروردگار عالم نے

عالم افراد سے جن شخصیتوں کو اس دنیا میں بھیجا ہے ان کے نام خدا نے طے کئے ہیں اور خدا جس نام کو طے کرتا ہے وہ بے مناسبت ہوتا ہے نہ بے ربط ہوتا ہے نہ بے جوڑ ہوتا ہے۔ خدا کسی جاہل کو عالم نہیں کہہ سکتا، خدا کسی عاجز کو قادر نہیں کہہ سکتا، خدا کسی مردہ کو زندہ نہیں کہہ سکتا، خدا کسی بے کمال کو کمال نہیں کہہ سکتا، وہ جس کو جیسا کہے سمجھو ویسا ہے۔ اور فقط یہی نہیں کہ وہ آج ہے بلکہ خدا نے اگر کہہ دیا تو جب تک رہے گا ویسا ہی رہے گا۔ اگر خدا نے کسی کو محمد بنا دیا تو ایسا نہیں ہے کہ آج قابل تعریف ہے شائع کل نہ رہ جائے۔ نہیں جب تک اپنے کا قابل تعریف رہے گا جب تک علی رہے گا بلند ہی رہے گا جب تک حسن رہے گا صاحب حسن ہی رہے گا۔ جب تک کوئی رہے گا صاحب کمال ہی رہے گا۔ اس لئے کہ خدا نے ماضی، حال، مستقبل سب کو دیکھ کے فیصلہ کیا ہے۔

یہ بات ختمنا میں نے آپ کے سامنے گزارش کی ہے مگر جو بات علم امام کے بارے میں گزارش کرنا چاہتا ہوں اس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ امام حسینؑ کے علم کو پہچاننے کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ عمومی راستہ ہے جس سے ہر علم کو پہچانا جاسکتا ہے۔ با اہلیت پیغمبر کے علمی کمال کو پہچانا جاسکتا ہے۔ اور انھیں اہلیت پیغمبر میں امام حسینؑ بھی شامل ہیں جس کی تفصیل سال گذشتہ میں گزارش کر چکا ہوں یا ائمہ معصومین کے کمالات اگر معلوم ہو جائیں تو انھیں ائمہ میں امام حسینؑ بھی شامل ہیں۔ یا پیغمبر کے وارثوں کے کمالات اگر معلوم ہو جائیں تو انھیں وارثان پیغمبر میں امام حسینؑ بھی ہیں اگر اہلیت کا کمال معلوم ہو جائے تو انھیں اہلیت میں ایک امام حسینؑ بھی ہیں۔ یعنی امام حسینؑ کے کمال کو پہچاننے کے یہ سارے عنوان ہیں کہ جن کے ذریعہ سے کمال علم سرکارِ ائمہ و اہل بیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ میں نے چار حوالے دیئے ہیں تفصیل پر آپ خود غور کر لیں گے یا مطالعہ کریں گے آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ امام حسینؑ اہلیت میں ہیں۔ امام حسینؑ وارثان پیغمبر میں ہیں۔ امام حسینؑ ائمہ اہلیت میں ہیں۔ امام حسینؑ جبرئیل کے بنائے ہوئے جانشینوں میں ہیں۔ لہذا جتنے کمالات ان تمام افراد کے لئے

ضروری ہیں اور جتنے کمالات پروردگار عالم نے ان میں سے کسی کو بھی عنایت فرمائے ہیں وہ سارے کمالات امام حسینؑ میں اس اعتبار سے ہیں کہ امام حسینؑ بہر حال انھیں صاحب کمال کی ایک فرد ہیں۔ اور دوسرا طریقہ امام حسینؑ کے کمال علم کو پہچاننے کا۔ آثار کے ذریعہ کمال علم کو پہچانا ہے۔ ان آثار کی بھی دو قسمیں ہیں بلکہ اگر واضح کیا جائے تو ان آثار کو پہچاننے کی تین قسمیں ہیں۔ بعض علمی کمالات وہ ہیں جن کو امام حسینؑ نے خود اپنے بزرگوں سے نقل کئے ہیں۔ بعض علمی کمالات وہ ہیں جو اہل دنیا نے امام حسینؑ سے نقل کئے ہیں اور بعض کمالات وہ ہیں کہ جہاں امام حسینؑ نے خود اپنے کمال علم کا اعلان فرمایا ہے۔ اس میں کسی کا حوالہ پہلے ہے اور نہ کسی کے حوالہ کی بعد میں کوئی ضرورت ہے۔ براہ راست کردار امام حسینؑ میں اس علم کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ علم کا پہلا شعبہ جہاں امام حسینؑ کے علم کو پہچانا گیا ان روایتوں سے جو امام حسینؑ نے کسی اور سے بیان کی ہیں یعنی کسی اور کے حوالے سے بیان کی ہیں۔ اس مقام پر اس لفظ کو بھی آپ یاد رکھیں گے کہ کسی معصوم کی زندگی اور ان کے حالات لکھے جاتے ہیں تو یہ دوسرخیاں ضرور لکھ دی جاتی ہیں۔ ہمارے یہاں عام طور سے ان باتوں کا تذکرہ بہت کم ہوتا ہے اس لئے کہ ہمارا ذہن زیادہ ماؤس ہوتا ہے کرامات، کمالات، معجزات سے۔ لہذا ہمارے یہاں جو کتابیں لکھی جاتی ہیں ان میں سارا ذور اسی پر ہوتا ہے کہ کتنے معجزات اس میں جمع کر دئے گئے ہیں کتنی کرامتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ فلاں کی مصیبت تھی دیکھیے دور ہو گئی، فلاں نے دعا مانگی وہ کیسے قبول ہو گئی۔ ہمارے یہاں زیادہ زور تاریخ نویسی میں، سیرت نویسی میں اسی بات پر دیا جاتا ہے مگر جہاں علمی چرچہ زیادہ ہو وہاں کسی کی سیرت لکھنے میں ان دو موضوعات کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے کہ اس کے علوم، اس کے فضائل، اس کے کمالات، اس کے آثار، اس کے بیانات، اس کے ارشادات، اس کے خطبات، اس کے کلمات کیا ہیں۔ یعنی یہ معلوم ہو جائے کہ انھوں نے ہمارے واسطے کیا چھوڑا ہے۔ وہ خود کتنے صاحب کمال تھے کس کس کے مشکلات کو حل کر دیا وہ تو اس دور کا قصہ تھا۔ لیکن ہمارے واسطے، اگلی نسلوں کے لئے قیامت تک اُن کے واسطے انسانوں کے لئے

jabir.abbas@yahoo.com

۳۸

ان ارشادات میں ایک لفظ ہے جو سرکارِ دود عالم کے حوالہ
کیا ہے کہ حضور سرورِ کائنات فرماتے ہیں اَلْبَيْتُ الْمُنَافِقِ
يُفَضِّلُ عَلَى الْكَافِئَاتِ۔ اگر پہچاننا چاہتے ہو کہ کون کونسا کسے کہتے

ہیں۔ سرکارِ ایشیاء نے پوچھنے والے نے یہ سوال کیا مولا! یہ بتائیے کہ پروردگار عالم نے روزے کیوں واجب کئے ہیں؟ فرمایا ایک مصلحت الہی روزے کو واجب کرنے میں یہ بھی ہے تاکہ غنی افراد، مالدار لوگ پیسے والے آرام کی زندگی گزارنے والے صبح سے شام تک کھانے والے انھیں بھی تو یہ اندازہ ہو کہ فقیروں کی زندگی کیسی گذرتی ہے۔ کسے یاد رہتا ہے کہ غریبوں پر کیا گذرتی ہے۔ کسے خیال آتا ہے کہ مسکین کی زندگی کا حال کیا ہوتا ہے۔ بارہ چودہ گھنٹے بھوکے رہتے تو یہ اندازہ ہوگا کہ غریب کی سال بھر کی زندگی کیسی سختی، فقیروں کی زندگی کیسی گذرتی ہے تو پروردگار عالم نے صاحبانِ دولت کو غربت کا احساس پیدا کرانے کے لئے ان پر بھی روزہ واجب کر دیا۔ یہ ایک مصلحت جو امام حسینؑ نے بیان فرمائی۔ لیکن میں نے اس مصلحت کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اگر خدا نے روزہ اسی لئے واجب کیا ہے کہ امیروں کو، دولت مندوں کو، پیسے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ غریب کی زندگی کیسی گذرتی ہے تو پھر روزہ خالی پیسے والوں پر واجب ہونا چاہئے تھا۔

اگر امیروں کو احساس دلانا ہے کہ غریب کی زندگی کیسی گذرتی ہے تو پھر یہ روزہ خالی امیروں پر واجب ہونا، غریبوں پر کیوں واجب کیا گیا۔ اک سوال پیدا ہو سکتا تھا مگر عزیزو! جواب بھی بالکل واضح ہے۔ اک لمحے کی توجہ درکار ہے جواب بالکل واضح ہے کہ پروردگار عالم انھیں ہوش میں لانا چاہتا ہے، انھیں مفت کا ثواب دینا چاہتا ہے، یعنی روزہ واقفاً اگر رکھنا ہے تو امیروں ہی کو رکھنا ہے۔ روزہ رکھنا ہے تو کھاتے پیتے لوگوں ہی کو رکھنا ہے۔ روزہ رکھنا ہے تو پیسے والوں ہی کو رکھنا ہے۔ جو صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، شام کا کھانا، دوپہر کی چائے، یہ میٹھی وہ فلاں ٹی، صبح سے شام تک سوائے کھانے پینے کے اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ روزہ ان کے واسطے روزہ ہے ورنہ جس غریب کو نہ صبح کا ناشتہ ملتا ہے، نہ دوپہر کے کھانے کا سہارا ہے، نہ سہ پہر کی چائے کا سہارا ہے۔ اس کے واسطے کون سا روزہ ہے، اس کے تو بارہ جینے بوجھنے کی گذر ہے ہیں، مگر خدا نے فریضے میں اسے بھی شامل کر لیا۔ تاکہ انھیں ہوش میں

ایا جائے اور انھیں مفت کا ثواب دے دیا جائے۔ صلوات
اس کے علاوہ نہ جانے کتنی روایتیں ہیں اور کتنے ارشادات ہیں جو کتابوں میں پائے جاتے ہیں ان تفصیلات کو عرض کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرزندِ رسولؐ الثقلین کا علم اور اس علم کی وحی کیا ہیں۔ یہ عنوان ہے جو میں نے عرض کیا ہے تین طریقے ہیں جن سے علم امام حسینؑ پہنچا گیا ہے۔ وہ روایات جو امام حسینؑ نے اپنے بزرگوں سے نقل کی ہیں، وہ روایتیں جو علمائے اسلام نے امام حسینؑ سے نقل کی ہیں اور وہ مسائل وہ علمی گتھیاں جو امام حسینؑ نے سلجھائی ہیں اور جو امام حسینؑ نے جوابات دیئے ہیں جس سے انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ امام حسینؑ کا علم کیا تھا اور اس علم سے عالم انسانیت اور عالم اسلام نے کتنا فائدہ اٹھا یا ہے۔ اب اس پورے بیان کو سمیٹتے ہوئے دو چار جملے گزارش کرنا چاہتا ہوں اور یہی میری تقریر کا خلاصہ ہے۔ حضورؐ کی دیر آپ اپنے ذہن کو میرے ساتھ رکھیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ اسلامی دنیا میں، مذہبی دنیا میں، خلافت الہی کی دنیا میں علم کا سزاوارتہ جناب آدمؑ سے شروع ہوتا ہے۔ کوئی نمائندہ پروردگار ایسا نہیں ہے جن کو پروردگار عالم نے جاہل اس دنیا میں بھیج دیا ہو اگرچہ دنیا میں سارے انسان آتے ہیں تو پوہی آتے ہیں واللہ اگرچہ **مَنْ بَطُلُونِ أَتَاهَا تَكْهَلُ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا** اللہ نے تم کو شکم مادر سے نکال کر دنیا کے حوالے کیا اس عالم میں کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ تو انسان کی اصل ہے جہالت۔ ہر انسان کی زندگی کی بنیاد ہے بے خبری اور ناواقفیت، جو آدہ ایسا ہی آیا جاہل آیا ایسے خبر آیا، ناواقف آیا۔ مگر اللہ کا جو نمائندہ آیا وہ اپنے ساتھ علم لے کر آیا ہے فضل و کمال لے کر آیا ہے۔ یہ ایک فرق ہے جو دنیا کے انسانوں میں اور اللہ کے نمائندوں میں قائم کیا جاتا ہے۔ وہ کمال لے کے آئے انھوں نے دنیا میں کمال حاصل کیا۔ ورنہ آئے تو خالی ہاتھ اور بے کمال آئے۔ اتنی سہی بات تو اس امتیاز کے لئے ہے کہ اللہ کے نمائندوں میں اور دنیا کے انسانوں میں فرق کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد خدا کے نمائندوں کے درمیان اور ان کے ظاہر میں یا ان کے طبیعت کے درمیان کیا فرق آیا جاتا ہے اس کی

jabir.abbas@yahoo.com

ایک مختصر داستان جلدی جلدی آپ میں لیں تفصیلات کا موقع نہیں ہے جہاں سے پروردگار عالم نے تذکرہ علم شروع کیا ہے جن کو خدا نے علم دیا ہے، جنہوں نے جاہل پیدا ہو کر یہاں بڑھا نہیں ہے، ان سب کے علم کی داستان دامن قرآن میں موجود ہے۔ سب کے علم کی داستان قرآن مجید نے محفوظ کر رکھی ہے۔ جناب آدم سے سلسلہ شروع ہوتا ہے علقۃ آدم، الاسماء الحکیمہ جب ذکر علم آدم آیا تو خدا نے کہا کہ اللہ نے آدم کو تمام اسماء کی تعلیم دی ہے۔ یعنی علم آدم کا ذکر کیا مگر اسماء کے ساتھ۔ اللہ نے آدم کو تمام ناموں کا علم دیا۔ یعنی علم دیا مگر یہ بتایا کہ کیا دیا۔ یہ ہے علم جناب آدم۔ جناب آدم کے بعد جناب نوح کا ذکر آتا ہے۔ جب جناب نوح نے پروردگار کی بارگاہ میں دعائی کر پروردگار! یہ میرا بیٹا ہے جو ڈوبا جا رہا ہے اِنِّ ابْنِیْ مِنْ اَحْضَبِیْ یہ میرا بیٹا میرے اہل میں ہے۔ اور یہ ڈوبا جا رہا ہے تو نے وعدہ کیا ہے کہ جو میرے اہل ہیں انہیں بچالے گا۔ تو اصرار سے آواز آئی اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَحْضَبِیْ یہ تمہارے اہل میں نہیں ہے۔ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْبٌ صَالِحٌ یہ عمل غیر صالح ہے۔ اس کے بعد پروردگار نے کہا اسے نوح! جوابت میں جانتے خبردار اس کے بارے میں اب ہم سے سوال نہ کرنا۔ اِنِّیْ اَعْلَمْتُ اَنْ تَنْکُونُ مِنْ اِلْحٰہِیْلِیْنِ ہم تم کو نصیحت کر رہے ہیں کہ کہیں تمہارا شمار جاہلوں میں نہ ہو جائے۔ سلسلہ بھولے لگا نہیں۔ علم آدم کا اعلان ہوا تو اسماء کے ساتھ۔ نوح کے کمال کا اعلان ہوا کہ یہ تنجیب الدعوات ہیں۔ ہم نے وعدہ کیا ہے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کریں گے۔ مگر یہ اُسے اہل کہہ رہے ہیں، میں اُسے نا اہل کہہ رہا ہوں اور سمجھا رہا ہوں، دیکھو خبردار تمہارا شمار جاہلوں میں نہ ہو جائے۔ یعنی علم نوح کے ساتھ خدا نے لفظ جہل استعمال کر دیا چاہے خطرہ سے آگاہ کرنے ہی کے لئے یہی مگر ہو یا کر دیا۔ خبردار اس حال نہ کرنا، اب کسی کا نام نہ لینا۔ ایک کا نام تم نے لیا ہے تم نے بتا دیا۔ تم اس کو اہل کہتے ہو ہماری نگاہ میں نا اہل ہے۔ یہ ہے کمال علم نوح۔ اب آگے بڑھئے یہ سلسلہ بھی آگے بڑھتا جائے گا۔

جناب داؤد سامنے آئے۔ پروردگار نے کہا عَلَّمْنَاکَ صُنْعَکَ لَیْسَ مِنْکُمْ

ہم نے جناب داؤد کو جو علم دیا ہے وہ "زرہ" بنانے کا علم ہے۔ ہم نے علم دیا ہے مگر ان کو علم دیا ہے زرہ بنانے کا۔ ان کا عالم یہ ہے کہ لوہا ان کے ہاتھ میں موم ہو جاتا ہے زرہ بنانے میں جیسے ہم نے بتا دیا ویسے ہی بناتے ہیں تو علم بھی ان کا نہیں ہے ہمارا دیا ہوا ہے۔ مگر دیا کیا ہے۔ زرہ سازی کا علم۔ علم بھی بتایا اور معلوم بھی بتا دیا کیا دیا ہے جناب داؤد کے بعد جناب سلیمان کی باری آئی۔ جناب سلیمان اعلان کرتے ہیں یا ایتھما اناس! عَلَّمْنَا مُطْرِقَ الطَّیْرِ دیکھو خدا نے مجھے پرندوں کی گفتگو سمجھنے کا علم دیا ہے۔ یعنی سلیمان نے علم کا اعلان بھی کیا اور معلومات بھی بتادے کہ خدا نے کیا دیا ہے۔ جناب یحییٰ جب اس منزل کمال میں آئے تو خدا نے کہا موسیٰ ذرا چلے جاؤ وہاں جو مجمع البحرین پر سیر ایک بندہ رہتا ہے عَلَّمْنَاکَ مِنْ لَدُنَّا عَلَمًا جس کو ہم نے اپنے پاس سے ایک علم دیا ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ تو صاحبِ توریت کے پاس بھی کچھ ہے کچھ نہیں ہے اور جس کے پاس بھی کیا ہے انہیں بھی خدا نے کچھ علم دیا ہے سب نہیں دیا ہے۔ جناب سلیمان کا وہی تخت، بلقیس اٹھا کر لایا خدا نے کہا قَالِ الْکَذٰبِیْنَ عِنْدَکَ عَلَمٌ مِّنْ الْکِتٰبِ یہ تخت بلقیس اٹھا لایا کیوں اس لئے کہ اس کو تھوڑا سا کتاب کا علم دیا گیا تھا۔ تو چہ کریں تھوڑا سا علم دیا گیا تھا۔

جب قوم نے جناب عیسیٰ کو خدا کہنا شروع کیا تو پروردگار نے کہا عیسیٰ! کیا تم کہہ دیا ہے کہ مجھے اور میری ماں کو خدا مان لو۔ کہا پروردگار! میں یہ جرات کر سکتا ہوں؟ جو میں نے کہا وہ تو تجھے معلوم ہی ہے۔

جب جناب سلیمان نے کہا ہڈ پھر تو کہاں چلا گیا تھا۔ اپنی ڈبلی ٹھپوڑ کے تو کہاں چلا گیا تھا۔ اُس نے کہا نبی خدا! میں وہ جاتا ہوں جو آپ نہیں جانتے۔ میں ملک سبا سے ایک نئی خبر لے کے آیا ہوں یعنی خدا کا دیا ہوا علم اور مقابلے میں ایک پرندہ۔ وہ کہتا ہے میں وہ جانتا ہوں جو آپ نہیں جانتے اس لئے کہ خدا نے آپ کو بھی دیا ہے مجھے دیا ہے اور آپ کو میری گفتگو کا علم اسی لئے دیا ہے تاکہ آپ پہنچیں کہ کچھ مجھے معلوم ہے۔ آگے میں نہ کہوں گا۔ کچھ باتیں مجھے معلوم ہیں جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ ہر ایک

میں اپنے عزیزوں کی توجہ کے لئے نگراں کرنا چاہتا ہوں کہ یہ لفظ قرآن مجید میں عُدَّةٌ مَفَاتِيحُ الْغَيْبِ ہے عُدَّةٌ مَفَاتِيحُ الْغَيْبِ نہیں ہے۔ مَفَاتِيحُ الْغَيْبِ اور مَفَاتِيحُ الْاَلْگ ہے۔ مَفَاتِيحُ الْغَيْبِوں کو کہا جاتا ہے اور مَفَاتِيحُ الْاَلْگوں کو کہا جاتا ہے جہاں کنجیاں لگائی جاتی ہیں، جہاں سے سامان نکالا جاتا ہے۔ عُدَّةٌ مَفَاتِيحُ الْغَيْبِ پر در و گار کے پاس غیب کے خزانے ہیں۔ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْبَحْرِ خُشْکِی میں ہے اُسے بھی جانتا ہے، جو سمندر وں میں، دریاؤں میں، زمی میں ہے اُسے بھی جانتا ہے۔ وَمَا تَشْأَوْنَ وَرَزَقَهُ الْاَلْبَنَکَ کَمَا نَفَسَا بِاَدْرَکَتْ سے جب پتہ روٹ کر گرتا ہے خدا اس کو ہی جانتا ہے۔ وَلَا تَجِدُ فِي ظُلُمَاتِ الْاَرْضِ اور زمین کی تاریکیوں میں جو دنیا چھپا ہوا ہے خدا اُسے بھی جانتا ہے۔ غیب خدا جانتا ہے، خشکی کی باتیں خدا جانتا ہے دریاؤں کی باتیں خدا جانتا ہے، فضاؤں کی باتیں خدا جانتا ہے، زمینوں کے اندر کیا ہے خدا جانتا ہے۔ وَلَا تُطْبِقُ الْاَلْفَايِسُ الْاَلْفَايِسُ کتابِ مُبْتَدِیٰ اور جنتنا خشک و تر میں نے کتابا سے یہ سب میں نے اپنی کتاب کے اندر رکھ دیا ہے۔

عزت و آدمی رحمت ضائع نہ ہونے پائے۔ پروردگار نے اپنے ماسے علم کا
اعلان کر کے فرمایا کہ جتنا خشک و تر ہے سب میں نے کتاب میں لکھ دیا ہے اور جو اپنے
پیغمبر کا ذکر کیا تو پیغمبر کو عالم کتاب نہیں کہا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ میں نے پیغمبر کو اس کتاب کا
عالم بنا دیا ہے۔ _____ بلکہ فرمایا: **وَلَقَدْ كُتِبَ فِي الْكِتَابِ الْأُولَىٰ أَن تَعْلَمُوا أَن سَبْعَ مِائَةٍ**
سَنَةٍ مِّنْ عَمَلٍ غَيْرِ الْكَيْفِ۔ اب یہ اندازہ ہوا کہ سب کے معلومات مثبت تھے۔ انھیں اسرار دیئے۔
انھیں یہ علم دیا۔ انھیں وہ علم دیا۔ ہر ایک کا علم معین کر کے دیا۔ ایک پیغمبر کو کیا وہ علم

دیا کرتھک وترجو کھ تھ کتاب میں تھا۔ کتاب کو سینہ پیغمبر میں لکھا گیا تو ساری کائنات کا علم پیغمبر کے پاس، اب پیغمبر کو اپنی پیغمبری کے لئے کوئی گواہ چاہیے۔ پیغمبر کو اپنے رسالت کے لئے کوئی گواہ چاہیے تو خدا نے کہا اس کا بھی انتظام کر دوں گا۔ قش کشفی بالله شہیداً یبئونی ویبئکم وھن عندہ علم الکتاب پیغمبر! تمھاری رسالت کا ایک گواہ میں اور ایک گواہ وہ ہے جس کے پاس علم کتاب ہے۔ فجب کتاب ہوگا تو علم کل کائنات ہوگا۔ اب آخر میں امام حسین کا اعلان میں فرماتے ہیں عندنا علم الکتاب۔ خدا نے علم کتاب ہمارے سینوں میں دکھایا ہے تو تم کتاب میں ہے وہ کہ کائنات ہے اور کتاب پہلے سینے میں ہے، ہمارے علم سے دنیا کی کوئی شے باہر نہیں جاسکتی ہے صلیت انبیا کا کمال علم اولیائے خدا کا کمال علم، ان کا کمال کردار یہ سارے حقائق اپنے مقام پر ہیں لیکن بدرد و گدا عالم نے ہمیں صاحب علم کتاب، ہمیں وارث کتاب قرار دیا ہے اور کتاب میں خدا نے سارا علم رکھ دیا ہے۔ لہذا جس کے پاس علم کتاب ہے مجموعہ سب کچھ اس کے پاس ہے۔ اسی لئے اب اس کے بعد آپ المرصوفون کی زنگیاں پڑھیں گے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ سارے حقائق جن کا ذکر انبیا کے بارے میں قرآن مجید نے الگ الگ کیا ہے وہ سارے علوم ایک نقطہ پر جمع ہو گئے۔ جس امام کی تاریخ حیات پڑھیں آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ پڑندوں کی گفتگو کا علم اسی کے پاس ہے۔ زمین کی گفتگو کا علم اسی کے پاس ہے۔ زمین کے خواتون کا علم اسی کے پاس ہے۔ فضاؤں کا علم اسی کے پاس ہے۔ حدیث کے کرامات نے فرمایا کہ خدا نے ہم کو اتنا علم دیا ہے کہ ایک گزدر گیا وہ بھی معلوم ہے۔ کیا ہونے والا ہے وہ بھی معلوم ہے۔ ہمارے علم کے دائرہ کوئی چیز باہر نہیں گئی ہے۔ ایک روایت کا ایک جملہ یاد دلادوں آپ کو اندازہ ہو جائے گا چونکہ میرے موضوع میں تنہا علم امام حسین شامل ہے لہذا ایک فقرہ یاد دلانا چاہتا ہوں۔ وہ دن اب جب مولائے کائنات منبر پر ہیں اور منبر اُسے زور نہیں ہیں۔ ایک منبر دلانے کے منبر کے ایک فرزند کو دیکھا کہ بیٹا مولائے حسین کے کتے دن گذر گئے اس دن انسان کی کشتی تار پھٹ گئی تھی فرزند نے جواب دیا یہ میرے دوسرے فرزند کو

دیکھا کہا بتاؤ اس مہینے میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں؟ فرزند نے اس کا جواب بآجب دونوں کے جوابات جمع ہو گئے۔
 کہ وہ وقت قریب آگیا ہے۔
 جب میرے محاسن میرے خون سر سے رنگین ہو جائیں گے۔ میری شہادت کا وقت میرے دنیا سے جانے کا وقت قریب آگیا ہے۔ ان تارخوں کے اعلان کے بعد مولائے کائنات نے یہ ارشاد فرمایا۔
 کہ وہ وقت قریب آگیا ہے جب میرے محاسن سر کے خون سے رنگین ہو جائیں گے۔ لیکن میں جو بات گزارش کر رہا ہوں۔ ایک فرزند سے پوچھا کتنے دن گزر گئے ہیں ماہ رمضان کے اور دوسرے سے پوچھا کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔ اس لفظ پر پھر آپ تو فرمائیں اور اطمینان سے غور کریں۔

کسی مہینے میں کتنے دن گزر گئے یہ بتانا آسان ہے۔ اس مہینے کی کتنی تاریخ گزر گئی یہ بتانا آسان ہے۔ لیکن اس مہینے میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں یہ بتانا آسان نہیں ہے۔

مثلاً آج پہلی تاریخ ہے یعنی شبِ اول ماہ ہے کل محرم کی پہلی تاریخ ہے ظاہر ہے کل مجھ سے کوئی پوچھے صبح کو کہ اس مہینے کے کتنے دن گزر گئے ہیں؟ کہوں گارات کو چاند ہوا تھا آج پہلی تاریخ ہے۔ لیکن کوئی مجھ سے پوچھے کہ اس مہینے کے کتنے دن باقی رہ گئے ہیں نہیں بتا سکتا ہوں۔ اس لئے کہ اگلا چاند اگر ۲۹ کا ہونے والا ہے تو ۲۸ دن رہ گئے اور اگلا چاند اگر ۳۰ کا ہونے والا ہے تو ۲۹ دن رہ گئے۔ نہ اگلے چاند کی جھلک ظہار ہے اور نہ میں بتا سکتا ہوں کتنے دن باقی رہ گئے۔ تو یہ فرما رہے ہیں کہ شاید کوئی کائنات کی مصلحت ایک یہ بھی تھی کہ یہ پوچھ لیا جائے کہ کتنے دن باقی رہ گئے ہیں تاکہ لوگوں کو یہ اندازہ ہو جائے کہ امام تہادہ نہیں جانتا جو پوچھا ہے، جو ہونے والا ہے اسے بھی جانتا ہے۔

صلوات

اور یہ بھی ضمناً آپ ذہن عالی میں رکھیں گے کہ امام حسینؑ کا دور اور مولائے کائنات کا زمانہ وہ زمانہ نہیں تھا جو آج کا سائنٹفک دور ہے۔ آج آلات اور وسائل کا دور ہے۔ اب ہر کلینڈر معین ہے۔ سب جانتے ہیں چاند کہاں ہے

کہاں ہے، کب ڈوبے گا کب نکلے گا۔ چودہ سو سال دنیا کے آگے بڑھنے کے بعد آج وسائل کے ذریعہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ کب تحت الشعاع میں جائے گا کب تحت الشعاع سے باہر آجائے گا۔ تو یہ چودہ سو سال کی ریاضتوں کا اثر ہے لیکن جب یہ ریاضتیں نہیں ہیں، جب یہ وسائل اور ذرائع نہیں تھے۔ ایک انسان اپنے علم کی بنیاد پر ایک فیصلہ کر رہا ہے جس کا فیصلہ اُس دن ہوگا جب اگلا چاند لوگوں کے سامنے آجائے گا۔ وہ سال و ذرائع ہیں علم امامت کو پہچاننے کے لئے۔ پروردگار عالم نے کسی چیز کے علم کو اپنے ان ناسخوں سے مخفی نہیں رکھا ہے جو غیب اس کا اپنا ہے وہ اس کے لئے ہے۔ اس کے علاوہ مالک نے جو کچھ بھی ایک بندے کو دیا جاسکتا تھا وہ سارا علم سارا کمال ان بندوں کو عنایت فرما دیا۔ اگر یہاں تک آپ کے ذہن میرے ساتھ چلے ہیں تو اسی علم امام حسینؑ کی روشنی میں اصحابِ حسینؑ کی عظمت و جلالت کو پہچانیں۔ اسی علم سید الشہداءؑ کی روشنی میں امام حسینؑ کے گھر والوں کی بلند یوں کا اندازہ کریں کہ ایسا صاحبِ علم جو ماضی کو جانتا ہے، حال کو جانتا ہے، فضاؤں کو جانتا ہے، دریاؤں کو جانتا ہے۔ زبر زمین کیا ہے اُسے بھی جانتا ہے، بالائے آسمان کیا ہے اُسے بھی جانتا ہے۔
 اے صاحبِ علم اعلان کرتا ہے واللہ اعلمی لا اَعْلَمُ أَصْحَابًا أَؤْفَى مِنْ أَصْحَابِیْ خَدَائِیْ
 قسم میرے علم میں میرے اصحاب سے زیادہ وفادار کسی کے اصحاب نہیں ہیں۔ دنیا کا کوئی اور انسان اگر یہ بات کہتا تو شاید جلالتِ اصحاب کا دیرا احساس نہ ہو سکتا جیسا احساس امام حسینؑ کے اس اعلان کے بعد ہوتا ہے کہ امام حسینؑ یہ فرماتے ہیں کہ میرے علم میں ایسے اصحاب نہیں ہیں جیسے میرے اصحاب ہیں وَلَا أَهْلَ بَيْتِیْ وَ أَؤْفَى مِنْ أَهْلِیْ
 دنیا کی اور نہ ایسے گھر والے میری نگاہ میں ہیں جو میرے گھر والوں سے زیادہ نیک نہ اور وفادار ہوں۔ میرے اصحاب سے زیادہ وفادار اصحاب نہیں ہیں نہ ماضی میں نہ حال میں اور نہ مستقبل میں۔ اور نہ میرے گھر والوں سے زیادہ نیک نہ کہ اور دنیا میں کہیں ملیں گے۔ تم نے پرانی تاریخ نہیں پڑھی۔ میری نگاہ کے سامنے پوری تاریخ ہے۔ تمہیں مستقبل کا حال نہیں معلوم ہے مجھے دنیا کا حال معلوم ہے۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں

jabir.abbas@yahoo.com

ایسے نیکمٹا دار کہیں نہ ملیں گے ایسے وفادار کہیں نہ ملیں گے۔ یہ امام حسینؑ کا اعلان ہے اور یہ دونوں باتیں ہم نے تاریخ میں دیکھ لیں۔ ان کا کردار بھی دیکھ لیا اور ان کی وفاداری بھی دیکھ لی۔

بس ارباب عدا میں اپنے بیان کو آخری منزل تک لے آیا۔ چونکہ سید عالم امام حسینؑ سے متعلق تھا لہذا امام حسینؑ کے ارشاد گرامی ہی کی روشنی میں دو منظر آپ کے سامنے پیش کر کے بیان کو تمام کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ امام حسینؑ نے اپنے علم کا حوالہ دے کر یہ فرمایا کہ نہ میرے گھر والوں سے زیادہ صاحبِ کردار نہ میرے اصحاب سے زیادہ وفادار دنیا میں کہیں نہ ملیں گے۔ آئیے ان کا کردار دیکھیں اور ان کی وفاداری دیکھیں۔ گھر والوں کا کردار یک دیکھا۔ جب ماہِ رجب کی اٹھاسویں تاریخ آئی امام حسینؑ مسجدِ بیعت میں تشریف فرما ہیں۔ حاکمِ وقت کا نامزدہ امامِ وقت کے پاس آیا آپ کو دربار میں طلب کیا گیا ہے۔ عبداللہ ابنِ زبیر بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس وقت طلب کیا گیا ہے؟ آنے والے قاصد نے کہا اہل اسی وقت طلب کیا گیا ہے رات کو دربار نہیں لگتا ہے مگر بلایا گیا ہے۔ ابنِ زبیر نے کہا فرزندِ رسول! کیا ارادہ ہے؟ فرمایا جب بلایا گیا ہے اور میں نے کہہ دیا ہے کہ آؤں گا تو میں ہر حال جاؤں گا۔ کہا مگر آپ تو جانتے ہیں کہ رات کے وقت کوئی دربار نہیں لگتا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خطِ ناک تاریخ کا موڑ آگیا ہے اور اس طلب میں کوئی نہ کوئی خطرہ پایا جاتا ہے۔ لہذا مناسب ہے کہ رات کی تاریکی سے اور رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھایا جائے اور ہم لوگ اپنے لئے کوئی پناہ گاہ تلاش کر لیں۔ فرمایا تم یہ کام کر سکتے ہو میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ میں نے وعدہ کیا ہے میں دربار میں جاؤں گا حالات کا جائزہ لوں گا اور مجھے معلوم ہے کہ شام کے حاکم نے انتقال کیا ہے اور مجھے بلایا جا رہا ہے۔ کس مقصد سے بلایا جا رہا ہے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ جاؤں دربار میں تاکہ حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے۔ یہ کہہ کے مسجد سے اٹھے بیتِ الشرف میں آئے۔ بہن کو خبر سنائی بہن زینبؑ مجھے دربار میں بلایا گی تھیں معلوم ہے کہ رات کے وقت کوئی دربار آراستہ نہیں ہوتا ہے یہی گواہی

سخت وقت آگیا ہے، کوئی سنگین موقع آگیا ہے جس کے لئے بلایا گیا ہے مگر میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں ہر حال دربار حاکم میں جاؤں گا اور دیکھوں حالات کیا ہیں تاکہ حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے۔ جیسے ہی بھائی کا فیصلہ بہن نے سنا آواز دی عباسؑ سن رہے ہو آگئے کیا فیصلہ کیا ہے۔ علی اکبرؑ، قاسمؑ، عونؑ و محمدؑ بنی ہاشم کے شیروا اے ہاشمی جو انوارِ آفت نے فیصلہ کیا ہے دربار میں جانے کا، تو کیا تمھارا مولانا کیلا چلا جائے گا، کیا میرا مانجھیا دربارِ ظالم میں تنہا جائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا تو اریں اٹھاؤ تیار ہو جاؤ، اپنے حلقے میں لے کے جانا اور اپنے حلقے میں بھائی کو واپس لانا۔ (اچھو علی اللہ)

ہاشمی جوان تو اریں لے کے تیار ہوئے۔ شہزادی کے کہنے کے مطابق مولانا کو اپنے حلقے میں لیا اور لے کے چلے۔ جب ظالم کے قصر کے دروازے پر پہنچے تو لانا اندر جانا چاہتے ہیں اور چاہنے والے یہ چاہتے ہیں کہ مولانا کے ساتھ آپ کے حلقے میں لے ہوئے دربار میں جائیں۔ ایک مرتبہ فرمایا تم یہیں ٹھہر جاؤ مجھے بلایا گیا ہے میں جاؤں گا میں دیکھنا چاہتا ہوں ظالم کیا کہنا چاہتا ہے لیکن اس کا خیال رکھنا اگر میری آواز بلند ہو جائے تو پھر کسی اجازت کا انتظار نہ کرنا یہی میری آواز تمھارے واسطے اجازت ہوگی اور دربار میں بلا تکلف داخل ہو جانا۔ آئے ظالم کے دربار میں حاکم نے حکمِ شام کی خبر سنائی۔ امام حسینؑ نے یہ فقرہ سنا تو رضائے الہی پر اپنی رضا کا اعلان فرمادیا۔ اسکے بعد یہ خبر سنائی کہ یزید حاکم ہو گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ سے یزید کی بیعت کا مطالبہ کروں۔ فرمایا بیعت کا اتنا سنگین مسئلہ اور یہ رات کے اندھیرے میں طے ہوگا اگر تم کو اس مسئلے کو طے کرنا ہے تو دن میں اس دربار کو سنا، لوگوں کو بلانا میں بھی آؤں گا تاکہ لوگوں کے سامنے یہ واضح ہو جائے کہ کس کی بیعت کرنی چاہیے اور کس کے ہاتھوں پر بیعت ہونی چاہیے۔ جب یہ امام نے جواب دیا تو ولید نے کہا ٹھیک ہے آپ تشریف لے جائیں کل پھر آپ کو زحمت دی جائے گی، پھر آپ کو بلایا جائے گا۔ جیسے ہی فرزندِ رسولؐ نے طے کر کے چلنے کا ارادہ کیا ایک مرتبہ مروان شقی نے کہا ولید یہ کیا حماقت کر رہا ہے، یہ کیا حماقت کر رہا ہے حسینؑ اکیلے دربار میں آگئے ہیں اگر اس وقت کچھ چلے گئے تو جب تک

jabir.abbas@yahoo.com

خون کی ندیاں نہ بہ جائیں گی اصل وقت تک حین تیرے قبضے میں نہ آسکیں گے۔ بس جیسے ہی خون کی ندیوں کا ذکر آیا ایک مرتبہ شیر ذوالجلال کے بیٹے کو جلال آگیا جیڑ کر کر کے لال کو جلال آگیا فرمایا اَتَهْدِيْكَ يٰ اَبْنَا الْمَرْزُوقِ اَوْ زَيْنُ الْكُوْنِ چشم کے نیچے تو مجھے موت سے ڈراتا ہے۔ مجھے قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔ اَاَنْتَ تَقْتُلُنِيْ اَمْ هُوَ۔ ان مجھے قتل کرے گا ورنہ قتل کرے گا یا تو قتل کرے گا۔ جیسے ہی مولانا کی آواز بلند ہوئی اور ہاشمی جو ان کے کانوں سے آواز سن رہا تھا ایک مرتبہ دارالامارہ کا دروازہ کھلا، ہاشمی جوان دربار میں آئے، آگے آگے ابوالفضل العباس تلوار لے ہوئے کس نے مولانا کی شان میں گستاخی کی۔ آقا آپ کو آواز بلند کرنے کی ضرورت کیوں پڑی۔ کہا بیٹا ٹھہرو ٹھہرو عباس! تلوار چلانے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے اور سنی ہاشم کے جوانوں کے حلقے میں گولہ بار سے واپس چلے۔ جب بیت الشرف میں قدم رکھا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہن بھائی کا انتظار کر رہی ہے۔ اسے بھیا، خیر تو ہے؟ فرمایا بہن بس مختصر یہ ہے کہ اب یہ مدینہ رہنے کے لائق نہیں رہ گیا ہے۔ اسے بہن سامان سفر تیار کر دو اب یہ مدینہ ہم سے چھٹنے والا ہے۔ نانا کی قبر چھوٹے گی، ماں کی قبر چھوٹے گی، بھائی کی قبر چھوٹے گی، حسین سے مدینہ چھوٹ جائے گا۔ یہ پہلا موقع تھا جب گدالوں نے اپنے کردار کا اعلان کیا اب آؤ چاہنے والوں کی وفاداری دیکھیں۔ بس رونے والو مجلس تمام ہو رہی ہے۔

جب مدینہ میں حسین دربار میں جا رہے تھے تو زینبؓ کے گدالوں کی وفاداری کا اعلان کیا اور جب عاشور کی رات آئی اور ایک مرتبہ بھائی نے آکر خبر سنائی کہ بہن یہ زندگی کی آخری رات ہے۔

وہ مدینے کی آخری رات تھی یہ زندگی کی آخری رات ہے۔ اسے بہن کل جنگ ہونے والی ہے، کلی معرکہ کارزار گرم ہونے والا ہے۔ اب صلح کی کوئی تدبیر باقی نہیں رہ گئی ہے۔ یہ سننا تھا کثرت ہزلی کی زبان پر ایک فقرہ آگیا۔ بھیا تو آپ نے اپنے چاہنے والوں کو آزاد کیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کل میدان کارزار میں آپ کا ساتھ چھوڑ دیں۔ بس یہ سننا تھا کہ دروازہ پر بیٹھے موسے چاہنے والے کے کان میں یہ آواز آئی۔ اسے شہزادی

کہ ہم غلاموں کی وفادار اعتبار نہیں ہے۔ ایک مرتبہ نافع اٹھے اور اگر جمع اصحاب میں آواز دی۔ حبیبؓ زہیرؓ مسلمؓ کیا بیٹھے ہو ہماری زندگیوں کا فائدہ کیا۔ جب دختر زہراؓ کو ہماری وفادار اعتبار نہیں اسے نافع۔ کیا خبر لے کے آئے۔ کہا شہزادی فرما رہی ہیں کہ بھیا اپنے ساتھیوں کو آزاد کیا ہے۔ بس یہ سننا تھا تلواروں کو نباموں سے نکال لیا انبیاموں کو توڑ توڑ کے پھینکا۔ آئے درخیمہ پر۔ آواز دی۔ زہراؓ کے لال! زہراؓ کے لال! مولانا زہراؓ کے درخیمہ پر آگئے۔ کہا اسے چاہنے والو! یہ تمہارا کیا حال ہے؟ کہا ہم نے شہزادے کو شہزادی کو ہماری وفادار اعتبار نہیں ہے۔ مولانا کے فراموش کیے یا ہم غلاموں کی وفادار اعتبار کریں؟ یا آپ اجازت دیجئے ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی گردنیں کاٹ ڈالیں مگر یہ نہ سن سکیں گے کہ ہماری وفادار اعتبار نہ ہو۔ اسے چاہنے والو! تمہاری وفاداری جمع قربان۔ تم نے ایسی وفاداری کا ثبوت دیا کہ حسینؓ سے سندوفا بھی لے لی اور اس کے بعد آخری سند بھی لی۔ جب کوئی ذرہ گیا تو درخیمہ سے آواز دے رہے ہیں۔ اسے میرے شہر! اسے میرے جانا زو! حبیبؓ حسینؓ پرکار رہا ہے۔ مسلمؓ مولانا تمہارا آواز دے رہا ہے۔ عابد ہمارے کہتے ہیں کہ جب بابا کی آواز مقلد میں آئی تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ شہیدوں کے لاشے ٹپٹپنے لگے۔ کئی گردنوں سے آواز آئی مولانا! اگر موت درمیان میں حاصل نہ ہوگی ہوتی تو یہ غلام اب بھی آپ کی راہ میں جان دینے کے لئے تیار ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ وَاٰلِیْہٖ وَاَصْحَابُہٗ سَآئِیْنَ

دوسری مجلس کرم امام حسین علیہ السلام

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ سے دوست رکھے

جو میرے حسینؑ سے محبت کرے۔"

سرکارِ دو عالم کا یہ ارشاد گرامی جس کی روشنی میں عرفانِ حسینؑ سے متعلق کچھ
معروضات سال گذشتہ آپ کے سامنے پیش کئے گئے تھے اور کچھ باتیں کردارِ سید الشہداء
سے متعلق اس سال ان مجالس میں گزارش کرنا ہیں جس کا سلسلہ کل سے شروع ہوا ہے۔
کل میں نے آپ کے سامنے امام حسینؑ کے علم سے متعلق کچھ باتیں گزارش کی تھیں آج
گفتگو کے دوسرے مرحلہ پر کچھ باتیں کرم سرکارِ سید الشہداء سے متعلق گزارش کرنا ہے۔
امام حسینؑ کی زندگی سراپا کرم ہے۔ اس اجمال کی تفصیل تھوڑی دیر کے بعد
گزارش کی جائے گی۔ آئیے پہلے اسلامی روایات کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ اسلامی
لفظِ نگاہ سے کرم کس کو کہا جاتا ہے اور کرم کے معنی کیا ہیں۔ اس وقت جو روایات
میری نگاہ کے سامنے ہیں ان کا خلاصہ چند لفظوں میں یہ ہے کہ ایک مقام پر معصوم
نے کرم کی تعریف کی: اَلْكَرْمُ الْعِطَاءُ قَبْلَ السَّوَالِ یعنی
جہاں انسان مانگے گا انتظار نہیں کرتا بلکہ سوال دے دیا کرتا ہے اسی کو کرم کہا جاتا
ہے اور اسی لئے پُروردگار نے بار بار اپنا تعارف لفظِ کرم سے کرایا ہے سخی سے نہیں
کرایا۔ آپ پورے قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ مالکِ کائنات

تاریخ کربلا

مؤلف

الحاج ایوب نقوی مصطفیٰ آبادی

عصہ پبلیکیشنز

بی۔ او باکس نمبر 18168

کراچی 74700 پاکستان

jabir.abbas@yahoo.com

نے اپنے کو غنی کریم تو کہا ہے اپنے کرم کا اعلان تو کیا ہے مگر ایک مقام پر بھی اپنے کو سخی نہیں کہا ہے اس لئے کہ سخی بہر حال عطا کرنے والے ہی کا نام ہے مگر سخاوت وال کا انتظار کرتی ہے۔ جو شکم مادر سے غنایت کر رہا ہے وہ اپنے کرم میں کس کے سوال کا منتظر ہے۔ مانگنے والا مانگنے کے معنی نہیں جانتا اور عطا کرنے والا مسلسل عطا کرتا جا رہا ہے اور اس مبارک رات شب جمعہ کی مناسبت سے ایک لفظ یہ بھی گزرا دیش کرنا چاہتا ہوں کہ اکثر لوگ اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ ہم اللہ کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں، طلب کرتے ہیں، مانگتے ہیں مگر خدا دیتا نہیں ہے۔ کتنا احسان فراموش ہے یہ کہنے والا۔ یہ اس کے بارے میں کہہ رہا ہے جو اس وقت سے عطا کر رہا ہے جب انسان مانگنے کے معنی بھی نہیں جانتا تھا جب انسان کی کوئی اوقات نہیں تھی۔ روز اول جب انسان نے شکم مادر میں قدم رکھا نہ سوال کا تعلق نہ مانگنے کا طریقہ جانتا ہے نہ اپنے ضرورت بات کو پہچانتا ہے مگر جو عطا کرنے والا ہے وہ اس کی ضرورت کو بھی جانتا ہے اور اپنی مصلحت کو بھی جانتا ہے۔ جو اس وقت سے عطا کرتا رہا ہو، بلا سوال دیتا رہا ہو اس کے بارے میں یہ شکایت کی جائے کہ مانگتے ہیں اور دیتا نہیں ہے، اتنے تجربات کو اتنی آسانی سے بھلا دینا یہ انسان کے حافظے کی وہ گزری ہے کہ جس کے بعد پھر شرافت باقی نہیں رہتی ہے۔ تو کرم کی ایک پہچان ہے العطاء قبل السؤال کرم وہ ہوتا ہے جو سوال سے پہلے ہی عطا کرے۔

دوسری تعریف کرم کی روایات میں یہ کی گئی ہے *بیتاؤ فی عرض علی الخصال* کرم کے معنی یہ ہیں کہ جب مال اور آدمی میں مجراؤ ہو جائے تو انسان مال قربان کرے مگر آدمی بچالے۔ کرم اسی کو کہا جاتا ہے، شریف وہی ہوتا ہے جو مال اور عزت کے مجراؤ میں عزت کی پرواہ کرے، مال کی پرواہ نہ کرے۔ یہ بات ہمارے یہاں بطور محاورہ تو ہمیشہ کہی جاتی ہے مگر منزل عمل میں انسان کہاں تک کامیاب ہوتا ہے یہ ایک منتقل موضوع ہے جس کے عرض کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ کسی آدمی سے اگر آپ کوچھیں کہ جان اور مال کا رشتہ کیا ہے تو دور قدیم کی یہ مثل چلی آ رہی ہے کہ جان کا صدقہ مال ہے۔

ہر آدمی کہتا ہے کہ جان کا صدقہ مال ہے۔ یعنی جان اور مال میں معاملہ آجائے تو جان کو بچا لیا جائے گا اور مال کو قربان کر دیا جائے گا۔ لیکن دیکھا جاتا ہے کہ جب زندگی میں کوئی ایسا موقع آجاتا ہے تو انسان جان دے کے مال کھاتا ہے، مال دے کے جان بچا لے گا۔ اپنی زندگی کی پرواہ نہیں کرتا، اپنی صحت کی پرواہ نہیں کرتا، جان معلوم ہو جائے کہ چار پیسے لئے والے ہیں تو انسان جان دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور اس کے بعد بھی یہ کہتا ہے کہ جان کا صدقہ مال ہے جب کہ ہمیشہ مال پر جان کو قربان کرنا رہا ہے۔ لہذا یہ بات تو بہت آسان ہے کہ عزت اور مال کے مجراؤ میں تقاضے کرم و شرافت یہ ہے کہ مال کو قربان کر دیا جائے، عزت کو بچا لیا جائے مگر واقعی انسان ایسا کرم ہوتا ہے یا نہیں ہوتا؟ واقعی انسان میں یہ شرافت پائی جاتی ہے یا نہیں؟ یہ ایک مسئلہ جس کا فیصلہ ان اجتہادات میں نہیں ہو سکتا ہے۔ جب زندگی میں مجراؤ پیدا ہو جائے تب یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شریف کون ہے جو مال کو ٹٹاکے اور بچا لیتا ہے۔ اور وہ کون لوگ ہیں جو مال دنیا کو حاصل کرنے کے لئے اپنی عزت و اکبر کو فکری بھی نہیں کرتے ہیں ان تلخ باتوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن بہر حال کچھ ذمہ داریاں ہیں لہذا ان کے بارے میں کچھ اشارات آپ کی خدمت میں پیش کرنا ہیں۔ ہماری زندگیوں میں کتنے ایسے واقعات تھے ہیں جہاں ہماری عزت میں اور مال میں مجراؤ ہو جاتا ہے ہم یہ سوچتے ہیں۔ یہ ارباب ہے یہ مالک ہے اگر دو باتیں کہہ بھی دے گا تو کیا حرج ہے تنخواہ تو سلامت ہے گی۔ یہ ہمارے میں کوئی غلط تبصرہ کر دے گا تو کوئی بات نہیں ہے پیسہ تو برقرار ہے گا۔ یہ ذرا ہمیں ذہیل بھی کر دے گا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے آمدنی تو بڑھ جائے گی۔ ہماری نگاہ میں عزت و اکبر دے کے مال کمانے والے کچھ مخصوص افراد ہوتے ہیں حالانکہ اگر زندگیوں کا تجربہ کیا جائے تو لاکھوں کروڑوں افراد جو غلط پیشوں میں نہیں مگر بھی کاروبار کرتے ہیں اور یہی راستہ اختیار کرتے ہیں اس لئے کہ ان کے سامنے بھی جب مال و اکبر کا مقابلہ ہو جاتا ہے تو اکبر و دنیا گوارا کر لیتے ہیں مال کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتے ہیں ایسے امتحانات کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ برادر دگوار کی نگاہ میں وہ عزت و شرافت و کرم ولے کون ہیں

Jabir.abbas@yaho

جو ہر ماں کو لٹا سکتے ہوں مگر آدمی کی قربانی کو برداشت نہ کر سکتے ہوں میں ابھی غلامی کا
 میں جب کرم پیدائش ہوا گا ذکر کروں گا تو ان ساری باتوں کی مثالیں آپ کے سامنے
 عرض کروں گا۔ لیکن ابھی تو میں نہ کرہ کرم اس اعتبار سے کہ وہ ہوں کہ روایات اسلامی
 میں کرم کے معنی کیا ہیں اور کرم کا تصور کیا ہے، کسے کرم اور شریف کہا جاتا ہے یہ
 ایک مسئلہ ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کرم اور شریف کا کردار کیا ہوتا ہے اس کے
 بارے میں دو لفظیں ہیں مولائے کائنات کی میں چاہتا ہوں میرے عزیز تمام مسلمان
 والے اور میری بہنیں بیٹیاں بھی متوجہ رہیں یہ دو باتیں شاید ہماری زندگی کے
 لئے بے نئے سبق ہیں جن کی طرف ہم متوجہ نہیں ہیں ورنہ امانت نے تو یہ باتیں چودہ سو سال
 پہلے فرمادی تھیں لیکن شاید ہماری توجہ نہ ہو۔ ایک فقرہ ہمارے کرم کے بارے میں
 مولائے کائنات نے ارشاد فرمایا کہ دیکھو اگر تم نے کسی آدمی پر کرم کیا ہے، مہربانی کی ہے
 کسی کو کچھ دیدیا ہے تو تم نے دے کے اپنی عزت نفس کا مظاہرہ کیا ہے یعنی اپنی شرافت
 کو بچھڑوا یا ہے، اپنے کرم کے ذریعہ اپنے کمال کو بچھڑوا یا ہے۔ کرم کے
 ذریعہ اپنی عزت کا مظاہرہ کیا ہے، اپنی شرافت کا مظاہرہ کیا ہے، اپنے کمال کا مظاہرہ
 کیا ہے تو مقابل والے کو دیا کیا ہے جس کا شکریہ چاہتے ہو؟ سوائے معصوم کے اس
 نکتے کو کوئی سمجھا نہیں سکتا، سمجھنے والے نہیں پیدا ہوتے سمجھانے والے کہاں پیدا
 ہوں گے۔ اگر آپ کسی غریب کے ہاتھ پر چاڑھیے رکھ دیں تو منتظر رہتے ہیں کہ وہ
 شکریہ ادا کرے۔ اگر ہم نے کسی کو کوئی کام دلوا دیا، کوئی احسان کر دیا، کوئی فوٹو لیا
 کاروبار کرادیا، لائسنس دلوا دیا، کوئی کام بھی کر دیا، کسی بچے کی فیس دے دی زندگی بھر
 انتظار رہا کہ ہم نے احسان کیا ہے یہ شکریہ ادا کریں حالانکہ مولانا فرماتے ہیں کہ تم نے جو کچھ بھی
 کیا ہے اس کی قیمت تو لے لی اس کا کریڈٹ تو لے لیا جیسے ہی اچھا برتاؤ کیا سب کچھ
 تم کرم ہو سب کو اندازہ ہو گیا تم شریف ہو تو تم نے اپنی شرافت کا مظاہرہ کر دیا، یہی
 تمہارے عمل کی قیمت تھی۔ اگر تم نے عزت دی ہوئی اور اس کی قیمت مانگے تو ایک
 بات سمجھو یہ آتی ہے۔ تم نے دیا کیا ہے، اپنی عزت کا مظاہرہ ہی تو کیا ہے، یعنی اپنی

عزت کو منوایا، اپنی شرافت کو منوایا، اپنے کرم کو منوایا، جب مقابل والے نے
 تمہاری عزت و شرافت و کرم کو مان لیا یہی تمہارے کرم کی قیمت ہے اب اس کے
 بعد اس سے کیا چاہتے ہو، معاوضہ تو اس چیز کا مانگا جاتا ہے جو کسی کو دیا جائے۔ تم نے
 عزت دی نہیں ہے تم نے عزت منوائی ہے، تم نے شرافت دی نہیں ہے تم نے شرافت کا
 ارادہ کیا ہے۔ میں یہی تمہارے کرم کے لیے کافی ہے۔ بات کہنے میں بہت آسان دکھائی
 دیتا ہے لیکن اگر ہر انسان اپنی فطرت کا جائزہ لے تو میری گفتگو کو معاف کریں گے۔
 آپ کو شاید کہ دوڑوں میں کوئی ایک انسان ایسا مل جائے جو نیک سلوک کرنے کے بعد
 اچھا برتاؤ کرنے کے بعد کرم کے شکریہ کا انتظار نہ کرے۔ ہو سکتا ہے میں آپ کے ساتھ
 برتاؤ کرنے کے بعد مقابلہ میں برتاؤ کا انتظار نہ کروں کہ میں نے چائے پلائی ہے تو آپ
 ہی چائے پلائیں، میں نے ناشتہ کرایا ہے آپ بھی ناشتہ کریں، میں نے کھانا کھلایا ہے
 تو آپ بھی کھانے کے لئے مدعو کریں۔ ہو سکتا ہے یہ انتظار نہ کروں لیکن اتنا انتظار تو انسان کو بھر جا
 رہا ہے کہ اگر ہم نے کوئی اچھا برتاؤ، اچھا سلوک کسی کے ساتھ کیا ہے تو کم سے کم ایک
 شکریہ تو کہہ دے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آدمی نہیں کہتا ہے تو آدمی ناراض ہو جاتا ہے۔
 ایک مرد دوسرے نے مجھ سے کہا کہ مسلمان معاشرے سے تو کا فر معاشرے اچھے ہیں اسلئے
 کہ کا فر معاشرہ میں بہر حال یہ بات پائی جاتی ہے کہ ایک آدمی سا بھی برتاؤ اگر آپ
 ان کے ساتھ کر دیجئے تو پلٹ کر تھینک یو (THANK YOU) تو کہتے ہی ہیں کم سے کم
 پلٹ کر تھینکس (THANKS) تو کہتے ہی ہیں مگر ان مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ آپ پانی
 پلا دیجئے کوئی جواب نہیں ملتا ہے، کھانا کھلا دیجئے کوئی ذکر نہیں آتا ہے، کوئی اچھا برتاؤ
 کر دیجئے پلٹ کر کوئی فوٹس ہی نہیں لیتے ہیں، ان مسلمانوں سے تو کافر ہی اچھے ہیں۔ میں نے
 کہا کسی سے مقابلہ نہ کیجئے، نہ کمال یہ ہے نہ کمال وہ ہے اس لئے کہ وہ جو کہتے ہیں وہ
 بطور عادت ہے بطور نشتر نہیں ہے۔ بچپن سے عادت ڈال دی گئی ہے وہی عادت ہوتی
 ہوتی رہتی ہے۔ کہنے لگے یہ آپ کیوں کسی پر الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے کہا میرے پاس
 عادت ہے۔ میں نے ایک فطرہ، ایک گھونٹ، ایک پیالی چائے تو مجھ سے دس مرتبہ

کہا تھینکس لٹ آف تھینکس (THANKS LOT OF THANKS) اور جس نے
وجود دے دیا زندگی دے دی، حیات دے دی، کبھی ایک سجدہ کرنے کے لئے تیار
نہیں ہوئے، ایسے بے ایمانوں کو شکر گزار کہا جائے گا؟۔ صلوات

شرافتوں کو آداب سے نہیں پہچانا جاتا احساسات سے پہچانا جاتا ہے۔ بہر حال ہرگز
میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ کم کرنے کے بعد اچھا برتاؤ کرنے کے بعد کم سے کم شکر یہ کمال
رہتا ہے۔ یہ کمزوری آپ میں بھی ہے، یہ کمزوری مجھ میں بھی ہے، یہ کمزوری ہر انسان میں
پائی جاتی ہے اور اس کی ایک میرے پاس قرآنی دلیل ہے۔ تو میرے فرامیں گے میرے فروع
سے متعلق ہے اس لئے گزارش کر رہا ہوں۔ میرے پاس اس دعوے کی قرآنی دلیل ہے۔
اگر ہر انسان ایسا بالکل ہوتا جو کم کرنے کے بعد شکر کا انتظار نہ کرتا تو یہ دردگار کبھی
اپنے بندوں کی تعریف میں یہ بات نہ کہتا۔ تم سب کی شکر کر، وری یہ ہے کہ احسان کرنے
کے بعد شکر کے منتظر رہتے ہو۔ میرے پاس کچھ ایسے بندے بھی ہیں جو فاقہ کرنے کے
بعد روزے رکھنے کے بعد پانی سے افطار کرنے کے بعد، براہِ تین دن تک کھلاتے رہے
مگر وہ کہہ رہے تھے لا تدریئک شکرک وجہ ذلک ولا تشکروا نہ کوئی جزا چاہئے نہ کوئی ثواب
چاہئے۔ یہ وہ انفرادی کردار ہے جس کے لئے سورہ اتارا جاتا ہے۔ صلوات

تو مولائے کائنات کا ارشاد گرامی ہے کہ ایک کریم انسان، ایک شریف انسان کی
پہلی پہچان یہ ہے کہ جب انسان کچھ کرتا ہے تو اس کے مقابلے میں کسی شکر کا مطالبہ
نہیں کرتا، کسی شکر کا انتظار نہیں کرتا، یہ تو خود ہی ایک شکر پروردگار ہے کہ اس نے
کچھ دیا ہے تو ہم کسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ علم دیا ہے تو لوگوں کو علم دیں، مال
دیا ہے تو لوگوں کو مال دیں۔ اگر طاقت دی ہے تو لوگوں کے کام آئیں۔ اگر اللہ نے
صلاحیت دی ہے تو اس صلاحیت کو بندگانِ خدا کی راہ میں صرف کریں یہ تو خود ہی
ایک شکر ہے اب اس کے بعد مزید شکر یہ کس بات کا۔ مزید تقاضہ یا انتظار کس بات
کا۔ دوسری بات جو مولائے کائنات نے ارشاد فرمائی ہے
میرے عز: بڑا! اس لفظ کو یاد رکھئے گا۔ عربی زبان کے اعتبار سے لفظ کریم کا تعلق ہے

لفظ آتا ہے وہ ہے لفظ لیم یعنی جو صاحبِ کم ہوتا ہے اسے کم کہا جاتا ہے جیسے
ہاں! ہمیں پائی جاتی ہے اور اس کے خلاف ہوتا ہے اسے لیم کہا جاتا ہے۔ ہماری اُردو زبان
میں شریف اور ذلیل جس کو لوگ نہیں جانتے ہیں تو ذلیل کہہ دیا کرتے ہیں، حالانکہ ذلیل
الگ چیز ہے۔ شریف کے مقابلے میں جو لفظ آتا ہے وہ لفظ ہوتا ہے ذلیل۔ کبھی آدمی
شریف ہوتا ہے کبھی ذلیل ہوتا ہے۔ مولائے فرمایا کبھی انسان کریم ہوتا ہے کبھی انسان
کریم ہوتا ہے اور ان دونوں کی پہچان میں عجب بات فرمائی ہے خدا جانتا ہے اگر آپ غور
کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کتنے باریک نکات انسانی کردار کے ہیں، نہ مصوم کے
ظاہر کوئی جانتا ہے نہ کوئی بتا سکتا ہے۔ ایک عجب فقرہ ارشاد فرمایا۔ فرمایا کریم انسان
وہ ہوتا ہے جو کم کو اپنے اوپر ایک قرض سمجھتا ہے۔ ہم شریف ہیں تو شرف کا برتاؤ کرنا
شرافت کا اظہار کرنا یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ لہذا اگر ہم شرافت کا برتاؤ کر رہے ہیں تو
جو کم کا فرض ہمارے ذمے ہے اُسے ادا کر رہے ہیں۔ توہم کریں جو کہ ہم نے وہ سمجھتا ہے
مہربانِ پروردگار عالم نے ہم کو شریف بنایا ہے تو اس شرافت کی ذمہ داری ہم پر ہے
کہ ہم شرافت کا مظاہرہ کریں اور دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کریں تو واقعی جو
شریف ہوتا ہے وہ اُسے اپنے ذمہ قرض سمجھتا ہے جس کو ادا کرتا ہے۔ اور جو ذلیل ہوتا
ہے، دست ہوتا ہے لیم ہوتا ہے۔ وہ اپنی شرافت کو اپنا قرض دوسرے پر سمجھتا ہے جسکی
قوت وصول کرنا چاہتا ہے۔ یعنی ہم اگر کسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں تو یہ
ہماری ایک ذمہ داری ہے۔ یہ ایک قرض ہمارے ذمے ہے جو ہم ادا کر رہے ہیں۔ یہ کسی
کو قرض دیا نہیں جا رہا ہے کہ جس کا معاوضہ لیا جا رہا ہو یا معاوضہ مانگا جا رہا ہو یہی فرق
ہے ایک انسان شریف میں اور ایک انسان ذلیل میں۔ اور ظاہر ہے کہ کم اسلامی
لفظ کا وہ معنی عظیم شے ہے کہ دین پروردگار میں سرکارِ دو عالم کی زبان سے اس تافان
الہام کی گئی ہے کہ دیکھو یہ وہ چیز ہے جو گناہ پروردگار میں عز ہے۔ خدا کو پسند ہے چاہے وہ
اسلام کے ساتھ جمع ہو اور چاہے کفر کے ساتھ جمع ہو۔ یعنی مسلمان اگر کریم ہے
اور جس کوئی کا خدا رہے بہ اعتبارِ کم بھی اور بہ اعتبارِ دین و مذہب و عقیدہ بھی۔

لیکن اگر کوئی انسان مسلمان نہیں ہے مگر اپنی قوم میں صاحب عزت ہے، صاحب کرم ہے، صاحب شرافت ہے تو اس کی شرافت کا احترام بھی ہونا چاہیے چاہے مسلمان نہ ہو۔ سرکارِ دو عالم کا ارشاد گرامی ہے جس کے الفاظ روایات میں اکرموا کریمہ کل قوم۔ کسی قوم کا کوئی کریم و شریف انسان ہو تو ہماری ذمہ داری ہے کہ اس کی قومی شرافت کا خیال کر کے اس کا احترام کرونا کہ کرم محترم ہے، لوگ سمجھیں کہ شرافت قابلِ احترام چیز ہے، مسلمان بھی ہو جائے گا تو دہرے احترام کا حقدار ہو جائے گا۔ لیکن اگر مسلمان نہ بھی ہو تو اس کی شرافت قومی کا احترام ہونا چاہیے یہ پیغمبرِ اسلام نے ارشاد فرمایا کہ پیغمبر کے بعد لوگ اس معنی کو سمجھنا یا سرکارِ دو عالم نے جب سمجھا نا چاہا تو شاید اسی دن حضور کی زبان سے سن لیا سب نے مگر حضور نے کیوں سمجھا یا، کب کے لے سمجھا یا شاید لوگ سمجھے اس کا تاریخی ثبوت بھی خود تاریخوں کے اندر موجود ہے کہ سرکارِ دو عالم کے بعد مسلمانوں میں جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا اور فتوحات کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ یہ علاقہ فتح ہوا وہ علاقہ فتح ہوا، وہ علاقہ فتح ہوا تو انھیں فتوحات کے ذیل میں جب سرزمینِ فارس کو فتح کیا گیا اور وہاں سے کچھ لوگ گرفتار کر کے لائے گئے جو، بڑے گھرانے کے لوگ تھے، بادشاہوں کے گھرانے کے لوگ تھے اور پکڑ کے قیدی بنا کے لائے گئے اور حکومت وقت کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ جن لوگوں نے بغاوت کی ہے، اسلام قبول نہیں کیا، ہم نے ان کے علاقہ پر حملہ کیا اور وہاں سے کچھ کران لوگوں کو لائے ہیں۔ یہ بادشاہ کے گھرانے کے مرد ہیں بڑے گھرانے میں اور یہ بادشاہ کے گھرانے کی لڑکیاں ہیں، جنھیں ہم قیدی بنا کر لائے ہیں۔ جب حکومت وقت کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تو تاریخ اسلام بیان کرتی ہے کہ حکمِ وقت نے فیصلہ دے دیا کہ جنہیں گرفتار ہو کے آئی ہیں انھیں بیچ دیا جائے اور جنہیں مرد قیدی بن کے آئے ہیں انھیں غلام بنایا جائے۔ اس لئے کہ کینز اور غلام بیچے تو جا ہی سکتے ہیں۔ لہذا انھیں فروخت کر دیا جائے اور انھیں اپنی غلامی میں شامل کر لیا جائے۔ جیسے ہی یہ فیصلہ حکومت وقت نے سنایا اور مولائے کائنات نے حاکم وقت کا یہ فیصلہ سنایا یہ تو تمہارا فیصلہ ہو گیا یہ بھی یاد ہے کہ پیغمبر نے کیا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے

معنی یہ ہیں کہ الفاظ سب کے کان میں بڑے ہوئے ہیں مگر کوئی سمجھا کوئی نہ سمجھا اور ہمیں یہ کہنے کو بھی چاہتا ہے کہ جب پیغمبر کی بات لوگ سمجھ نہیں پاتے ہیں تو ہمارے ہی جیسے بشر ہیں۔ وہ پیغمبرِ عرب کو اپنا جیسا بشر کہا جاتا ہے جب اس کے کلام کے معنی سمجھ نہیں آتے ہیں تو اس کے بعد یہ دعویٰ کہ کلام خدا سمجھنے کے لئے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے کلام پیغمبر خدا سمجھنا سیکھو کلام خدا تو بعد میں سمجھیں آئے گا مولائے کائنات نے فرمایا کیا تمہیں یاد نہیں ہے کہ سرکارِ دو عالم نے فرمایا تھا اکرموا کریمہ کل قوم۔ ہر قوم کے شریف کا احترام کرو، یہ شریف گھرانے کے قیدی ہیں، یہ شریف گھرانے کی بیٹیاں ہیں جنھیں قیدی بنا کر لایا گیا ہے۔ خبردار انھیں پیچھے کا ارادہ نہ کرنا مولائے کائنات نے خود اپنا کوئی فیصلہ نہیں سنایا۔ ایک ایک لفظ ہے جو قابلِ توجہ ہے۔ مولائے خود اپنا فیصلہ نہیں سنایا کہ ایک رائے آپ کی ہے، ایک رائے ہماری ہے۔ مولائے ان کے ارشاد کا حوالہ دیا جن کے سب کلمہ گو ہیں۔ یہ پیغمبر کا سب کلمہ بڑھتے ہیں۔ کیسا کلمہ ہے، یہ کیسی دراشت ہے، یہ کیسی نیابت ہے کہ پیغمبر کی جگہ پر بیٹھے کے بعد بھی پیغمبر کا کلام یاد نہ رہ جائے۔ پیغمبر کا کلمہ بڑھنے کے بعد بھی ان کی تعلیمات یاد نہ رہ جائیں۔ فرمایا خبردار سرکارِ دو عالم فرمائے ہیں کہ ہر قوم کے شریف کا احترام ہونا چاہیے۔ لہذا یہ شریف زادیاں ہیں پیغمبر نہیں جاسکتی ہیں، انھیں بازار میں فروخت نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اب ایک لفظ میں کہتا ہوں معنی آپ گھما کے سوچئے گا اور پہچانئے گا کہ ایک مقام پر دو انسانوں کے دو فیصلے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ بیچ ڈالا جائے، مولائے پیغمبر کا حوالہ دے کے یہ فیصلہ سنایا کہ حضور فرمائے ہیں کہ خبردار نہ بیچا جائے۔ آپ جانتے ہیں ہر مغلوب شکست خوردہ قوم کا فطری مزاج یہ ہوتا ہے کہ جو انسان ہار جاتا ہے، مغلوب ہو جاتا ہے، گرفتار ہو جاتا ہے، قیدی بن جاتا ہے وہ ہمیشہ ہر ایک کو التماس آمیز نگاہ سے دیکھتا ہے شاید کوئی رحم کھائے والا پیدا ہو جائے۔ توجہ کریں۔ شاید کوئی رحم کھانے والا سامنے آجائے جو جتنا شدید تڑاؤ کرنا جاتا ہے اس سے اتنی ہی نفرت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اور جو ایک حرفِ تم،

ایک حرفِ رحمت، ایک کلمہ ہر بانی کہہ دیتا ہے اس کی جگہ خود بخود دل میں پیدا ہو جاتی ہے یعنی اقتدار کو دلوں کو قدیم بنا تا ہے، ہر بانی دوں پر قبضہ کرتی ہے۔ شانِ امام کا تجربہ چودہ صدیوں میں کیا گیا کہ نسخِ فسخ اور نے کیا تھا اور کسی اور کا پڑھا جا رہا ہے صلوات یہ بنے قدر کم جس کی طرف سرکارِ دو عالم نے اشارہ کیا۔ میں ایسی گفتگو کے تین مراحل سے گزر چکا کہ کم کے معنی بھی معلوم ہو گئے۔ شانِ اکرم کیا ہوئی ہے یہ بولائے گا سنا تھا کے ارشاد گرامی کی روشنی میں معلوم ہو چکا۔ اور اکرم کا احترام بہر حال ہونا چاہیے۔ جو حضور سرورِ کائنات فرماتے ہیں، جس کا حال مناسب وقت آنے پر بولائے گا مکانات نے امتِ علیہ السلام سے پیش کیا۔ اب اس سلسلے میں بات کو سراپد الشہداء تک پہنچانے سے پہلے ایک لفظ ضمناً گذاروں کہ راجا پتا ہوں۔ جب تاریخِ کریم کا ذکر کیا گیا تو امامِ ترمذی نے ایک روایت نقل کی ہے اور فرمایا ہے ————— کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کم خاندانوں میں چلا کر آتا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کم اور شرافت خاندانوں میں چلا کر آتی ہے چنانچہ انھوں نے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک بندہ خدا ابراہیم ہے کہ جس کی تعریف روایات میں کی گئی ہے اور اس کے نسلی کریم اور نسلی شرافت کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا اللہ کے بندوں میں ایک بندہ تھا جس کی تعریف یہ ہے الکریم۔ ابن الکریم۔ ابن الکریم۔ ابن الکریم۔ ابن الکریم۔ ایسا بندہ بھی ہے کہ جس کے سلسلۂ نسب میں چار مرتبہ یہ لفظ کریم استعمال ہوا ہے کریم۔ ابن کریم۔ ابن کریم۔ ابن کریم۔ اور یہ ابتداء خدا نے دیا تھا جناب یوسفؑ کو ————— گویا روایات کی روشنی میں امامِ ترمذی نقل کرتے ہیں کہ یہ ابتداء جناب یوسفؑ کا تھا اور افتاء جناب یوسفؑ ایسے کریم تھے کہ جیسے ہی مصر کے خزانوں پر قبضہ ہوا ویسے ہی خزانوں کے دروازے کھول دے، خزانوں کے دہانے کھول دے، گوئی نندہ صراخ و نذرہ جائے۔ لہذا جناب یوسفؑ کا کریم لوگوں نے پہچانا اور اس کے بعد روایات پہنچو یا یہ تنہا جناب یوسفؑ کا کریم نہیں ہے ان کے باپ جناب یعقوبؑ وہ بھی دیسے ہی کریم تھے ان کے والد زکوٰۃ جناب اسماعیلؑ وہ بھی دیسے ہی کریم تھے ان کے والد زکوٰۃ جناب اسماعیلؑ وہ بھی دیسے ہی کریم تھے ان کے والد زکوٰۃ جناب اسماعیلؑ وہ بھی دیسے ہی کریم تھے

جناب یوسفؑ کو کرم جناب یوسفؑ کو ذیل نے پہچانا۔ مگر اسی کرم سے یہ بھی پہچانایا گیا کہ یہ کرم ذاتی نہیں ہے یہ کرم نسلوں میں آیا ہے، یہ شرافت نسلوں میں آئی ہے چار پشتوں شرافت جناب یوسفؑ کے خاندان میں چل رہی ہے۔ چار پشتوں سے کرم چل رہا ہے قرآن مجید کے ایک لفظ کہتا ہے اگر روایات کی روشنی میں جناب یوسفؑ کا یہ امتیاز ہے کہ یوسف کرم ہیں، باپ کرم ہے، دادا کرم ہے، پردادا کرم ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا کرم امتیازی کہا جاتا ہے۔ جس کا کرم چار پشتوں تک چلے۔

جس کا کرم چار پشتوں میں چل جائے اس کا کرم ایسا امتیازی قرار دیا جاتا ہے کہ روایات میں اس کے کردار کا امتیاز یہ بیان کیا جاتا ہے۔ اب میں اس خاندان کے بانی کی ایک کہوں۔ جس کے آخر سے اگر آپ شروع کریں تو آخر سے لے کر پیغمبر اسلامؐ تک چلے جائیے اور آگے بڑھاکے ابراہیمؑ تک چلے جائیے پورا سلسلہ، سلسلہ کرم ہے۔ بارہواں گیارہویں کا بیٹا، گیارہواں دسویں کا لال۔ وہ نوں کا بیٹا اور وہ کرم ابن کرم ابن کرم۔ وہاں تو چار پر جا کے سلسلہ رنگ گیا، یہاں تو سلسلہ رکنے والا نہیں ہے۔ صلوات

قوعہ زبان محترم میں یہ گزارش کر رہا تھا کہ کرم کی اس مختصر تعریف اور بیان کی اس مختصر تحسید کے بعد آئیے ایک نظر ڈالیں سرکار سید الشہداءؑ کے کردار پر اور آپ کے کرم پر۔ یہ بڑی طویل داستان ہے اس کے عرض کرنے کے لئے بڑا وقت چاہئے لیکن میں اجمالی خاکہ آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں اس کے بعد کتابیں آپ پڑھیں گے، کتابوں میں تفصیلی حالات آپ کو مل جائیں گے۔ امام حسینؑ کے کرم کے پہلے تین منہ بچائے اور اس کے بعد ایک مختصر تفصیل بھی گزارش کروں گا۔

اما حسین کی پوری زندگی ابتداء تا انتہاء، آغاز تا انجام
 کرم کی زندگی ہے اور سراپا کرم ہے کہ در اسید الشہداء ابتدا دیکھئے تو کرم، انتہا دیکھئے تو
 کرم۔ دو جگہ تو سب کی یادیں اور پیرچھ جاتا ہے کہ جب ابتداء میں دنیا میں قدم رکھا تو
 حسین اکرم زمین والوں پر نہ دیکھا آسمان والوں پر دیکھا۔ وہ دو قوس سے عتاب میں مبتلا

جو جو میرے لیے بڑا تھا جبکہ ہمارے حسین کے پاس آگیا تو عتاب الہی بظرف ہو گیا۔ سب جو راز کر کے چلاؤ آؤ اور تباہی من و بشری آنا غیبی الحقیق ارے میرے جیسا کہ ہو گا، میں حسینؑ کا آزاد کیا ہوا ہوں۔ یہ ولادت کے موقع برحق کا کرم ہے۔ دنیا میں آئے تو پہلا کرم آسمان والوں پر کیا اور جب جانے لگے تو حر کو علیہ السلام بنا کے گئے۔ وہ ولادت کے بعد کا کرم تھا یہ شہادت کے پہلے کا کرم ہے اور شہادت کے بعد کا کرم اگر دیکھنا ہے تو حسینؑ نے ارض کر بلا کو خرید کے جب واپس کیا ہے تو فرمایا جتنے میرے زیارت کرنے والے آتے رہیں دیکھو ان کی یہاں فواریں میں فرق نہ آنے پائے، سامنے دسترخوان پر بٹھا کے کھلا دینا یہ دنیا کے کہیوں کا کام ہے، قیامت تک کے انسانوں کا انتظام کر دینا یہ کرم حسینؑ ابن علیؑ کا کمال ہے۔ صلوات

اور یہ وہ کرم سید الشہداء تھا جس کو دوست نہیں دشمن بھی پہچانتا تھا۔ لپٹے نہیں اغیار بھی اس کرم کو پہچانتے تھے۔ اس گمراہی میں ایک پورا سلسلہ کرم ہے اور حسینؑ کی زندگی سراپا کرم ہے جس کا تاریخی واقعہ دو لفظوں میں اپنے عزیز بچوں اور نوجوانوں کے لئے گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ شام کے حاکم نے ہر ایک کے کردار کا امتحان لینے کے لئے اور ہر ایک کی اوقات کو واضح کرنے کے لئے اس کا جو مقصد رہا ہو ذاتی مقاصد سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں واقعہ کا ایک پہلو عرض کرنا چاہتا ہوں۔ حاکم شام نے اس دور کی جو عظیم ترین شخصیتیں بھی جانتی تھیں سب کے پاس تھے بیٹھے، بدیہ بھی بظاہر کرنے کے لئے کمر بستہ تھیں۔ میرے قبضے میں اگر مال دنیا ہے تو میں کسی کو اس بیت المال کے مال سے محروم نہیں رکھنا چاہتا۔ جو بڑا انسان ہے، جو بڑی شخصیت ہے، جو بھی کسی بڑے باپ کا بیٹا ہے اس پر یہ مہربانی کی جائے تاکہ یہ اندازہ ہو جائے یہ سب تو بڑے بڑے ہیں میں کتنا بڑا ہوں جو ان سب مہربانی کر رہا ہوں، جو ان سب کے مقابلے میں اپنے کرم کا مظاہرہ کر رہا ہوں اس لئے سب کے پاس کچھ نہ کچھ بھیجنا تاریخ کو بھی بیان کرتی ہے، واقعہ کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا اور نہ اس کی واقعیت کے بارے میں گفتگو کرنے کا کوئی وقت ہے بس روایت کا فقرہ آپ

ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ بدیہ، تحفہ اور مال بھیج دیا۔ ان افراد میں جن کے پاس مال نہ تھا ان میں سے ایک امام حسینؑ بھی تھے۔ روایت کہتی ہے جہاں ہر بڑے باپ کے پاس کچھ نہ کچھ مال دنیا بھیجا وہاں کچھ بدیہ یا تحفہ یا مال دنیا امام حسینؑ کے پاس بھیجا ہر ایک کو حیرت ہے ان کے گھر اگر بھیجا تو بات سمجھ میں آتی ہے اسی سلسلے کے وہی اس سلسلے کے آپ۔

گرا ان کا، وہی گھرا ان کا۔ وہی مزاج ان کا، وہی مزاج آپ کا۔ مگر ان سے تو کہیں بھی آپ سے کوئی رابطہ نہیں ہے ان سے تو کوئی تعلق نہیں ہے ان کے گھر کیوں بھیج دیا؟ کیا میں صرف اس لئے بھیج رہا ہوں کہ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ پہچانو کہ جن کے جن کے گھر مال جا رہا ہے ان کا طریقہ کار کیا ہے۔ مال پانے کے بعد کیا کرے گا اور مجھے پہچانو کہ میں شہیدوں کو کتنا پہچانتا ہوں کتنے مقاصد ہیں اس چار پیسے کے اندر۔ اپنے کرم کا مظاہرہ بھی ہو جائے، اپنی معرفت اور مردم شناسی کا مظاہرہ بھی ہو جائے۔ اس لئے کہ میں ایک ایک کے بارے میں جانتا ہوں کہ کس کو پیسہ مل جائے تو کیا کرے گا۔ لہذا ہر ایک کے بارے میں پیسہ بھیجتے ہوئے، بدیہ بھیجتے ہوئے تبصرہ بھی کر دیتا کہ لوگ جائیں اور اس کے بعد اندازہ کریں کہ میں کتنا مردم شناس ہوں، کتنا لوگوں کے مزاج کو پہچانتا ہوں کہ جیسا میں نے کہا تھا سب دیے ہی تھے جیسا میں نے کہا تھا اب ہر ایک کے واسطے بدیہ بھیج دیا اور ہر ایک کے کردار کا تبصرہ کیا تو تاریخ کا یہ فقرہ ہے کہ لوگ منتظر ہیں کہ وہ حسینؑ کے بارے میں کیا کہتے ہیں تو حاکم شام نے کہا اَمَّا الْحُسَيْنُ فَيَضْرِبُهُ عَلَى الْكَنَامِ مَنْ قَتَلَ مَعَ آبَيْهِ فِي الْقَفِينِ میں جانتا ہوں کہ اگر حسینؑ کے ہاتھ میں مال آگیا تو پہلے تیروں پر صرف کریں گے۔ تو یہ کریں۔ اگر حسینؑ کے ہاتھ میں کوئی مال آجائے تو پہلے جو مارا وہاں مرنے والے ہیں، شہید ہونے والے ہیں ان کے تیروں پر صرف کریں گے۔ لوگوں سے کہا آپ کو کیسے معلوم ہو گیا؟ کہا جاؤ دیکھو کہ کتنے کیا ہیں۔ تو تاریخ کو بھی بیان کرتی ہے مال بھی بھیج دیا اور اپنے جاسوس بھی بھیج دیئے تو لوگوں نے دیکھا کہ جیسے ہی مالی قبضہ میں آیا وہی اعلان کر دیا جو راہ خدا کے شہیدوں کے، جو راہ خدا کے مجاہدوں کے تہم

jabir.abbas@yahoo.com

ہیں انھیں بلایا جائے اور یہ مال ان میں تقسیم کر دیا جائے۔ اب پلٹ کے لوگ آئے اور کہا حضور آپ علی بن ابی طالب کے انصاف سے متاثر ہو کر جو آپ نے فرمایا تھا واقف و سادہ ہو جائے۔ اپنے واسطے کھانے کا انتظام کیا نہ اپنے لئے کپڑے کا انتظام کیا، نہ اپنے گھر والوں کو دیا نہ اپنے چاہنے والوں کو دیا، نہ حاشیہ نشینوں کو دیا نہ کوئی جماعت منسلک کا انتظام کیا بلکہ جو ایام تھے ان پر تقسیم کر دیا یعنی جیسا آپ نے کہا تھا دیا ہو گیا تو ان کا کام نے نہایت ہی غور کے ساتھ کیا تم نہیں پہچانتے جو قریش کو میں پہچانتا ہوں۔ تم اس گھر لے کر نہیں جاتے ہو اس گھر لے کر صفتوں کو میں پہچانتا ہوں۔ ایک مرتبہ یہ بات بیٹے کے بارے میں تھی۔ اور خود حاکم شام نے حوالہ دیا کہ میں جانتا ہوں جو صفین میں مارے گئے ان شہیدوں کے پیو بصرہ کی طرف کیا جائے گا یعنی جب ان شہیدوں کے پیو سامنے آئے تو حسین کے کردار کا اقرار دیکھنے میں آیا۔ اور جب صفین کا معرکہ ہو رہا تھا تو ان کے باپ کا کردار دیکھنے میں آیا۔ کہا دیکھو اگر علی کا قبضہ دریا پر ہو گیا ہے تو پریشان نہ ہونا، علی کسی پیارے پر پانی بند نہ کریں گے۔ صلوات

لیکن ممکن تھا کہ کوئی انسان سوچا کہ بالآخر جس پر صفت کیا گیا ہے وہ راہ خدا کے مجاہدین کی اولاد ہیں، راہ خدا میں شہید ہو جانے والوں کی اولاد ہیں۔ نہیں اس سے بالاتر جہاں کوئی شہر، کوئی وہم نہ ہو سکے کہ شائد ان سے کوئی رابطہ اور کوئی تعلق ہوگا۔ اس امر میں زید کی شخصیت تاریخ میں جانی پہچانی ہے اور ان کے شرف کے واسطے اتنا ہی کافی ہے کہ حضور سرور کائنات نے اپنے آخری دور حیات میں جب لشکر تیار کیا تو فرمایا جھنڈا جیشِ اسلام کا یعنی اب یہ آخری لشکر جو جانے والا ہے میری زندگی میں، سردار لشکر اسامہ ہوں گے۔ حالانکہ اسامہ کوئی سینئر آدمی نہیں تھے۔ میں نے یہ لفظ قصداً استعمال کیلئے معنی آپ سمجھیں گے۔ اسلامی تاریخ میں اسامہ کوئی سینئر شخصیت نہیں تھے نہ جوان آدمی تھے اور حضور نے ایک لشکر تیار کیا اور فرمایا کہ اس لشکر کے سردار اسامہ ہوں گے۔ جب حضور نے یہ اعلان کر دیا تو لوگوں نے آگے حضور کو سمجھا نا شروع کیا۔ حضور یہ تو ابھی نہ جوان ہیں، جوان ہیں، ہمارے سامنے کے بچے ہیں۔ ذرا ہماری شخصیتیں

دیکھئے ہماری بزرگی دیکھئے ہماری سینئرٹی دیکھئے۔ ہم ہوں گے لشکر کی فوجی اور یہ بچہ سارا حضور پر کیا کر رہے ہیں، یہ کیا انتظام فرمایا حضور نے فرمایا کوئی بات نہیں ہے اسامہ بھی اہل خانہ ہوئے ہیں تم بھی پہچانے ہوئے ہو۔ کل جب میں نے ان کے باپ کو سردار بنایا تھا تو ان کے باپ کی سرداری تم سے قبول نہیں ہو رہی تھی آج بیٹے کو بنایا ہے تو وہ برداشت کر رہا ہے، حضور یہ کہہ کے چلے گئے لیکن ہمیں امت کا مراجع معلوم ہو گیا کہ جسے حضور

پہچانتے تھے اسے امت برداشت نہ کرے گی۔ صلوات
یہ پیغمبر کے بعد کا واقعہ نہیں ہے، پیغمبر کے بعد اگر لوگ برداشت نہ کرتے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا، ابھی تو حضور زندہ ہیں، سامنے موجود ہیں اور انھیں کو سمجھا یا جا رہا ہے، انھیں کو مشورہ دیا جا رہا ہے یہ نہیں وہ۔ وہ نہیں یہ۔ لیکن بہر حال سرکارِ دو عالم کی نگاہ میں اسامہ کی واقف ایک شخصیت تھی اور اس سے بڑی شخصیت کیا کہ جتنی شخصیتیں میں نے جی اور اسامہ سردار لشکر۔ اس سے بڑی اور شخصیت کیا ہو سکتی ہے۔ حضور سرور کائنات کے بعد ایک طوفان امت اسلامیہ میں آیا، ایک سیلاب دولت کا اقتدار کا آیا۔ تو کہتے ہیں کہ وہ کتنے کردار کتنی شخصیتیں اسی سیلاب میں بہہ گئیں۔ کچھ وہ تھے جو اختلاف کی نذر ہو گئے کچھ وہ تھے جو فکر کی نذر ہو گئے۔ ابھی یہ سوچ ہی رہے ہیں کہ بیعت کی جائے یا نہ کی جائے کل یہ اعلان کر کے گئے ہیں جس کا میں مولانا ہوں اس کا یہ علیؑ بولا ہے، اور وہ ابھی سوچ رہے ہیں کہ دستِ علیؑ پر بیعت کر کے ان مشکلات کا سامنا کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اقتدار کی طاقت مولیٰ کی جائے یا نہ کی جائے۔ بہر حال اسامہ انھیں حالات سے گزر رہے تھے۔ زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ یہاں تک کہ اسامہ کا وقت آخر آ گیا، فرزندِ رسولؐ ان کے امام حسینؑ اسامہ بن زید کی عیادت کے لئے آئے۔ دیکھا پریشان ہیں، چہرے کا رنگ اٹھ رہا ہے، حالات خراب ہیں۔ ظاہر ہے کہ مرض الموت سے دنیا سے جانا چاہتے ہیں۔ شائد ایسے وقت میں جو حال بیمار کا ہوتا ہے یہی کیفیت اسامہ کی بھی ہے۔ فرمایا اسامہ میں تمھیں کچھ زیادہ ہی پریشان دیکھ رہا ہوں؟ کہا ہاں فرزندِ رسولؐ، میں کچھ گیا کہ اب مجھے اس دنیا سے ہٹا دینا نہیں ہے، میرے جانے کا وقت قریب آ گیا ہے مگر سوچ رہا ہوں کہ میرے ذمہ

ایک قرض ہے اگر وہ قرض ادا نہ ہو سکا اور میں چلا گیا تو میرے گھر میں تو کوئی ایسا نہیں ہے جو قرض کو ادا کر دے۔ مجھے قیامت میں اس قرض کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔ فرمایا کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے میں تمہارے قرض کا ذمہ دار ہوں۔ تم دنیا سے ملنے ہو کے جاؤ حسین تمہارے قرض کی ادائیگی کا ذمہ دار ہے۔ کتنا قرض ہے؟ کہا فرزند رسول! میرے ذمہ ساٹھ ہزار درہم کا قرض ہے۔ امام حسین نے بیٹھے بیٹھے اسامہ کے سامنے حکم دیا جاؤ اور گھر سے ساٹھ ہزار درہم لے کر جن کے بارے میں یہ بتا رہے ہیں اس قرض کو ادا کرو۔ تاکہ یہ اپنے کاؤں سے سن لیں کہ ان کا قرض ادا ہو گیا ہے اور مطمئن ہو سکے دنیا سے جائیں۔ یہ امام حسین کا برتاؤ ان کے ساتھ ہے جن کا برتاؤ مولائے کائنات کیساتھ پیغمبر اسلام کے انتقال کے بعد یہ تھا کہ سوچتے ہی رہ گئے کہ علی کا ساتھ دیا جائے یا نہ دیا جائے۔ یہ نفع میں اس لئے گزارش کر رہا ہوں کہ اسامہ کی توہین نہیں کرنا چاہتا مگر یہ چاہتا ہوں کہ کردار حسین پر پجاریں۔ حسین نے یہ بیعت علی کی کوئی قیمت نہیں دی ہے۔ اگر سلمان و ابوذر کو دیا ہوتا تو شاید کوئی نالائق یہ سوچ لیتا کہ چونکہ ساتھ دیا تھا لہذا ان کا قرض تو ادا کرنا ہی تھا۔ نہیں یہ کرم آل محمد ہے اور حسین بھی بیچونا نا چاہتے ہیں کہ تم نے ساتھ نہ دیا وہ تمہارا کردار تھا ہم نے قرض ادا کر دیا یہ ہمارا کردار ہے۔ صلوات

تاریخ میں پیشمار واقعات میں فرزند رسول (عقلمیں) کے کرم کے، مگر میں ساری باتیں نہیں گزارش کروں گا۔ صرف ایک واقعہ قدرے تفصیل کے ساتھ گزارش کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ اس میں بہت سائے معلومات ہیں۔ میرے عزیز بچوں اور نوجوانوں کے لئے معلومات کا ایک ذخیرہ اس پھوٹے سے واقعہ میں ہے اس لئے میں اس واقعہ کو ابتداء سے انتہا تک گزارش کر کے ایک پانچ سات منٹ میں بیان کر آخری منزل تک لانا چاہتا ہوں۔

فرزند رسول (عقلمیں) امام حسین کی خدمت میں ایک مرد اعرابی آیا بظاہر دیکھنے میں ایک عام آدمی ہے مگر پروردگار عالم نے کیا انتظام کیا ہے کہ حسین کے اظہار و اعلان کے لئے میں نہیں جانتا۔ واقعہ اس انداز سے نقل کیا گیا ہے کہ ایک اعرابی ایک دیہاتی

انسان امام حسین کی خدمت میں آیا اور اس نے آگے کہا فرزند رسول! مجھے آپ سے کچھ سوال کرنا ہے۔ کچھ مانگنے کے لئے آیا ہوں مگر میرے سوال سے پہلے آپ مجھ سے سوال کریں کہ دنیا میں اتنے سختی پڑے ہوئے تھے سب کو چھوڑ کے آپ کے پاس کیوں آیا ہوں ایک ایک لفظ واقعہ کا قابل توہر ہے۔ کہیں تو جو کچھ مانگئے آیا ہوں وہ تو آپ سے مانگوں گا۔ کس سوال کرنے کے لئے آیا ہوں؟ لیکن میں نے سب کو چھوڑ کے آپ سے کیوں مانگا۔ اگر آپ مجھ سے دریافت کرنا چاہیں اور اگر نہ بھی دریافت کرنا چاہیں تو میں بتانا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے پاس کیوں آیا، کسی اور کے پاس کیوں نہیں گیا فرمایا کیا آئے میرے پاس، کیوں کسی کے پاس نہیں گئے؟ کہا اس لئے کہ آپ کے جد بزرگوار نے فرمایا ہے کہ اگر کبھی سوال کرنے کی نوبت آجائے، کبھی مانگنے کا وقت آجائے تو خبردار ہوشیار!۔ چار طرح کے آدمیوں سے مانگنا اور کسی سے نہ مانگنا اگر خدا کرے کسی آدمی پر وقت پڑ جائے اور ہاتھ پھیلائے کا وقت آجائے، سوال کرنے کی نوبت آجائے تو سرکارِ دو عالم فرما کے گئے ہیں کہ چار طریقے کے لوگوں سے سوال کرنا اس کے علاوہ اور کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاتا آپ کے جد بزرگوار نے فرمایا ہے اگر عرب میں کسی سے سوال کرنا ہے تو اس سے کرنا جو عربی شریف ہو۔ اور اگر باہر کسی سے سوال کرنا ہے تو اس سے کرنا جو مولائے کرم ہو۔ یا اگر کسی سے مانگنا ہے تو اس سے مانگنا جو حاملِ قرآن ہو۔ اور اگر کوئی کمال کسی کے پاس نہ ہو تو اس سے مانگنا جس کو اللہ نے چہرے میں صباحت و وجاہت دی ہو۔ تو چونکہ سرکارِ دو عالم نے فرمایا ہے کہ سوال چار میں سے کسی ایک سے ہوگا یا عربی شریف سے ہوگا، یا مولائے کرم سے ہوگا، یا حاملِ قرآن سے ہوگا، یا اس سے ہوگا جو چہرے میں صباحت و وجاہت رکھتا ہو۔ تو میں نے چاروں طرف دیکھا۔ کوئی ایسا نظر آیا تو دیا نہیں تھا۔ کوئی ایسا دکھائی دیا تو دیا نہیں تھا۔ لیکن جب میں نے آپ کو دیکھا تو آپ عربی شریف بھی ہیں۔ آپ مولائے کرم بھی ہیں۔ آپ حاملِ قرآن بھی ہیں۔ آپ مردِ وجہ بھی ہیں۔ صلوات

چونکہ پروردگار عالم نے چاروں کمالات آپ کی ہستی میں جمع کر دیئے ہیں عربیوں

jabir.abbas@yahoo.com

میں کون آپ کے جیسا شریف ہو گا اس لئے پروردگار عالم نے سارے قبائل میں جس قبیلے کا انتخاب کیا ہے ان بنی ہاشم میں منتخب روزگار آپ کی شخصیت ہے۔ اگر مولائے کرم کو دیکھنا ہے تو نہ مولانا آپ کے علاوہ کوئی ہے نہ کرم آپ جی کوئی ہے۔ اگر حامل قرآن کو دیکھنا ہے تو قرآن آپ کے جدر نازل ہوا ہے، آپ کے گھریں نازل ہوئے۔ آپ کے علاوہ حامل قرآن کون ہو گا۔ آپ ہی کے بارے میں پیغمبر کہہ گئے ہیں انی تارث فیکم الثقلین آپ کو ہمسفر قرآن بنایا گیا ہے۔ اور اگر صاحت کو دیکھنا ہے تو آپ سے زیادہ پیغمبر سے مشابہ کون ہو گا اور پیغمبر سے زیادہ وجہ کون ہو گا۔ تو چونکہ چاروں کمالات آپ میں جمع ہو گئے ہیں لہذا میں نے آپ کے سامنے ہاتھ پھیلاتا گوارا ہے در نہ کسی اور سے مانگنا میری غیرت کے خلاف ہے۔ یہ تو مردِ اعزازی کا بیان ہے۔ اب روایت کا دوسرا رخ دیکھئے، فرمایا جب تم نے اس لئے مجھ سے مانگے کہ میرے جدر کو اس نے فرمایا ہے تو میرے جدر کو اس نے دونوں باتیں فرمائی ہیں مانگنے والے کو بھی سمجھا یا ہے اور دینے والے کو بھی سمجھا یا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس روایت کے ایک ایک لفظ پر آپ توجہ کریں۔ یہ کام کتنے والی چیزیں ہیں اس لئے کہ یہ وہ باتیں ہیں جن کا تعلق تنہا ایک شخصیت سے نہیں ہے۔ یہ کردار ہے جو قیامت تک کام آنے والا ہے۔ فرمایا میرے جدر کو اس نے مانگنے والے کو یہ سکھایا ہے کہ جب مانگنا تو ایسے سے مانگنا جس میں یہ کمالات ہوں۔ اور دینے والے کو یہ سمجھایا ہے کہ المعروف بقدر المعرفة جب کسی کو عطا کرنا، جب کسی کو کھربنا تو نیکی کرنے سے پہلے اس کی معرفت کو دیکھ لینا۔ جتنا صاحب معرفت ہوتا ہے وہی نیکی اس کے ساتھ کرنا، جتنی معرفت ہوتا ہے اتنا ہی تمہارا معروف اور نیکی ہونی چاہئے۔ وہ فرمایا تھا مانگنے والے سے اور یہ فرمایا ہے عطا کرنے والے سے۔ لہذا میں بھی اس وقت تک تم کو نہیں دے سکتا جب تک تمہاری معرفت کا امتحان نہ ہو جائے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو ہمارے اور آپ کے کام آنے والا ہے۔ خالی یہی نہیں کہ ہاتھ پھیلا دیا سارے کرم کا مظاہرہ ہو گیا اور جو بیچارہ صاحب ایمان، صاحب کردار، صاحب معرفت ہے،

جانتے ہیں کہ فقیر ہے مگر چونکہ اپنے نفس کی تسکین نہیں ہونے والی ہے اس لئے اس پر مہربانی کرنے والا کوئی نہیں ملتا۔ ہم جانتے ہیں وہ یتیم ہے، وہ بیوہ ہے، وہ غریب ہے، وہ مسکین ہے، وہ مفلح ہے مگر اسے کچھ دینے کا ارادہ نہیں کرتے کیوں؟ اس لئے کہ وہ ہمارے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا مگر جو ہاتھ پھیلا دے گا تو اسے چار پیسے دے کے اور غرور کا احساس پیدا ہو گا۔ وہ مانگنے والا ہم دینے والے۔ مگر جس نے نہیں مانگا اسے کون دے گا۔ لہذا امام حسینؑ نے پیغمبر اسلامؐ کا یہ فقرہ یاد دلایا اور چاہا کہ تاریخ میں نہایت محفوظ رہ جائے کہ سلسلہ تمہاری انا کا نہیں ہے، مسئلہ تمہارے غرور کا نہیں ہے۔ اس کی معرفت کو دیکھو، اس کی معرفت استحقاق پیدا کرتی ہے لہذا تمہیں دینا چاہئے۔ فرمایا میرے پاس یہ مال ہے۔ میرے پاس یہ مال دینا ہے خالی ہاتھ نہیں ہوں اور میں تمہیں دوں گا۔ لیکن جیسے تم نے پیغمبر کے بیان کا حوالہ دیا میں نے بھی پیغمبر کے ارشاد کا حوالہ دیا۔ اب میں تم سے تین سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے ایک سوال کا جواب صحیح دیا تو ایک تہائی مال یعنی اس میں اگر تین سو درہم مثلاً آج کی زبان میں ہیں تو اگر ایک سوال کا جواب صحیح دیا تو ایک سو، اگر دو کا جواب صحیح دیا تو دو سو، اگر تین سوالات کے جوابات صحیح دیے تو سارا مال تمہارا ہو گا۔ المعروف بقدر المعرفة۔ میں تمہاری معرفت کو اگر مانا چاہتا ہوں جتنی تمہاری معرفت اتنا میرا معروف۔ اتنا میرا کار خیر۔ وہ مطمئن ہو گیا، تیار ہو گیا۔ کہا پوچھئے سوال کیجئے۔ امامؑ نے پہلا سوال کیا اتی العمل افضل تناؤ سب سے بہتر عمل کیا ہے؟ اتنا سخت امتحان اور امتحان تو یوں بھی سخت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مشہور ہے کہ امتحان کا فیصلہ امتحان لینے والے پر ہوتا ہے اسے اگر پاس کرنا ہو گا تو کھڑے سچا جواب بالکل صحیح ہے۔ اور اگر پاس نہیں کرنا ہو گا تو کچھ گائی نہیں بلکہ وہ۔ لیکن یہاں تو ایسا کوئی خطہ نہیں ہے۔ یہاں تو سارا مسئلہ یہ ہے کہ درمیان میں پیغمبر اسلامؐ آگئے ہیں۔ سوال کے آداب پیغمبر نے بتائے، عطا کرنے کے آداب پیغمبر نے بتائے۔ اب جو سوالات امام حسینؑ نے کئے ہیں اس کے جوابات پیغمبر پہلے سے محفوظ کر کے رکھے ہیں۔ لہذا کسی

jabir.abbas@yahoo.com

انسان کو یہ خطرہ نہیں ہے کہ میں کچھ اور کہوں گا وہ کچھ اور فرمادیں گے۔ نہیں۔ فرمایا
ای العمل افضل سب سے بہتر عمل کون سا ہے۔ اس نے کہا الايمان بالله واليوم
اليمان لانے سے بہتر کوئی عمل نہیں ہے۔ فرمایا پاس۔ ایک تہائی مال کے تم خدا رہو گے۔
فرمایا حضور دوسرا سوال؟ فرمایا یہ بتاؤ ہلاکت سے بچنے کا ذریعہ کیا ہے۔
وہ ایمان ہو گیا جو بہترین عمل ہے وہ ہم نے کر لیا۔ اگر کوئی آخرت میں ہلاکت
سے بچنا چاہتا ہے تو اس کا ذریعہ کیا ہوگا؟ اس نے کہا بالحقۃ باللہ خدا پر بھروسہ رکھو
جب کرم پروردگار میں شک پیدا ہو جائے گا تو نجات کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔
اسی لئے بعض روایات میں میں نے یہ فقرہ دیکھا کہ اگر کوئی انسان اپنے گناہ کے
بارے میں سوچ لے کہ میرا گناہ معاف نہیں ہو سکتا ہے تو وہ کافر ہے مسلمان نہیں ہے۔ تو
کہ تو بہر گناہ قابل معافی ہے۔ فرمایا کہ اگر کوئی اپنے گناہ کے بارے میں سوچ لے کہ
میرا گناہ معاف نہیں کیا جاسکتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے گناہ کو خدا کے کرم سے یا
بڑا سمجھتا ہے اور جو گناہ کہ کرم خدا سے بڑا سمجھتا ہو وہ مسلمان کہے جانے کے لائق نہیں ہیں۔
تو اس نے کہا حضور بہترین ذریعہ بہترین وسیلہ نجات کا ہلاکت سے، روز قیامت کی
مصیبت سے خدا کے کرم پر بھروسہ رکھنا، خدا کے کرم پر اعتبار رکھنا ہے۔
اس سے اچھا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ فرمایا کامیاب۔ دوسرا سوال اور دونوں میں کامیاب
یعنی دو تہائی کا حقدار ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا تیسرا سوال باقی رہ گیا۔ اور
وہ یہ ہے کہ انسان کے کردار کی زینت کیا ہے کس انسان کے کردار کو کہا جائے کہ یہ کردار
آراستہ ہے، بہترین ہے، حسین ہے، جمیل ہے، خوبصورت ہے۔ کردار کی زندگی میں زینت
کیا ہے، زینت کردار کو رونق زندگی کیا ہے۔ تو اس نے کہا۔
مَعَهُ جِلْدٌ۔ زینت کردار انسانی یہ ہے کہ اگر علم ہو تو علم کے ساتھ علم بھی ہو علم کے
بالے میں میں آئندہ مجالس میں گزارش کروں گا لیکن ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ دیکھئے
نہیں جانتا ہے اس کے لئے برداشت کرنا بہت آسان ہے۔
جو نہیں جانتا ہے، ناواقف ہے اس کے لئے برداشت کرنا بہت آسان

ہے۔ ہم آپ کو برداشت کر رہے ہیں آپ ہم کو برداشت کریں۔
اس لئے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ آپ بیٹھے ہیں تو آپ کے دل میں کیا ہے۔ آپ نہیں
معلوم کہ ہم پڑھ رہے ہیں تو آپ کے بارے میں ہم کیا سوچ رہے ہیں۔ تو جہیزیں اگر
آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ خدا نخواستہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میں جو اتنی وضاحت
کر رہا ہوں تو آپ کو نا فہم سمجھتا ہوں۔ تو کیا کل آپ مجھے برداشت کریں گے؟
نہیں۔ اگر میں یہ سوچ لوں کہ آپ مجھے اس لئے برداشت کئے ہوئے ہیں کہ بہر حال
اب فرشتہ پر آکے بیٹھ گئے ہیں اٹھ تو سکے نہیں لہذا میں آپ کے لئے قابل برداشت
ہوں۔ یہ ہم آپ ایک دوسرے کو جو برداشت کرتے ہیں اس لئے کہ آپ کے دل
میں کیا ہے وہ ہم نہیں جانتے، ہمارے دل میں کیا ہے وہ آپ نہیں جانتے ہیں۔ تو
ناواقفیت میں برداشت کرنا بہت آسان ہے۔ تو جہیزیں وہ جہیزے کہ خدا نے
اپنے کو حلیم کہا۔ کہ وہ پہلا برداشت کرنے والا ہے جو ہر ایک کی نیتوں کو
جانتا ہے مگر برداشت کر رہا ہے اور یوں برداشت کر رہا ہے کہ اچھی نیت کھو گے
تو اب شے دوں گا مگر بری نیت ہوگی تو عذاب نہیں کروں گا۔ اس سے زیادہ
اور برداشت کرنا کیا ہے۔ لہذا ناواقفیت میں برداشت کرنا آسان ہے واقف
ہونے کے بعد جاننے کے بعد برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔ لہذا اس نے کہا مولایہ
نگاہ میں زینت کردار اور آرائش کردار انسانی یہ ہے کہ اگر علم ہو تو علم کے ساتھ علم
ہو، جانتا ہو مگر برداشت کرے عَلَّمَ مَعَهُ جِلْدٌ۔ آپ نے فرمایا اگر یہ
نہ ہو تو۔ ہاں اب تک تو ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا اب سوال در سوال ہو گیا۔
اس نے کہا عَلَّمَ مَعَهُ جِلْدٌ علم جس کے ساتھ علم ہو۔ فرمایا نہ ہو کسی کے
پاس تو کیا کرے، کہا مَا مَانَ مَعَهُ كَرَّمَ تَوَاكُلَ علم والا نہیں ہے پیسے والا ہے
تو جب مال ہو تو اس کے ساتھ کرم بھی ہو۔ یعنی مال زینت دنیا نہیں ہے کرم زینت دنیا
ہے۔ تو علم کی زینت ہے علم، اور مال کی زینت ہے کرم فرمایا اگر مال بھی نہ ہو۔
اگر علم ہے تو اس کی زینت یہ ہے کہ علم ہو، اگر علم نہیں۔ بیہ مال ہے تو

کیا دے گا۔ کہا اگر ان کا کرم یہ ہے تو جو ان کی معرفت میں کامل نکل آئے، اسے جو ان کے پاس ہے وہ دے دیں تو جو میرے سامنے امتحان معرفت میں کامل ہوں گے میں دنیا بھی ان کے قدموں میں ڈال دوں گا اور آخرت بھی ان کے قدموں میں ڈال دوں گا۔ یہاں رہیں گے تو خزانہ دنیا کے مالک وہاں جائیں گے تو الحسن والحسين سيدا شباب اهل الجنة۔ صلوات

بس عزیزان محترم، یہ تھا کرم سید الشہداء اور اس کے بعد جس کی طرف میں نے آغاز گفتگو میں اشارہ کیا تھا۔ امام حسینؑ کا کرم امام حسینؑ کی زندگی کے بعد بھی رہا اگر زندگی کے بعد آج بھی کرم سید الشہداء کو دیکھنا چاہتے ہیں تو کرم کی کوئی کمی نہیں ہے حسینؑ کے احسانات کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اور جیسے کل یہ دربار عام تھا ہر انسان کے لئے، اپنا ہو، برابرا ہو، بیگانہ ہو، بیگانہ ہو، جیسے کل کرم حسینؑ عام تھا دنیا کے لئے، آج بھی عام ہے۔ موقع نہیں رہ گیا وہ دن میں گزارش کرنا کہ جیسے قرآن مجید نے حج بیت اللہ کا تاروت کرتے ہوئے خاندانِ خدا کی عظمت کا اعلان کیا تھا کہ یہ خاندانِ خدا مبارک ہے عالمین کے لئے۔ اس کا فائدہ عالمین کے لئے ہے تنہا مومنین کے لئے نہیں ہے۔ ویسے ہی فرشتے عزائے سید الشہداء یہ وہ کرم امام حسینؑ ہے جو عام ہے اپنوں کے لئے، بیرونوں کے لئے، بیگانوں کے لئے، بیگانوں کے لئے، ہم آپ کو اجر و ثواب ہی کے لئے تنہا آجاتے ہیں، ہم آپ کو عاقبت بنانے کے لئے، عاقبت سنوارنے کے لئے فرشتے عزرا پر بیٹھ جاتے ہیں، مگر فرشتے عزرا کا فیض تنہا صاحبانِ ایمان کے لئے نہیں ہے۔ کون ہے جو اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا، ایک تنہا محرم کا اہتمام اگر آپ دیکھیں، ایک تنہا عرلے حسینؑ کا اہتمام اگر آپ دیکھیں۔ تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ کون سا شعبہ حیات ہے جو ذکر حسینؑ کے فیض سے محروم ہے۔ سفر کرنے والے جب منزل سفر میں آتے ہیں تو کہتے ہیں جو اس سفر سے فائدہ اٹھاتے ہیں، گھر والے جب گھر میں رہتے ہیں تو کہتے ہیں جو ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حیرت ہے کہ کہنے کے لئے کہتے کہتے ہیں کہ فرشتے عزرا

مال کی زینت یہ ہے کہ کرم ہو۔ فرمایا اچھا یہ بتاؤ اگر مال بھی نہ ہو، تو کہا فقر مَعْلُ صَدْرُ اگر مال نہیں ہو گا فقیر ہو گا تو فقری کے ساتھ صبر ہو۔ صبر کرے، فریاد نہ کرے، شکوہ نہ کرے، ہنگامہ نہ کرے، قیامت نہ برپا کرے۔ کم سے کم یہ ہو، اس کے بعد امام نے فرمایا اچھا اگر یہ بھی نہ ہو تو کہا کہ ایسا انسان خدا رہے کہ بجلی کرے اور تباہ ہو جائے۔ اگر کوئی ایسا نالائق پیدا ہو جائے کہ نہ اس کے پاس علم ہے، نہ اس کے پاس حلم ہے، نہ اس کے پاس مال ہے، نہ اس کے پاس کرم ہے، نہ اس کے پاس فقر ہے، نہ اس کے پاس صبر ہے تو بہتر یہ ہے کہ ایک برتن گرے اور وہ جل کے راکھ ہو جائے اس لئے کہ اسے زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ روایت کہتی ہے کہ جیسے ہی اسے یہ آخری جواب دیا امام مسکرا دیے۔ یعنی وہ بیچارہ بھی سوچ رہا ہے کہ آخر یہ کون سی نالائق قسم پیدا ہو گئی ہے کہ جس کے پاس نہ علم ہے نہ مال ہے، نہ حلم ہے، نہ کرم ہے، نہ صبر ہے، تو اگر ایسا انسان مر جائے تو مر جانا ہی بہتر ہے۔ بس جیسے ہی اس نے یہ فقرہ کہا ویسے ہی امام مسکرا دیے اور تسلی اٹھا کر اس کے حوالہ کر دی۔ کہا چونکہ تم امتحان میں کامیاب ہو گئے اور میرے بدلے فرمایا ہے کہ جتنی معرفت ہو اتنا ہی حق ہے۔ تو سب لے جاؤ کہ تم معرفت میں کامیاب ثابت ہوئے۔ صلوات

بس عزیزو واقعہ تمام ہو گیا۔ اب ایک جملہ کہنا چاہتا ہوں کہ سرکار نے فرمایا جتنی معرفت ہو اتنا ہی کا خیر کیا جائے، اتنا ہی کرم کیا جائے۔ تو مولائے، امام حسینؑ نے تو کر کے دکھلا دیا، وہ امتحان معرفت میں کامیاب ہو گیا۔ تو جتنا مال تھا سب دے دیا۔ ایک آخری لفظ ہے عزیزو اور شاید یہ آپ کو یاد رہ جائے۔ وہ امتحان معرفت میں کامیاب ہو گیا تو مولائے کے پاس جو تھا وہ سب دے دیا۔ اسے پروردگار پر تو تیرا بندہ ہے۔ بندے نے جب دیکھا کہ امتحان معرفت میں کوئی کامیاب ہو گیا تو جو بندے کے پاس تھا سب دے دیا۔ اسے مالک وہ بندے جو صاحبانِ معرفت ایسے ہیں کہ کامل معرفت بھی رکھتے ہیں اور ساری دنیا کو انھوں نے پہنچوایا ہے، تجھے پہنچانا انھیں کے ذریعہ سے۔ نبی کو پہنچانا انھیں کے ذریعہ سے۔ تو انھیں

jabir.abbas@yahoo.com

وہ بُرائی پائی جاتی ہے۔ کہنے کو سب کہہ دیا کرتے ہیں مگر جب فرشتہ عرا کے فیض سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو سب آگے آجاتے ہیں۔ چونکہ یہاں کے موضوعات میں یہ بات شامل نہیں ہے۔ لہذا ان مسائل کو یہاں نہیں پھیڑنا چاہتا۔ ورنہ میں نے تجربہ کیا ہے۔ جن پر بدعتوں کا بھوت سوار رہتا ہے وہ بھی تبرک کے لئے مٹھائیاں بنا کر بیچ لیتے ہیں، وہ بھی تبرک کا سامان بنا کر فروخت کر دیتے ہیں، کوئی یہ نہیں کہتا کہ تم کس کام کے لئے خرید رہے ہو۔ اگر بدعتوں کے لئے لیا جا رہے ہو تو تمہارے ہاتھ نہ بچیں گے یعنی چولہے ہیں وہ تو فائدہ اٹھا ہی رہے ہیں۔ جو غیر ہیں وہ بھی فیض حین سے اب تک محروم نہیں ہیں۔ کون ایسا ہے جو عرائس حین کے فیض سے محروم ہو۔ یہ فیض عام ہے۔ کل بھی عام تھا اور آج بھی عام ہے۔ جب ہر ایک کے لئے حین کا کرم عام ہے تو جو چاہنے والے ہیں ان کے ساتھ حین کی مہربانیوں کا ایک مخصوص امتیاز ہوگا۔ ماہِ محرم کی دوسری تاریخ تھی جب فرزند رسول انقلین وارد سرزمین کر بلا ہوئے۔ کس شان سے یہ قافلہ زمین کر بلا پر وارد ہوا۔ خاک کر بلا پر قدم رکھنے کے بعد امام حین نے چاہا کہ دنیا کو یہ پہنچوا دیں کہ ہم انہیں یہاں آگے ہیں، ہم دھوکے میں اس زمین پر نہیں آگے ہیں یا ایک عہد الہی ہے جس کو ادا کرنے کے لئے آئے ہیں، ایک وعدہ مطلق ہے جس کو ادا کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ہم اپنے سفر کے آغاز کو بھی پہچانتے ہیں، ہم اپنے سفر کے انجام کو بھی جانتے ہیں۔ اگر تم نہیں جانتے تو پہچان لو میرے علم کو، دیکھو کہ میں اس منزل تک کیوں آیا ہوں، ہے کوئی جو اس زمین کا نام جانتا ہو۔ لوگوں نے کہا ہاں ہاں اس علاقہ کے رہنے والے پرانے بوڑھے بزرگ ہیں وہ جانتے ہیں۔ فرمایا اس زمین کو کیا کہتے ہیں، کہا غاصریہ کہا جاتا ہے۔ فرمایا اور کوئی نام ہے؟ کہا اس کو نینوا بھی کہا جاتا ہے۔ کہا اس کا اور کوئی نام ہے؟ کہا اسے شطِ خرات بھی کہا جاتا ہے۔ کہا اور اس کا کوئی نام ہے؟ کہا ہاں اس کو کربلا بھی کہا جاتا ہے۔ یہ فرزند رسول بار بار کیوں پوچھتے جا رہے ہیں کیا اس زمین کا کوئی اور نام ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ حین زمین کو پہچانتے ہیں، خاک کو پہچانتے ہیں۔ دنیا کو پہنچونا چاہتے ہیں۔

ایک یہاں نہیں آگے ہیں، ایک عہد الہی ہے جس کو یہاں پورا کرنے کے لئے آئے ہیں۔ جیسے ہی کہنے والے نے کہا یقال لہا کربلا اس زمین کو کر بلا کہا جاتا ہے۔ بس عزیز و چند فقرے مجلس تمام ہو رہی ہے۔ جیسے ہی کہنے والے نے کہا اس زمین کو کر بلا کہا جاتا ہے امام نے فرمایا ہذا ارض کرب و بلا میں پہچانتا ہوں کہ کرب کی زمین ہے، یہ بلا کی زمین ہے، یہ مصیبتوں کی زمین ہے۔ اور یہ کہنے کے بعد فرمایا ہفتا مخط و کحلا اے میرے چاہنے والے انا تو سے سامان اتار لوں گی ہماری آخری منزل ہے، یہیں ہیں، یہیں ٹھہرنا ہے۔ حین اپنے مستقبل کے علم کا اعلان کرتے جا رہے ہیں۔ عزیز و روئیں گے آپ بہت روئیں گے۔ امام حین اس زمین پر آئے ہیں وعدہ مطلق کو ادا کرنے کے لئے تو بتا رہے ہیں یہاں کیا کیا ہونے والا ہے اور ہم کس مستقبل کے لئے یہاں آئے ہیں۔ ہفتا مخط و کحلا یہ وہ جگہ ہے جہاں ہمارا قافلہ ٹھہرے گا سامان اتار لیا جائے۔ اس کے بعد فرمایا ہفتا مخط و کحلا یہاں ہماری منزل ہوگی، ہفتا مخط و کحلا آؤ لڑنا یہ وہ جگہ ہے جہاں ہمارے بچے ذبح کئے جائیں گے۔ ہاں ہاں روئے والا یہ وہ جگہ ہے جہاں ہمارے بچے ذبح کئے جائیں گے۔ ہفتا مخط و کحلا یہ وہ جگہ ہے جہاں بیویوں کو قیدی بنایا جائے گا۔ کون سی مصیبت ہے جو حین کی نگاہ کے سامنے نہیں ہے۔ جب مولانا یہ مصائب بیان کرنا شروع کئے یہ رانیاں بھی سن رہی ہیں، بیبیاں بھی سن رہی ہیں۔ یہاں آگے ٹھہر گئے۔ ایک مرتبہ شہزادی زینب نے ایک مشت خاک اٹھائی۔ مٹی کو سونگھنے کے بعد زینب نے رونا شروع کیا۔ حین نے کہا، بہن زینب! روئے کا سبب کیا ہے؟ کہا بھئی اس خاک سے تو آپ کے خون کی وارہی ہے۔ کہا ہاں زینب! یہی ہماری آخری منزل ہے۔ اب اپنے انبار کو ان مراحل کے لئے کر جہاں بچے مارے جائیں گے، جہاں بیویوں کو قیدی کر دیا جائے گا حین نے زمین کر بلا کا انتخاب کیا۔ مالک نے جس زمین کے لئے کہا تھا حین نے عہد مطلق کو ادا کرنے کے لئے آگے نگر اک مرتبہ علاقہ کے لوگوں کو بلا کے کہا کہ یہاں اسے جائیں گے ہم تو یہاں ذبح کر دیئے جائیں گے، ہمارے گھر والے قیدی بنائے جائیں گے۔

جائیں گے مگر ہم یہاں لاوارث نہ رہیں گے۔ بس سن لو عزیزو دو محلے مجلس تمام ہوں ہی ہے مگر ہم لاوارث نہ رہیں گے۔ دو باتیں تم سے کہنا ہے ایک تو اس بات کا خیال رکھنا کہ میرے وارثوں کو اتنا موقع بھی نہ دیا جائے گا کہ ہماری لاشوں کو دفن کیا جائے۔ تو جب تک ہمارا کوئی وارث ہماری لاش کو دفن نہ کر دے ذرا ہماری لاشوں کا خیال رکھنا۔ اس کے بعد کہا دیکھو ہماری قبریں پڑھیں نہ وہ جائیں گی ہمارے چاہنے والے آئیں گے، ہماری مظلومیت کا ماتم کرنے والے آئیں گے۔ جب ہمارے مہمان آجائیں تو ان کا خیال رکھنا۔ اسے مولا! یہ آنے والے مہمانوں کا ذکر کیوں کر کر رہے ہیں؟ کہا اس لئے کہ میں بھی تو مہمان بلایا گیا ہوں۔ امت نے ہماری ہمان فدازی نہ کی۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے چاہنے والوں کے ساتھ یہ رتاؤ نہ ہونے پائے۔ اسے مولا! غلاموں کی جائیں قربان ہو جائیں۔ آپ نے دوسری محرم کو ان غلاموں کو یاد کیا ہے اب یہ دوسری محرم کو آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ ہائے وہ کہ بلا جہاں حسینؑ کے پتے مارے گئے، ہائے وہ کہ بلا جہاں حسینؑ کے گھر کی بیبیوں کو قیدی بنایا گیا۔ بس ایک آخری جملہ سنو امام رضاؑ نے فرمایا کہ جب چاہنے والا سامنے آئے بیٹھا کہا بھائی تمہیں معلوم ہے یہ کون سا چاند فلک پر نمودار ہوا؟ کہا ہاں ہاں مولا معلوم ہے یہ محرم کا چاند ہے۔ کہا محرم کو پہچانتے ہو یہ کیسا ہے؟ محرم کو جانتے ہو یہ کیسا ہے؟ یہ وہ ہینہ ہے جس میں ہمارا گھر لٹ گیا۔ یہ وہ ہینہ ہے جس میں وہ عاشور کا دن آیا، جس میں آل محمدؑ کا گھر تاراج ہو گیا۔ اور عاشور محرم کو یاد رکھنا۔ عاشور محرم اس دن کا نام ہے جس میں ہمارے عزیز کو ذلیل کر دیا گیا۔ اللہ وہ عزیز کر گیا اسی قابل تھا کہ شرم کا زانو ہو اور حسینؑ کا سینہ ہو۔ کیا یہ نہ ہر اکیسیاں اسی قابل تھیں کہ ظالم ان کے بازوؤں میں رسیاں باندھے۔ کیا فاطمہؑ کی لاڈلی اسی قابل ہے کہ کبھی طالعے مارے جائیں کبھی تازیانے لگائے جائیں اور بچی فریاد کرتی رہے بابا۔ بابا آپ کے بعد ظالم کچھ چلائے گا رہے ہیں۔

تیسری مجلس

اخلاق امام حسین علیہ السلام

”حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔ اللہ اس سے محبت کرے جو میرے حسین سے محبت رکھے۔“
سرکارِ دو عالمؑ کے اس ارشادِ گرامی کی روشنی میں جو سلسلہٴ اسلام آغاز محرم کے ساتھ شروع کیا گیا تھا اس کے تیسرے مرحلہ پر کچھ باتیں اخلاقِ سرکارِ بیاد الشہداء صلوات اللہ وسلامہ علیہ کے موضوع سے متعلق آپ کے سامنے گزارش کرنا ہیں۔ ابتدائی طور پر اپنے عزیزوں کی توجہ کے لئے گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ اخلاق کے دو تصورات ہیں:

ایک تصور اور مفہوم وہ ہے جو عوام الناس کے درمیان پایا جاتا ہے اور جس معنی میں لفظ اخلاق کو ہم اور آپ استعمال کرتے ہیں اور ایک اخلاق کا تصور وہ ہے جو ملائے اخلاق کی نظر میں پایا جاتا ہے جس کی بنیاد پر اچھے اور بُرے اخلاق کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور جس کی بنیاد پر واقف کسی انسان کو صاحب اخلاق یا بد اخلاق کہا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کے استعمالات میں اخلاق کا تقریباً تمام تر تعلق انسان کے ظاہری رتاؤں سے ہوتا ہے۔ ہم نے آپ کو سلام کر لیا، آپ نے ہمیں خوش اخلاق قرار دے دیا۔ ہم نے آپ کو سلام نہیں کیا، آپ نے ہم کو بد اخلاق سمجھ لیا۔ آپ نے ہم کو اپنے گھر پر مدعو کر لیا، ہم نے کہا نہایت ہی خوش اخلاق آدمی ہیں۔ ہمارے کہنے پر بھی آپ نے ہمیں

jabir.abbas@yahoo.com

اپنے گھر نہیں بلایا ہماری نگاہ میں انتہائی بد اخلاق ہو گئے سوائے ظاہری رکھ رکھاؤ کے اور ظاہری برتاؤ کے اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہمارے یہاں انسانی اخلاق کا فیصلہ کیا جاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ ماں باپ بھی جب بچوں کو اخلاق سکھانا چاہتے ہیں تو جب گھر کے اندر کوئی بزرگ داخل ہو جاتا ہے تو بچوں کو سمجھاتے ہیں کہ مجھ کو سلام کرو، یعنی گویا سارا اخلاق اسی میں پایا جاتا ہے کہ بیٹے کی گردن جھک جائے اور شاید اتنا جھک جائے کہ جس حد تک شریعت نے جھکنا جائز بھی قرار نہیں دیا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں اخلاقیات میں جائز اور ناجائز کی اتنی بڑی جگہ نہیں ہے جتنی بڑی جگہ شریعت کے عالم میں حاصل ہے۔ یہ بات آپ حضرات جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے ہیں ان کی معلومات کے لئے عرض کر رہا ہوں کہ ذیلے احترام میں تعظیم کے تین طریقے پائے جاتے ہیں:

- ۱۔ کسی کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو جانا۔
- ۲۔ کسی کی تعظیم کے لئے جھک جانا۔
- ۳۔ کسی کی تعظیم کے لئے سر خاک پر رکھ دینا۔

ان تینوں طریقوں میں ایک طریقہ وہ ہے جس کو دین اسلام نے بہر حال جائز قرار دیا ہے یعنی جو بھی قابل احترام ہے، قابل تعظیم ہے اس کی تعظیم کے لئے یہ چال جائز ہے کہ آپ اس کے احترام کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ لیکن اس کے بعد کسی کے احترام کے لئے جھک جائیں جس کو زبان شریعت میں رکوع کہا جاتا ہے یا کسی کی تعظیم کے لئے پیشانی خاک پر رکھ دیں جس کو مذہب کی زبان میں سجدہ کہا جاتا ہے اس کی اجازت دین اسلام میں نہیں دی گئی ہے۔ اب تو اشارۃً لکھنا چاہتا ہوں اکثر مومنین کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ زیارت مولائے کائنات کے بعد بھی اور زیارت سید الشہداء کے بعد بھی جہاں زیارات کا ذکر کیا گیا ہے وہاں یہ تذکرہ بھی پایا جاتا ہے کہ زیارت کے بعد دو رکعت نماز زیارت پڑھنا مستحبات میں ہے اور جہاں نماز زیارت کا ذکر ہے وہاں یہ فقرات بھی پائے جاتے ہیں کہ نماز

پڑھنے والا نماز تمام کرنے کے بعد مالک کی بارگاہ میں یہ گزارش کرتا ہے "اَللّٰهُمَّ ارِنِيْ مَسَلَّتْ هَاتَيْنِ التَّرَكُّبَتَيْنِ" پروردگار! یہ دو رکعت نماز جو میں نے پڑھی ہے یہ اپنی طرف سے ہدیہ ہے اس امام کے لئے جس کی بارگاہ میں یہ نماز ادا کی ہے۔ یہ نماز تیری ہے، ہدیہ اُن کے لئے ہے جو نہ نماز کسی اور کے لئے نہیں ہے۔ یہ نماز تیرے واسطے ہے۔ یہ بندگی تیرے واسطے ہے۔

خدا یا! یہ نماز تیرے لئے، یہ رکوع تیرے لئے، یہ سجدہ تیرے لئے، یہ عمل تیرے واسطے ہے اور ہدیہ اُن کے واسطے۔ کیوں؟

اسی لئے کہ چاہے نماز ہو، چاہے رکوع ہو، چاہے سجدہ ہو یہ کسی اور کے واسطے جائز نہیں ہے سوائے تیری ذات اقدس کے۔ اور شاید یہ فقرات معصوم کی بارگاہ میں اسی لئے پڑھوائے گئے ہیں کہ اگر کسی کے واسطے بھی جائز ہوتا تو ان سے بالاتر کون تھا اور جب ان کے واسطے نہیں ہے تو پھر کسی کے واسطے نہیں ہے تو مالک اگر ہر ان کی تعظیم کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں تو کیا کریں۔ ان کی عظمتوں کا اظہار کیسے ہو گا؟ کہا یہ طریقہ ہم نے اپنے واسطے رکھا ہے۔ رکوع کرو ہمارے واسطے۔ سجدہ کرو ہمارے واسطے۔ نماز پڑھو ہمارے لئے۔ ہمارے علاوہ کسی کے واسطے نہ نماز ہوگی نہ رکوع ہو گا نہ سجدہ ہو گا۔ ان کی عظمتوں کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم نے اپنے سامنے لوگوں کے سر جھکائے ہیں اور ان کے سامنے اہل ایمان کے دل جھکا دیئے ہیں۔ تو میں یہ گزارش کر رہا تھا کہ ہمارے یہاں اخلاق کا تصور یہ پایا جاتا ہے کہ انسان جتنا بھی ظاہری برتاؤ میں، سلوک میں بہترین سلوک کا مظاہرہ کر سکے اسی کا نام اخلاق ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ جس کے سامنے آدمی اتنا جھک کے سلام کر رہا ہے شاید اس کی اپنی محبت بھی اس کے دل میں نہ ہو۔ لیکن اخلاق کی دنیا میں اسے بلا اخلاق نہیں کہا جائے گا۔ تاریخ کا ایک واقعہ ہے جو آپ حضرات کے ذہن میں ہے اور میں بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ لیکن سلسلہ کو موطا بنانے کے لئے ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں کہ سرکارِ دو عالم مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ایک مسلمان آیا مسجد میں

اور نماز شروع کر دی اور چونکہ نیا نیا مسلمان تھا اور آپ جانتے ہیں کہ نئی مشین، بیشتر تیز چلتی ہے لہذا لمحوں میں نماز تمام ہو گئی۔ حضور دیکھ رہے ہیں کہ یہ نماز وہ ہے جس کا نہ رکوع نہ سج ہے نہ سجدہ صحیح ہے، نہ حضور ہے نہ خشوع ہے۔ یہ نماز، نماز کہے جانے کے قابل نہیں ہے مگر حضور نے یہ کہہ کے نہیں ڈکا نماز باطل ہے دوبارہ پڑھو۔ بلکہ حضور نے مسلمانوں کو ایک دوسرے نکلتے کی طرف متوجہ کیا۔ دیکھو یہ ہنگامہ یہ گناہ پڑنا، بظرفہ نماز ایسا انداز زندگی یہ کیوں پیدا ہو گیا ہے، اس لئے کہ اس کے دل میں خوف خدا نہیں ہے۔ اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا، اگر اس کا دل خدا کے سامنے جھک گیا ہوتا، اگر یہ خدا کا خوف رکھتا ہوتا تو اس کی نماز کا یہ انداز نہ ہوتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضور یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ نماز میں اعمال کا، حرکات کا، قیام کا، رکوع و سجود کا سارا عیب رکوع و سجود سے نہیں پیدا ہوتا ہے دل سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر دل صراطِ مستقیم پر ہوتا ہے تو عمل بھی صحیح ہوتا ہے اور یہی وہ جگہ ہے کہ جہاں ہم نے سرکارِ دو عالم کی تعلیمات سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ اس لئے کہ ہم نے دل کی دنیا کو الگ کر دیا ہے اور اعمال کی دنیا کو الگ کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بے ایمانوں کے پاس ایک ہی نعرہ ہوتا ہے، ہمارے اعمال کو نہ دیکھئے، ہمارے کردار کو نہ دیکھئے، ہماری برائیوں کو نہ دیکھئے، دل اتنا پاک و پاکیزہ ہے کہ کائنات میں کسی کا نہ ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کو اس نے پہچاننا ہے، سرکار نے نہیں پہچانا ہے۔ دل کی دنیا کو یہ جانتا ہے حضور سرور کائنات نہیں جانتے ہیں۔ جب کہ حضور نے فرمادیا ہے کہ اعمال میں عیب اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب دل میں عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ لہذا جب تمہارے اعمال میں کوئی خرابی پیدا ہو تو اعمال کی اصلاح کی فکر نہ کرو پہلے دل کو پاکیزہ بناؤ جس دن دل پاکیزہ ہو جائے گا اعمال خود بخود صحیح ہو جائیں گے جسלוں میں اس بات کو دور نہیں لے جانا چاہتا ہوں لیکن بہر حال جو اس سلسلہ کا بنیادی نکتہ ہے اسے اپنے عزیز بچوں اور نوجوانوں پر یقیناً واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے یہاں اخلاق کا قصور اور بے اور دنیا کے اخلاق میں اخلاق کا قصور کچھ اور ہے۔ اس کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں ورنہ داستان بہت طویل ہے۔

انسانی زندگی میں دو چیزیں پائی جاتی ہیں:
ایک کا نام ہے علم اور ایک کا نام ہے عمل۔
ہر انسان کی زندگی میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔
علم کی دنیا الگ ہے اور عمل کی دنیا الگ ہے۔
علم کا تعلق روح سے ہے، نفس سے ہے، عقل سے ہے، ذہن و دل و دماغ سے ہے۔

عمل کا تعلق انسان کے اعضاء و جوارح سے ہے تو علم کی دنیا الگ ہے اور عمل کی دنیا الگ ہے۔ اور انسان جب کوئی عمل انجام دیتا ہے تو عمل بغیر کسی تحریک کے نہیں ہوتا ہے۔ جیسے علم بغیر سب کے نہیں آتا ہے ویسے ہی عمل بغیر تحریک کے انجام نہیں پاسکتا ہے۔ کوئی عمل آپ انجام دیں گے تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوگا۔ آپ کیوں اگر فرشتہ عزیز پڑھ گئے، اپنے گھروں سے نکل کر کیوں آگئے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ بیکار بیٹھے تھے۔ دنیا میں کوئی کام نہیں تھا۔ سوچا چلو وہیں چل کے بیٹھ جائیں۔ کوئی تو محرک تھا جو آپ کو گھر سے نکال کر یہاں تک لے آیا ہے۔ بہترین جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے اس سے کم تر جگہ پر ”بظاہر“ آکے بیٹھ گئے، بہترین کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے فرنگ پر آکر بیٹھ گئے۔ ایرکٹڈیشن میں بیٹھے ہوئے تھے خدائی ایرکٹڈیشن میں آکے بیٹھ گئے۔ یہ اتنا برا فرق کیوں پیدا ہو گیا کیوں اپنے گھروں کو چھوڑا۔ کیوں راحت کیوں کوئی تحریک ہو گا؟ اگر یہ فرشتہ عزیز نہ ہوتا، اگر یہ ایامِ عزیز نہ ہوتے، اگر یہاں ذکرِ آلِ محمد نہ ہوتا، اگر یہاں تذکرہ حسین نہ ہوتا تو کوئی شریف مومن یہاں آکر نہ بیٹھتا۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک محرک تھا جو آپ کو گھروں سے نکال کر یہاں تک لے آیا ہے۔ بغیر تحریک کے کوئی کام دنیا میں انجام نہیں پاتا ہے۔ جیسے بغیر سب کے علم نہیں آتا ہے ویسے ہی بغیر تحریک کے عمل نہیں پیدا ہوتا ہے۔ علم کو بھی سبب درکار ہے چاہے در در ہو، چاہے استاد ہو، چاہے ماں باپ ہوں، چاہے معاشرہ ہو اور چاہے پروردگار ہو۔
میں نے ایک لفظ کہا ہے کوئی علم بغیر سبب کے نہیں آتا ہے۔ ہمارے بندے بندگان

ہیں خدا کوئی نہیں ہے، سوائے دھڑلا شریک کے۔ تو ہمارے پاس علم ماں باپ کے ذریعہ آیا، اُس کے بعد استاد کے ذریعہ آیا۔ کچھ معاشرے سے سیکھا، کچھ ماحول سے سیکھا، کچھ لوگوں سے سیکھا، یہی اسباب تھے جنہوں نے ہمیں صاحب علم بنا دیا ہے۔ جو اللہ کے نیک بندے ہیں، جو خدا کے نام سے ہیں ان کا علم بھی اگر کہیں اور سے نہیں آیا ہے تو پروردگار کے یہاں سے آیا ہے۔ اسی لئے مالک نے بار بار اپنی تعریف کا ذکر کیا ہے الرحمن۔ علمہ القرآن، خلق الانسان۔ علمہ البیان۔ تو جیسے علم کے لئے سبب درکار ہے ویسے ہی عمل کے لئے ایک محرک درکار ہے۔ ایک تحریک چاہیے جس تحریک کے بغیر کوئی عمل نہیں ہو سکتا ہے۔ تو پروردگار عالم نے انسانی زندگی میں عمل کی تحریک پیدا کرنے کے لئے انسان کے اندر دو طاقتیں رکھ دی ہیں جن کا کام مسلسل تحریک عمل پیدا کرنا ہے۔

ایک طاقت ہے جس کا نام ہے خواہش، اور ایک طاقت ہے جس کا نام ہے غیظ و غضب۔

کوئی انسان دنیا کا ایسا نہیں ہے جو ان دو طاقتوں سے خالی ہو۔ ہر انسان میں خواہش بھی ہوتی ہے اور ہر انسان میں قوت غضب بھی ہوتی ہے۔

اگر قوت غضب نہ ہو تو انسان بے حیا ہو جائے اور اگر خواہش نہ ہو تو انسان مردہ ہو جائے، دو لمحہ زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ یہ خواہشات ہی ہیں جو انسان کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ خواہش ہے جو کھانے پر آمادہ کرتی ہے۔ خواہش ہے جو پینے پر آمادہ کرتی ہے۔ خواہش ہے جو نسلوں کو آگے بڑھانے پر آمادہ کرتی ہے۔ خواہش ہے جو انسان کو زندہ رکھتی ہے۔ خواہش ہے اولاد کی حواں کو نہ مہینے زحمت برداشت کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ خواہش اولاد ہے جو باپ کو محنت کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ یہ خواہشات کی دنیا ہے جو نوع بشر کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ لہذا خواہشات کو گالیاں دینا یہ کوئی عقلندی نہیں ہے۔ خواہشات میں جو بہک جاتے ہیں وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کو بُرا کہا جائے در نہ خواہش تو ایک نعمت پروردگار ہے، ایک عطیہ الہی

ہے اور یہی حال قوت غضب کا ہے اگر کسی کو کسی بات پر غصہ نہ آئے، کسی بات پر بلا و غضب کا مظاہرہ نہ کرے تو ایسے آدمی کو بے غیرت کہا جاتا ہے بے حیا کہا جاتا ہے۔ یہ صاحب کردار نہیں ہے تو پروردگار عالم نے انسانی زندگی میں تحریک عمل کے لئے دو طاقتیں رکھی ہیں۔ تو جب خواہش خواب پیدا ہوئی تو گھر سے نکلے۔ جب خواہش جنت پیدا ہوئی تو گھر کو چھوڑ دیا اور اگر باہر فرش عمارت بٹھ گئے۔ یعنی ایک جذبہ تھا جو آپ کو گھنچ کے لئے آیا ہے اور اس کے بعد انسانی زندگی میں غیظ و غضب کے لاکھوں مظاہرے ہیں۔ ان ساری تفصیلات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کے صاحب کردار بننے کے لئے کسی ایک طاقت کا صحیح راستہ پر چلنا کافی نہیں ہے۔ بہترین بات اس موقع پر ابو حامد غزالی نے کہی ہے۔ اگرچہ بہت سی باتیں ان کی عجیب و غریب بھی ہیں لیکن بہر حال یہ ایک بات معقول ہے لہذا میں اس کو حوالہ کے طور پر آپ کے سامنے گزارش کر رہا ہوں۔ مثال اچھی ہے۔

کہا دیکھو اگر کسی خین انسان کو تلاش کرنا ہے جو شکل و صورت کے اعتبار سے وجاہت کے اعتبار سے اچھا دکھائی دے، حسین دکھائی دے۔ تو کیا انسانی حُسن کے لئے تنہا آنکھوں کا بہتر ہونا کافی ہے؟ کیا انسانی حُسن کے لئے تنہا چہرے کا رنگ اچھا ہونا کافی ہے؟ کیا انسانی حُسن کے لئے پیروں کا ٹھیک ہونا کافی ہے؟ کیا انسانی حُسن کے لئے ہاتھوں کا صحیح ہونا کافی ہے؟ کیا انسان کے حُسن کے لئے زبان کا بہترین ہونا کافی ہے؟ نہیں حُسن بشر کسی ایک عضو کے حُسن کا نام نہیں ہے اور نہ کسی ایک عضو کے ٹھیک ہونے سے حُسن پیدا ہوتا ہے۔

اگر حسین ترین چہرہ ہے اور آنکھیں نائیا ہیں تو کیا ایسے آدمی کو حسین کہا جائیگا؟ آنکھیں ایسی ہیں کہ اگر نظر اٹھلے تو زمین سے آسمان کی خبر لے آئے مگر چہرہ وہ جو دیکھنے لائق نہ ہو تو کیا اسے حسین کہا جائیگا؟ بہترین چہرہ ہے، بہترین آنکھیں ہیں مگر ناک ٹیڑھی ہے تو کیا اسے حسین کہا جائیگا؟ بہترین ناک ہے مگر کان بڑے ہیں یا چھوٹے ہیں تو کیا اسے حسین کہا جائیگا؟ سب صحیح ہے مگر پیر ایک ہی فٹ

کے ہیں تو کیا اسے خین کہا جائے گا؟ پیر بھی ٹھیک ہے مگر ہاتھ ایسا ہے جو بہت ہی مختصر ہے یا بہت طویل ہے تو کیا اسے خین کہا جائے گا؟ ہاتھ ٹھیک ہیں مگر انگلیاں صحیح نہیں ہیں تو کیا اسے خین کہا جائے گا؟ تو جسے حسن ظاہر محتاج ہے کہ بال بھی سر کے صحیح ہوں، سر بھی حجم کے اعتبار سے صحیح ہو، آنکھیں بھی ٹھیک ہوں، کان بھی صحیح ہوں، ناک بھی صحیح ہو، چہرہ کا رنگ بھی صحیح ہو، لب بھی صحیح ہوں، ہاتھ بھی ٹھیک ہوں، پیر بھی صحیح ہوں یعنی سر سے پیر تک سارا جسم متوازن ہو کہ اگر ایک عضو بھی ٹیڑھا ہو جائے تو انسان خین کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔ تو یہی حال سن باطن کا بھی ہے جس کا نام ہے کردار اور کیرکٹر۔ کیرکٹر کسی ایک چیز سے ملے نہیں ہوتا ہے۔ بہت بڑے لکھے ہیں مگر جھوٹے ہیں۔ بہت بڑے سچا ہونے والے ہیں مگر میدان چھوڑ کے بھاگ جاتے ہیں۔ بہت بڑے سپاہی ہیں مگر کبھی سچ نہیں بولتے ہیں۔ بہت بڑے بہادر ہیں مگر فقر کے ہاتھ پر کبھی ایک پیسہ نہیں رکھتے۔ ایسا انسان صاحب کردار نہیں کہا جاسکتا ہے۔ کیرکٹر کے لئے ضروری ہے کہ علم میں کوئی کمزوری ہو اور نہ عمل میں کوئی کمزوری ہو۔ صلوات

انسانی وجود میں جتنے اوصاف ہیں اور سارے اوصاف اسی طرح اتنے معتدل ہوں جس طرح حسن ظاہر میں پورے بدن کے ایک ایک عضو کا معتدل اور متناسب ہونا ضروری ہے، کہیں سے نقص و عیب نہ پایا جاتا ہو۔

اگر میرے اس نکتہ کو آپ نے پہچان لیا ہے تو میں ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ اب پہچانے پروردگار نے کیوں اپنے پیغمبر سے کہا تھا اِنَّكَ لَعَلىٰ خُلُقٍ عَظِيْمٍ میرے پیغمبر آپ عظیم ترین اخلاق کی منزل پر فائز ہیں اس لئے کہ اخلاق کے لئے جتنا کمال درکار ہے وہ سارا کمال آپ کے پاس ہے۔

اس لئے کہ آپ نے علم کسی اور سے لیا ہے اور نہ عمل کسی اور سے لیا ہے، جو آپ کے پاس ہے وہ سب میرا ہی دیا ہوا ہے۔ اب اگر آپ میں کمزوری پیدا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دینے والے کے خزانہ میں کوئی کمی پائی جاتی ہے اور جب نہ لینے والے کے ظرف میں کمی ہے اور نہ دینے والے کے کرم

میں کمی ہے تو جب دونوں کا مجموعہ سامنے آئے گا تو دینے والا خدا کے عظیم ہونگا اور لینے والا صاحب خلق عظیم ہوگا۔ صلوات

اور اس کے بعد معصومین کے ارشادات میں یہ لفظ پایا جاتا ہے جس کا عالم اسلام نے اپنے خوار سے نقل کر لیا ہے لیکن دراصل یہ لفظ معصومین کے ارشادات میں پایا جاتا ہے کہ اگر سرکارِ دو عالم کی تاریخ اخلاق کو مرتب کرنا چاہو اور یہ دیکھنا چاہو کہ پیغمبر کا اخلاق کیا تھا تو ایک مختصر لفظ یہ ہے کہ پیغمبر کا اخلاق تھا قرآن۔ پیغمبر کا کردار تھا قرآن! یعنی پورے قرآن میں کردار کے لئے جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں، جن اوصاف و کمالات اور شرائط کا ذکر کیا گیا ہے ان سب کو اگر الفاظ میں دیکھنا چاہو تو قرآن میں دیکھو اور مجسم شکل میں دیکھنا چاہو تو پیغمبر کے کردار میں دیکھو۔ سرکارِ اخلاق وہی ہے جو قرآن مجسم ہے یعنی ہر وہ چیز جس کو قرآن نے بڑا کہا، سمجھو کہ دارِ پیغمبر میں نہیں ہے اور ہر وہ بات جس کو قرآن نے قابلِ تعریف قرار دیا ہے، سمجھو کہ دارِ پیغمبر میں ہے۔ اب حوالوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اخلاق پیغمبر کو اگر پہچانا ہے تو اس کا آسان نسخہ معصوم کی زبان سے بھی اور غیر معصومین کی زبان سے بھی یہ معلوم ہو گیا ہے کہ اخلاق پیغمبر وہی ہے جو اخلاق قرآن ہے۔ جسے قرآن نے کردار قرار دیا ہے، پیغمبر میں وہی کردار پایا جاتا ہے۔ اب اگر حیات پیغمبر میں واقعات نہ بھی ملیں، اگر پیغمبر کی تاریخ لکھنے والے، سیرت لکھنے والے ہزاروں واقعات جمع بھی نہ کر سکیں تو بھی پیغمبر کو یوں پہچان لیجئے کہ اگر کسی چیز کو قرآن نے قابلِ تعریف قرار دیا ہے تو وہ کردار پیغمبر میں ہے اور اگر کسی چیز کو قرآن نے عیب کہا ہے تو سمجھو کہ دارِ پیغمبر میں نہیں ہے، چاہے (صحیح) کتاب ہی میں کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ کوئی کتاب اخلاق پیغمبر میں نہیں ہے۔ کوئی کتاب کردار پیغمبر میں ہے۔ کردار پیغمبر قرآن ہے، لہذا نبوت کو قرآن کے آئینہ میں دیکھا جائے گا، نبوت کو کتابوں کے آئینہ میں نہیں دیکھا جائے گا۔ بلکہ میں تو یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ کتابوں کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ بھی کردار پیغمبر سے کیا جائے گا۔ قرآن سے مل جائے

تو صحیح کہے جانے کے قابل ہے ورنہ قرآن سے منکر جانے تو غلط کہے جانے کے قابل ہے۔ صلوات

تو اخلاق قرآنی اخلاق انسانی میں مجسم ہو گیا سرکارِ دو عالم کی زندگی میں۔ اگر قرآن کہتا ہے جھوٹ بولنا غلط ہے تو پیغمبرؐ کوئی پیغمبرؐ بھی غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید ذکرِ جنابِ ابراہیمؑ کر رہا ہے "ابراہیمؑ کو یاد کرو ابراہیمؑ کا ذکر کرو اگرچہ تمہارا دور ان کا دور نہیں ہے مگر وہ ہمارا پیغمبر تھا اسے یاد کرو اس کے کردار کو یاد رکھو" اِنَّهٗ كَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا ابراہیمؑ ایک نبی صِدِّیق تھا، ابراہیمؑ ایک سچ بولنے والے تھے۔

قرآن کہتا ہے وہ سچ بولنے والے صِدِّیق پیغمبر تھے، اگر کوئی کتاب کہے کہ ابراہیمؑ زندگی میں ایک دفعہ جھوٹ بولے تو بتاؤ عزیزِ دو قرآن کو جھٹلایا جائے یا کت بکو جھٹلایا جائے یا اتنی وسعتِ دل پیدا کر لی جائے کہ یہ بھی سچ اور وہ بھی صحیح۔ یہ بھی سچا وہ بھی سچی۔ صلوات

اگر غلط بیانی کو قرآن نے غلط کہا ہے تو پیغمبرِ اسلامؐ کے کردار میں غلط بیانی بھی نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر بُردلی کو قرآن نے غلط کہا ہے تو پیغمبرؐ بھی بُردلی نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر بخل کو قرآن نے غلط کہا ہے تو پیغمبرؐ بھی بخل نہیں کر سکتا ہے۔ اگر حسد کو قرآن نے غلط کہا ہے تو پیغمبرؐ بھی حسد نہیں کر سکتا ہے۔ اگر غیبت کو قرآن نے غلط کہا ہے تو پیغمبرؐ بھی غیبت نہیں کر سکتا ہے۔ اگر اتہام و الزام کو قرآن نے غلط کہا ہے تو پیغمبرؐ کسی الزام نہیں لگا سکتا ہے۔ پیغمبرؐ کا اخلاق وہی ہے جو قرآن کہہ رہا ہے۔ یہ پیغمبرؐ کی زندگی کو پہچاننے کا بہترین طریقہ ہے۔ ایک ایک بُرائی کو قرآن سے پڑھنے جائیے اور حیاتِ پیغمبرؐ سے نفی کرتے جائیے۔ ایک ایک عیب کا ذکر قرآن میں پڑھتے جائیے اور پیغمبرؐ کی زندگی سے اُسے الگ کرتے جائیے اور اس کے بعد ایک فہرست بنا لیجئے اچھا بیٹوں کی کہ انک نے قرآن میں کن کن باتوں کی تعریف کی ہے۔ جس بات کی قرآن نے تعریف کر دی ہے سمجھو وہ کردار پیغمبرؐ میں ہے۔

اب تو آپ کو اندازہ ہو گیا کہ پیغمبرؐ کا وجود الگ نہیں ہے۔ قرآن قلبِ پیغمبرؐ پر اُتر آیا ہے۔ اخلاقِ پیغمبرؐ قرآن ہے "قرآن لفظوں کی شکل میں کر دیا ہے۔ پیغمبرؐ عمل کی شکل میں قرآن ہے۔" خود کر رہے ہیں آپ؟ اب نبیؐ ہی کی زبان سے سنئے فرماتے ہیں "اِنَّہٗمُ الْاَنْبِیَّۃُ" قرآن و اہلبیتؑ ہرگز الگ نہیں ہو سکتے ہیں۔ اب اگر ایک جگہ بھی اہلبیتؑ کا عمل قرآن سے الگ ہو جائے تو پیغمبرؐ کی بات غلط ہو جائے گی لہذا جہاں بھی قرآن ہے وہیں اہلبیتؑ ہیں اور جہاں بھی قرآن ہے وہیں پیغمبرؐ ہیں۔ صلوات

اب معیارِ قرآن مجید ہے سرکارِ دو عالم کے اخلاق کو پہچاننے کے لئے بھی اور اہلبیتؑ کے کردار کو پہچاننے کے لئے بھی اگر حضورِ سرورِ کائناتؐ نے خود فرمایا ہے کہ "اِنَّہٗمُ الْاَنْبِیَّۃُ" یٰۤاٰیُّہَا الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَہٗ اَعْلٰی الْحُكُوفِ" یہ اس وقت تک الگ نہیں ہو سکتے ہیں جب تک حوضِ کوثر پر وارد نہ ہو جائیں۔ تو جب ان دونوں میں چوڑائی نہیں ہو سکتی ہے تو جہاں قرآن ہے وہاں اہلبیتؑ ہیں، اور جہاں قرآن نہیں ہے جس چیز کا قرآن ساتھ نہیں دیتا اہلبیتؑ اس چیز کا ساتھ نہیں دے سکتے ہیں۔ جو اچھائی قرآن نے بیان کی ہے وہ کردار اہلبیتؑ میں ہے اور جس کو قرآن نے بُرا کہا ہے وہ کردار اہلبیتؑ میں نہیں ہے۔ وہی معیار جو پیغمبرؐ کے اخلاق کو پہچاننے کا تھا وہی بقولِ پیغمبرؐ اہلبیتؑ کے کردار کو پہچاننے کا ہے لہذا اگر تفصیلی واقعات تاریخ میں نہ بھی ہوں تو بھی ہم یہ جانتے ہیں کہ قرآن کی ہر نبی کو کردار اہلبیتؑ میں ہے اور جسے بھی قرآن نے غلط اور بُرا کہہ دیا ہے وہ کردار اہلبیتؑ میں نہیں ہے۔

اس کے بعد جو جملے ظاہری برتاؤ کے بارے میں بھی گزارش کر دینا چاہتا ہوں کہ ظاہری اخلاق ظاہری برتاؤ بھی دنیا کے ساتھ کتنا طیب و طاهر تھا، کتنا پاک و نیک تھا۔ پاکیزگی نفس کا تو آپ نے اندازہ کر ہی لیا ہے کہ علم انھوں نے کسے اس سے کم ہو جائے یا کمزور ہو جائے۔ وہ خدا کا دیا ہوا ہے لہذا اس میں کوئی کمزوری

jabir.abbas@yaho

نہیں ہو سکتی ہے۔ یہی حال خواہشات کا ہے کہ پروردگار عالم نے خواہشات پر غلبہ کے پہرے بٹھا دیئے ہیں اور قوت غضب پر آیت تطہیر کا پہرا بٹھا دیا ہے نہ خواہش بہک سکتی ہے نہ غضب بہک سکتا ہے۔ لہذا جس بات کی خواہش کریں، سمجھو مطابق قرآن ہے، مطابق وحی ہے، مطابق اسلام ہے۔ اور اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ اگر اہلبیت کی کوئی ایک خواہش بھی مرضی پروردگار کے خلاف ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ وہ پیغمبر کی طرف اشارہ کریں اور پیغمبر اُدھر مڑ جائیں، وہ پیغمبر سے کسی راستہ پر چلنے کے لئے کہیں اور حضور اسی راستہ پر چلے گئیں۔ اس لئے کہ حضور کسی خواہش کا اتباع نہیں کر سکتے ہیں۔ پیغمبر تو ملتے بھی نہیں ہیں جب تک وحی الہی نہ آجائے۔ حالانکہ پیغمبر کے دل میں خواہش پائی جاتی ہے وہ بھی قلب پیغمبر کی خواہش ہے۔ ہماری اور آپ کی خواہش نہیں ہے اور قلب پیغمبر قلب ہونے کے اعتبار سے بھی ہمارے دلوں سے زیادہ طیب و طاهر اور پاکیزہ ہے کہ وہ سارے نفوس کو پاکیزہ بنانے کے لئے آئے ہیں تو ان کے نفس میں اگر پاکیزگی نہ ہوگی تو کہاں ہوگی۔ تو نبی میں جو خواہش پیدا ہو ظاہر ہے کہ وہ پیغمبر خواہش ہے۔ مگر اس کے بعد بھی خدا کہتا ہے کہ میرا پیغمبر ایسا پاکیزہ کہ دار ہے کہ اپنی خواہش سے روٹتا بھی نہیں ہے، عمل تو بڑی بات ہے تو جو نبی بول بھی نہ سکتا ہو اپنی خواہش سے روٹتا ہے۔ بچوں کے کہنے پر ادھر ادھر چلا جائے گا؟ وہ بچوں کے پشت پر آکے بیٹھ جائے۔ سجدہ کو طول دے دیکھا؟ جو اپنی خواہش کا اتباع نہ کر سکتا ہو وہ غیر کی خواہش کا اتباع کیسے کرے گا۔ اب اگر نبی مڑ جائے تو پہچانے کی حین کی خواہش، خواہش نہیں ہے مرضی خدا ہے۔ پیچھے کا تقاضہ نہیں ہے مرضی پروردگار ہے۔ اس لئے کہ اخلاق و عادات مطابق قرآن ہے۔

یہ چھوٹے چھوٹے واقعات جو سرکار سید الشہداء کے ہمارے سامنے صبح و شام آتے رہتے ہیں ضرورت ہے کہ انسان ان واقعات کی معنویت پر غور کرے اور سرکار دو عالم کے کردار کی روشنی میں، حضور کی عظمتوں کی روشنی میں ہزارہ کی عظمتوں کا اندازہ کرے۔ معاملہ اگر یک طرفہ ہو تو کوئی بھی تنقید کی جا سکتی ہے۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ

ایک پر نماز پڑھ رہا ہو اور بہت مخصوص دشمن سے پڑھ رہا ہو تو آپ کے لئے یہ کہنا بہت آسان ہے کہ پیچھے ہے اس کا آج بھی موڈ آگیا ہے لہذا نماز الہی پڑھ رہا ہے۔ ایک بچے کو آپ نے دیکھا کہ وہ نماز جلدی جلدی پڑھ رہا ہے۔ آپ نے کہا بچو تو پیچھے ہے، اس کا اعتبار یہی کیا ہے تو کسی ایک انسان سے مسئلہ کا تعلق ہو تو جو چاہے کہہ دیجئے کہ روکنے والا ہے۔ مگر مسئلہ یہ نہیں ہے کہ حین بچے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ پیغمبر سجدہ میں ہیں مگر حین اپنی مرضی سے سجدہ میں طول بھی دینا چاہتے ہیں تو پیغمبر تو کوئی بچے نہیں ہیں، وہ تو صاحب منصب ہیں۔ اس لئے کہ نماز آئی ہے اعلان رسالت کے بعد۔ ایک لفظ کے معنی یہ بیانے گا۔ اگر پہلے نبی نہ بھی رہے ہوں، ”خواب تو ہیں۔“ یہاں معصوم نہ رہے ہوں۔“ اب تو معصوم ہیں۔ اب تو نماز پڑھ رہے ہیں، سلاموں کا تکرار بٹھا رہے ہیں۔ اب کم از کم بچوں کی خواہش کا احترام نہیں کرنا چاہیے۔ لہذا اگر کوئی انسان کہتا ہے کہ حین نے نبی کو سجدہ میں روک لیا بچپنا تھا، حین کا منہ ہے کہ بچہ نہ گئے یہ بچپنا تھا۔ حین نے مانا کہ ناتر بنا لیا یہ بچپنا تھا۔ تو بچوں کا بچپنا تھا، بچپنا بچپنا تو نہیں تھا۔ میں بھی یہ دیکھتا ہی نہیں کہ یہ کیسے ہیں۔ میں تو انہیں دیکھتا ہوں کہ وہ کیسے ہیں۔ اور جب ان کے کردار کو دیکھتا ہوں تو ان کی بلندی کو دار کا اندازہ ہوتا ہے۔ صلوات

عزیزان محرم! ظاہری اخلاق اور ظاہری برتاؤ کے بارے میں جو باتیں میں گزارش کر رہا تھا۔ دو جگہ اور عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ امام حینؑ اور پیغمبر اسلام کا اعادہ بھی سامنے آجائے اور سرکار سید الشہداء کا ظاہری برتاؤ اور ظاہری اخلاق بھی آپ کے سامنے آجائے۔ تاریخ میں دو واقعات ہیں جو عام مومنین نے بھی نقل کیے ہیں اور دونوں واقعات کا تعلق فقیروں سے ہے اور میں ان واقعات کو سامنے آپ کے سامنے نقل کر رہا ہوں کہ برتاؤ کی اس سے اچھی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی ہے اور اس کے لئے دو لفظیں اور تہیہ گزارش کر دوں۔ غریب آدمی ہوں کے ساتھ بیٹھ جائے تو کوئی ہنسنے نہیں ہے۔ فقیر آدمی فقیروں میں آکے بیٹھ جائے

کوئی ہنر نہیں ہے۔ چھوٹا آدمی چھوٹے لوگوں میں آگے بیٹھ جائے کوئی ہنر نہیں ہے۔ ہم تو اپنے دور میں بڑے آدمی کو غریبوں کی طرف سے گذرتے بھی نہیں دیکھتے ہیں، بیٹھنا تو بڑی بات ہے۔ یعنی غریب آدمی کے دل میں تو خالی حسرت رہ جاتی ہے۔ بڑے آدمی کو دیکھنے کی کبھی کبھی زندگیاں گذر جاتی ہیں اور بڑی شخصیتیں لوگوں کی نگاہ کے سامنے بھی نہیں آتی ہیں۔

امام حسینؑ تو دونوں اعتبار سے بڑے ہیں۔ دنیاوی اور ظاہری اعتبار سے بھی اور واقعی اعتبار سے بھی۔ اس لئے کہ وہ امام واجب الطاعہ ہیں۔ اور ظاہری اعتبار سے بھی کون کائنات میں ایسا ہے جس کا نسب امام حسینؑ جیسا ہو۔ کوئی دنیا میں ایک انسان ایسا ڈھونڈ کے لائے کہ جس کا نسب امام حسینؑ جیسا ہو، جس کا باپ دیا ہو جیسا ان کا باپ ہے۔ جس کی مادہ گرامی ویسی ہو جیسی ان کی ماں ہے۔ جس کا نانا دیا ہو جیسا ان کا نانا ہے۔ جس کا بھائی دیا ہو جیسا ان کا بھائی ہے۔ جس کا بیٹا دیا ہو جیسا ان کا بیٹا ہے۔ تو امام حسینؑ جیسا عظیم النسب، جلیل النسب، کرم النسب تاریخ میں کوئی انسان نہیں ہے۔

اس کے بعد دیکھئے کہ امام حسینؑ ایک راستے سے گذر رہے ہیں، ایک مقام پر کھیا کہ فقیروں کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی ہے اور لوگوں نے کہا فرزند رسولؐ! ہم لوگ کھانا کھا رہے ہیں اور آپؐ ادھر سے گذر رہے ہیں، ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپؐ بھی ہمارے ساتھ بیٹھ جائیں۔

فرزند رسولؐ فوراً بیٹھ گئے، اسی خاک پر بیٹھ گئے۔

لوگوں کو حیرت ہوئی کہاں امام حسینؑ، کہاں ہم غریب و فقیر؟ یہ دولت دین و دنیا کے مالک ہیں۔ یہ پیغمبرؐ کے نواسے ہیں۔ علیؑ کے بیٹے ہیں۔ ہر جلالت، ہر عظمت، ہر بزرگی، ہر بلندی ان کے واسطے ہے اور یہ ہمارے ساتھ کہاں بیٹھ گئے؟

امام حسینؑ چاہتے ہیں کہ میرے اطلاق کو پہچانو۔ یہ مروت کا سودا نہیں ہے۔ یہ دکھاوے کا سودا نہیں ہے۔ یہ ریاکاری کا معاملہ نہیں ہے۔ میں اس لئے بیٹھ گیا کہ ان شاء

لا محبت المستکبرین خدا! فرود لوگوں کا تکبر لوگوں کو اپنے کو بڑا سمجھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا ہے۔ چونکہ خدا نے اخلاق پر قرار دیا ہے کہ انسان میں تکبر نہ ہو، لہذا میں بیٹھ گیا۔

اس کے بعد جو غریبوں کے پاس روکے ہو سکھی روٹیاں تھیں امامؑ نے اس میں حرکت بھی فرمائی اور کھالیا۔ اور اب دوسرا حکم قرآن آگیا هَلْ جَاءَ الْاِخْسَاسِ الْاِخْسَاسُ۔ جیسے ہی دسترخوان سے اٹھے فرمایا تم نے مجھے مدعو کیا میں تمھارے ساتھ خاک پر بیٹھ گیا۔ میں نے تمھاری روکھی سوکھی روٹیوں میں حصہ لیا۔ اب میں تمھیں مدعو کر رہا ہوں، تمھارا بھی فرض ہے کہ میری دعوت کو قبول کرو۔

گویا کہ یہ ایک قرآنی تشیل ہے جو کردار حسینؑ میں مجسم ہو رہی ہے۔ جب خدا نے فرمایا ہے کہ احسان کا برابر احسان ہے تو اب میں تم کو اپنے گھر مدعو کر رہا ہوں۔ لوگوں نے کہا تنگ ہے، حضور بلا رہے ہیں، ہم ضرور آئیں گے۔ اُسے بیت الشرف میں گھر کے اندر جاکے فرمایا۔ کیا ہے گھر کے اندر؟ جو کچھ ہے وہ جا کے لے آؤ اس لئے کہ ہم نے ان کو مدعو کیا ہے۔ اس کے بعد بلایا، بٹھایا۔ کھانا کھلانے کے بعد جو کچھ بھی گھر میں سراپا تھا سب اٹھا کے ان غریبوں کے حوالہ کر دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ قرآن مجید نے یہ بھی تعلیم دی ہے اِذَا جِئْتُمْ شَرْفًا فَعَجِلْوا بِاِحْسَانٍ وَمِنْهَا اگر تم کو کوئی مدد دیا جائے کوئی تمھیں مدد دیا جائے تو تم اس کو بہتر بنا کے واپس کرو۔ حد یہ ہے کہ اسلام، سلام میں بھی راضی نہیں ہے کہ اگر کوئی سلام کرے تو بے ہی جواب دو بلکہ اس سے بہتر جواب دو۔ تو جو فطرت میں یہ چاہتا ہے کہ بہتر بنا کے واپس کیا جائے وہ کردار میں تو اس سے زیادہ مطالبہ کرے گا۔ واقعہ دونوں میں گذر گیا، مگر جس کی دونوں کی زندگی میں اتنی فراقی آیتیں مجسم ہو جائیں اس کی بوری حیات کا جائزہ لیا جائے تو قرآن اسی کردار میں مجسم دکھائی دے گا صلوٰت بس عزیز و بات کو سمیٹ رہا ہوں۔ یہ ایک واقعہ تھا۔ دوسرا واقعہ بھی بعینہ ایسا ہی ہے کہ غریبوں کی جماعت بیٹھی ہوئی ہے، لوگ کھانا کھا رہے ہیں۔ فرزند رسولؐ کا گذر ہو گیا۔ لوگوں نے گزارش کی آئیے حضور آپؐ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوجائیے۔

jabir.abbas@yahoo.com

امام بیٹھ گئے۔ لوگوں نے کہا حضور کچھ کھا لیجئے؟ فرمایا میری مجبوری ہے۔ میں کچھ کھا نہیں سکتا ہوں۔ خدا شکر ہوں کہ دوست نہیں رکھتا ہے لہذا میں بیٹھ گیا، مگر انہوں نے کہا کہ تم کھا کر دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھ جاتے ہو اور مولا کھا بھی لیتے ہو، لیکن ہمارے ساتھ کھانے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ کیا ہمارے اندر کوئی عیب ہے، ہمارے کھانے میں کوئی خرابی ہے؟ شام کو دہن میں یہ سوال پیدا ہوا تو امام نے خود وضاحت فرمادی کہ تم لوگ جو کھا نا کھا رہے ہو یہ لوگوں کے گھروں سے بطور صدقہ لائے ہو، اور ہم اہلبیت کو پروردگار عالم خاص منزل پر رکھا ہے کہ ہمارے جد و جہاد گوارنے یہ اعلان کر دیا ہے کہ لوگوں کے ہاتھوں کا صدقہ ہم اہلبیت کے لئے جائز نہیں ہے۔ اگر ہمارے لئے یہ پابندی شریعت نہ ہوتی تو جیسے ان غریبوں کے ساتھ بیٹھ گئے تھے اور کھا نا کھا لیا تھا ہمارے ساتھ بھی کھا لیتے۔ یعنی اگر کل کھا لیا تھا تو وہ بھی قانون شریعت کی تشیل تھی اور اگر آج نہیں کھا رہے ہیں تو یہ بھی قانون الہی کی تشیل ہے اور اس کے بعد اسی اعجاز سے انہیں مدعو کیا۔ اپنے گھر لے گئے۔ فرمایا قبر بتاؤ گھر کے اندر کیا ہے؟ قبر نے گزارش کی مولا! کچھ پیسے ہیں اور کچھ سامان ہے، مگر وہ پیسے اور سامان آپ نے کسی ضرورت کے واسطے رکھوایا ہے فرمایا کوئی حرج نہیں۔ اس سے اچھی ضرورت کیا ہے کہ بندگان خدا محتاج ہیں لہذا ان کے ساتھ اچھا برتاؤ ہو نا چاہئے۔ بالآخر جو بھی تھا وہ ان غریبوں کے حوالہ کر دیا۔ تو میں یہ گزارش کر رہا تھا کہ بظاہر واقعات بہت مختصر دکھائی دیتے ہیں مگر ان واقعات کی روشنی میں اسلامی کردار کو پہچانا جاسکتا ہے جو اہلبیت نے دنیا کے سلسلے میں کیا ہے اور بات تمام کرتے ہوئے ایک آخری فقرہ اور سن لیجئے کہ اسلامی اخلاق وہی ہے جس میں تعلیمات قرآن کو مجسم کر دیا جائے۔ یہ نہ کوئی ظاہری برتاؤ ہے اور نہ زندگی کا رکھ رکھاؤ ہے۔ نہ کوئی مظاہر ہے نہ کوئی ریاکاری ہے۔ اگر تعلیم قرآن کے مطابق ہے تو اس کا نام اخلاق ہے چاہے کتنے میں ہر معلوم ہو۔ اور اگر تعلیمات قرآن کے خلاف ہے تو چاہے دیکھنے میں اچھا دکھائی دے مگر اسی کا نام بد اخلاقی ہے۔ اس لئے کہ ہمارے یہاں اخلاق کا فیصلہ انسانی برتاؤ

سے نہیں جوتا ہے، قرآنی تعلیمات سے جوتا ہے۔ الہی تعلیمات سے جوتا ہے یعنی ہر وقت ہے کہ برتاؤ اچھا دکھائی دے مگر بد اخلاقی ہو، اور ہر وقت ہے کہ برتاؤ غلط دکھائی دے مگر اسی کا نام اخلاق پڑ جائے۔ اس لئے کہ پیغمبر یا اہلبیت پیغمبر یا فون الہی کے پابند ہیں، لوگوں کی پسند اور ناپسند کے پابند نہیں ہیں۔ ہم نے اخلاقی پیغمبر کے دو واقعات دیکھے ہیں کہ اغیار، پہلے ہوئے لوگ، گمراہ لوگ، راہ حق سے ہٹے ہوئے، علی جیسے بند خدا کو خدا کا بیٹا کہنے والے مگر جب پیغمبر کی محفل میں آگئے تو حضور کھڑے ہوئے کہ کیوں اس لئے کہ قرآن کی تعلیم ہے، جادہ کھڑے یا لیٹے ہی اُٹھتے ہیں جب بحث کرنے کا وقت آئے تو جیسے بحث کرو جو بہترین طریقہ ہو۔ اگر اس وقت ان کا احترام نہ کیا جائے گا تو یہ پہلے ہمیں بد اخلاق سمجھ لیں گے اور پھر ہماری بات کا اعتبار کیسے پیدا ہوگا۔ تو چونکہ مسلمانوں کو اخلاقیات کے سمجھانے کا ہے لہذا غیہ کیا تو کھڑے ہو گئے۔

مسلمانوں کو شاید برا لگتا ہو، مگر اسلام نے اسی کا نام اخلاق رکھا ہے اور اسی کا نام اخلاق ہے چاہے کسی کو برا لگے۔

اب تو معلوم ہو گیا کہ برا لگنا معیار نہیں ہے۔ قانون الہی معیار ہے۔ لہذا ہم نے بات پیغمبر میں دونوں منظر دیکھ لئے۔ اغیار آئے تو ان کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، اپنے آئے تو انہیں اٹھا دیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے لئے اٹھ کھڑے ہیں مذہب کا ہوا تھا۔ انہیں محفل سے اٹھا دینے میں مذہب کا تحفظ تھا۔ صلوات کر دار پیغمبر، کر دار آل محمد، سلوک سرکار سید الشہداء غریبوں کے ساتھ، مسکینوں کے ساتھ، فقیروں کے ساتھ، یہ اس بات کی بہترین علامت ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم ہے کر دار اہلبیت میں۔ امام حسین کی زندگی کو اگر پہچانا ہے تو آیت قرآن میں دیکھو۔

یہ تو غریبوں کا ذکر ہے۔ غریب تو پھر آزاد ہوتے ہیں۔ غلاموں کی تو کوئی اوقات نہیں ہوتی ہے آجنگ ساری دنیا جو ہنگامہ کر رہی ہے کہ اسلام نے چند دنوں کے میں غلامی کو کیوں قبول کر لیا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا یہ محسوس

jabir.abbas@yahoo.com

کر رہی ہے کہ غلامی کوئی بہت بڑی ذلت ہے، غلامی بہت بڑی حقارت ہے۔ لہذا اسلام کو روزِ اول ہی غلامی کے خلاف آواز اٹھائے اس کا خاتمہ کر دینا چاہئے تھا۔ گویا معاشرہ میں غلاموں کی کوئی اوقات نہیں تھی۔ مگر اسی معاشرے میں اگر اہلبیتؑ کا رہنا و غلاموں کے ساتھ دیکھا جائے تو اندازہ ہو گا کہ دنیا کے لوگوں نے آزاد افراد کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کیا ہے جو برتاؤ اہلبیتؑ نے غلاموں کے ساتھ کیا ہے اور اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ غلامی کا مزاج ہوتا ہے آزادی طلب ہونا۔ اسی لئے اسلام نے ہزار راستے آزادی کے نکالے ہیں۔

کفارہ میں غلام کو آزاد کر دو۔

کارِ خیر میں آزاد کر دو۔

غلاموں کو راستہ بتایا کہ اپنے مالک سے سودے کر لو اور پھر محنت و شقت کر کے اپنی آزادی کا انتظام کر لو۔

زکوٰۃ نکالنے والوں سے کہا۔ غلاموں پر صرف کرنا کہ یہ بیچارہ آزاد ہو جائیں۔ بہر حال غلامی کا مزاج ہوتا ہے آزادی طلب ہونا۔ یہ تنہا اہلبیتؑ کے غلاموں میں دیکھا ہے کہ اگر آزاد بھی کر دیا تو کوئی جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے۔

یہ ایک واقعہ نہیں، کتنے واقعات ہیں اہلبیتؑ کی زندگی میں۔ خود امام حسینؑ کا واقعہ ہے کہ غلام مولا کی خدمت میں آیا اور اس کے اعمال میں کچھ کوتاہی پیدا ہو گئی اُس نے محسوس کیا کہ ہمیں امام کو غصہ نہ آجائے۔ لہذا اس نے کہا **وَ اَلَا تَرَ اَنَّكَ لَمِنْ الْغَنِیَّةِ** خدا نے ان بندوں کی تعریف کی ہے جو غصہ کو پی جاتے ہیں۔ فرمایا ہاں ہاں میں نے غصہ کو ضبط کر لیا۔

کہا مگر خدا کہتا ہے **وَالْغَنِیَّةِ عَنِ النَّاسِ**۔ یہ وہ ہیں جو بندوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

فرمایا جاؤ میں نے معاف بھی کر دیا۔

کہا مگر خدا کہتا ہے **وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ**۔ خدا نیک عمل کرنے والوں

کو دوست رکھتا ہے۔

فرمایا جاؤ راہِ خدا میں آزاد کر دیا۔

امامؑ نے تو قرآن کی ہر آیت کو، ہر جملہ کو، ہر فقرہ کو مجسم کر دیا۔ مگر جب آزادی ل گئی تو اب غلام جانے کا ارادہ نہیں کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا کی آزادی میں وہ ذلت لےنے والی نہیں ہے جو آلِ محمدؐ کی غلامی میں ہے۔

آج مختصر سا تذکرہ چند محلوں میں انھیں افراد کا پیش کرنا ہے جو کہ بلا میں سماجی اعتبار سے اور معاشرتی اعتبار سے غلام تھے، مگر جین نے انھیں محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہ غلام ہیں۔

انھیں یہ خیال تھا کہ ہم میں کچھ کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ لہذا امام کے سامنے ان ساری باتوں کو رکھ دیا تاکہ دنیا میں سے مولا کے کردار کو پہچان لے۔

جب غلام آیا آقاؐ کے سامنے اجازت لینے کے لئے، اور فرزندِ رسولؐ نے فرمایا کہ

میں نے آج سب کو اجازت دے دی ہے جو بنا چاہے وہ چلا جائے۔ مگر غلاموں میں افزہ

کا ایک غلام چون ہے جو مولا کے سامنے کھڑا ہے۔ آپؐ نے فرمایا جان! انھیں تو معلوم ہے

کہ میں نے سب سے کہہ دیا ہے کہ جو جانا چاہے چلا جائے۔ میں مسلسل اعلان کر رہا ہوں کہ

یہ میرے خون کے پیاسے ہیں۔ یہ میری جان کے دشمن ہیں۔ جو جانا چاہے چلا جائے۔ ہر

ایک کی گردن سے میں اپنی بیعت کو اٹھائے لیتا ہوں۔ چون نے عیب فقرہ کہا۔ مولا!

جب اس زندگی میں کچھ آرام کرنا تھا تو آپ کے ساتھ رہا اور جب مصیبت کا وقت آیا

تو آپ کو چھوڑ کے چلا جاؤں؟ پیغمبرؐ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ مولا نے کائنات کی بارگاہ

میں روزِ قیامت کیسے جاؤں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ آپ کو چھوڑ کے چلا جاؤں۔ مجھے تو

آپ ہی کی خدمت میں رہنا ہے۔ یہاں تک کہ وقت آگیا اور قربانی کا مرحلہ سامنے آگیا

تو ہر آگے۔ کہا مولا اجازت دیدیتے؟ فرمایا کیسے چلنے دوں اے جون، میں نے تم کو اپنے

مار پیسے کی عیادت کے لئے رکھا ہے۔ اس لئے کہ خیامِ حینؑ کا جو عالم ہے ابھی میرے بیمار

کا ایک خدمت گزار چاہئے، ایک بیمار دار چاہئے۔ میں نے تم کو بیمار کی تیار داری کیلئے

jabir.abbas@yahoo.com

محفوظ رکھا ہے۔ اگر تم بھی چلے جاؤ گے تو میرے بیمار کی تیمارداری کون کرے گا۔ ہاں اگر بیمار کی اجازت دیدے تو میں روکوں گا نہیں۔ بس یہ سننا تھا عزیزو کہ جون آئے بغیر بیمار کی پشت پر اور آکے آواز دی۔ نیچی کے لال! بیمار لائٹ کے کانوں میں آواز جون کی آنکھیں کھول دیں۔ اسے یہ تو جون کی آواز ہے۔ خیر تو ہے۔ جون کیوں آئے؟ کہا مولا میں آقا کے سامنے گیا تھا۔ میدان میں جانے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ فرمایا میں نے تم کو بیمار کی خدمت کے لئے بچا کے رکھا ہے۔ آقا آپ فرمائیے آپ کیا کہتے ہیں۔ میں آپ کی خدمت کروں یا آقا پر قربان ہو جاؤں؟ ہاں رونے والو عابد بیمار نے یہ فقرہ سنا فرمایا: "جون اگر میرے مقدر میں نہیں ہے کہ میں باپ پر قربان ہو جاؤں تو کم سے کم تم ہی جا کے قربان ہو جاؤ، مجھے کوئی تیمارداری درکار نہیں ہے، مجھے کوئی خدمت درکار نہیں ہے۔" جون مولا کے سامنے آئے، دست ادب جوڑ کے کھڑے ہوئے۔ کہا آقا بیمار نے تو رخصت کر دیے اب آپ مجھے کیوں روکنا چاہتے ہیں؟ کیا اس لئے روکیں گے کہ میرا رنگ بیاہ ہے؟ کیا اس لئے روکیں گے کہ میرے پسینے سے لو آتی ہے؟ کیا میرا خون اس قابل نہیں ہے کہ شہیدوں کے خون میں شامل ہو جائے؟ بس یہ کہہ کے جون نے عجب فقرہ کہا۔ اسے میرے مولا! اسے نہ ہڑا کے لال! اگر میری محنت سچی ہے، اگر میرا جذبہ عملی صادق ہے۔ تو سہی کہ میرا خون بھی آپ کے خون میں شامل ہو جائے۔

حسین نے ٹکبیر سے لگایا۔ جون یہ کیا کہا جاؤ میں نے اجازت سے دی۔ چاہئے والا میدان میں آیا، راہ خدا میں چھا کر تاربا۔ مگر جب گھوڑے سے گرائے تو غلام غلام فوازی کی دو منڈلیں، دو غلاموں کا مذکرہ تفصیل کے ساتھ تاریخ کر بلا میں ہے۔ ایک جون ہیں اور ایک غلام اور ہے۔ دونوں کی زندگی کے دو واقعات دو لفظوں میں۔ اس سے زیادہ گزارش نہیں کروں گا۔ آپ کے رونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ جیسے ہی جون کی آواز کانوں میں آئی۔ مولا غلام دنیا سے جا رہا ہے۔ مگر ہرے کہ آپ جانتے ہیں سارے اصحاب حسینؑ گھروالوں سے پہلے کام لگے ہیں۔ صبح سے حملہ ادنیٰ سے چاہئے والے قربان ہو رہے ہیں۔ ظہر سے پہلے چاہئے والے قربان ہوتے رہے۔ ظہر کے بعد جو باقی رہے وہ قربان ہوتے رہے جب تک

ایک ایک ناصر، ایک ایک مددگار کام نہیں آگیا اس وقت تک بنی ہاشم کے جوانوں کی باری نہیں آئی۔ جون کا شمار اصحاب میں ہے یا انصار میں ہے یعنی جب جون کام آئے ہیں گھوڑے سے گئے ہیں تو عباسؑ موجود تھے، علی اکبرؑ موجود تھے، ہاشمی جوان موجود تھے۔ مگر مولا نے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ غلام کو اتنی ہی عزت دیدیتے کہ بیٹا تم چلے جاؤ، عباسؑ تم چلے جاؤ، برادران عباسؑ سے کہتے تم چلے جاؤ۔ ہاشمی جوانو! تم چلے جاؤ۔ نہیں کوئی نہ جا گیا میں خود جاؤں گا۔ مولا دوڑ کے مقتل میں آئے جون کا لاشہ اٹھانے کے لئے یہ ایک غلام نمازی تھی جس کو جون کی زندگی میں دیکھا۔ اور دوسرا غلام جب گھوڑے سے گر کر آواز دیتا ہے تو حسینؑ مقتل میں آئے مگر اس وقت پہنچے جب غلام غش کے عالم میں تھا۔ سر اٹھا کے زانو پر رکھا۔ چاہتے ہیں غلام کو پوش میں لایا جائے۔ مگر کوئی نقطہ آب تو نہیں ہے، رخسارہ پر رخسارہ دکھ دیا۔ اب جو حسینؑ کے آنسوؤں کی گرمی محسوس ہوئی تو غلام نے آنکھیں کھول دیں اسے مولا یہ کیا کر رہے ہیں؟ کہاں آپ کا رخسارہ مجھے پیغمبرؐ بوسہ دیتے تھے اور کہاں غلام کا رخسارہ؟ فرمایا تم نے راہ خدا میں قربانی دی ہے، یہ تمہارا حق ہے جو حسینؑ تمہارے ساتھ یہ برتاؤ کر رہا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

مجھے راستہ مل گیا

پھر میں ہدایت پا گیا

تجلی

تالیف

ڈاکٹر محمد التیجانی السماوی (تیس)

ترجمہ و تفسیر

علامہ السید فیضانِ حیدر جوادنی اعلیٰ الشہادہ

سید محمد علی پبلیکیشنز

بی۔ او باکس نمبر۔ 18168 کراچی 74700 پاکستان

چوتھی مجلس

خطابت امام حسین علیہ السلام

”حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ اس سے

محبت کرے جو میرے حسینؑ کو دوست رکھے“

سرکارِ دو عالمؐ کے اس ارشادِ گرامی کی روشنی میں عرفانِ حسینؑ کے حوالہ سے جو کلامِ آغازِ محرمؑ سے آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اس کے چوتھے مرحلہ پر کچھ باتیں خطابتِ امام حسینؑ صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ سے متعلق پیش کرنا ہیں۔

امام حسینؑ کے خطابت کو پیش کرنے سے پہلے چند لفظیں اصل موضوع ”خطابت“ سے متعلق۔ اگرچہ یہ لفظ ہمارے یہاں اتنا عام ہو گیا ہے کہ جس کے معنی بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی نہ کسی مقدار میں تمام مسنن والے لفظ خطابت سے باخبر ہیں۔ بلکہ

بعض حضرات اتنا باخبر ہوں جتنا واقعاً نہیں ہے۔ انسانی زندگی میں دو مرحلے ہوتے ہیں۔ ایک مرحلہ بات کی حقیقت کا پیش کرنا ہے، چاہے کسی کے لئے قابلِ قبول ہو یا نہ ہو۔ اور دوسرا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ بات کو دوسرے سے منسوب کیا جائے، اس کے دل میں اتار دیا جائے، چاہے اس کی کوئی حقیقت ہو یا نہ ہو۔

انسانی گفتگو میں دونوں طرح کی باتیں پائی جاتی ہیں۔ ایسے بولنے والے بھی آپ کو ملیں گے جو غلط کچھ بھی کچھ نہیں کہتے۔ ان کی ہر بات عقل و منطق کے مطابق ہر بات خفائے مطابقت اور ہر بات عقل کی میزان پر تلی ہوئی ہوتی ہے۔ مگر اس کے بعد ان کے اندر

jabir.abbas@yahoo.com

یہ صلاحیت نہیں ہوتی ہے کہ وہ اپنی سچی بات کو بھی دوسروں سے منواسکیں، اور ان حقائق کے بارے میں دوسروں کو مطمئن کر سکیں۔

اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی بات کو وہ خود بھی جانتے ہیں کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور شدائد سننے والا بھی اگر غور کرے تو اسے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ اس بات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لیکن ان میں بولنے کی ایسی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اسے بولنے سے سننے والے کو بہر حال مطمئن کر لیتے ہیں۔

خطابت درحقیقت اسی دوسرے رخ کا نام ہے جہاں انسان میں فطری اعتبار سے یافنی اعتبار سے اتنی صلاحیت پائی جاتی ہے کہ انسان اپنی بات سے دوسرے انسان کو مطمئن کر سکے، چاہے وہ خود بھی مطمئن نہ ہو۔ اگر آپ دور حاضر کی تاریخ خطابت کا جائزہ لیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ شاید یہ ایک بڑی جماعت اور ایک بڑی تعداد ہے جس میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ اپنی بات سننے والوں کو سمجھا بھی دیں اور اسے خواہی لیں یا

چاہے اپنے ضمیر کے اعتبار سے خود اس بات سے مطمئن نہ ہوں جس بات سے دوسرے کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ ساری بریشانی یہی ہے کہ کہنا وہ ہے جو لوگوں کے دل کو لگ جائے، لوگوں کو پسند آجائے، اس کے بعد خدا خوش ہوگا کہ ناراض ہوگا اس کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب تو آرام سے گذرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے۔ بہر حال یہ دونوں رخ انسانی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ خطابت کا تعلق دوسرے رخ سے ہے جہاں بات سے دوسرے کو مطمئن کیا جائے، اسے قائل اور تابع بنایا جائے

لیکن اگر اسی کے ساتھ ساتھ پہلا رخ بھی جمع ہو جائے تو یہی معراج خطابت ہے۔ یعنی انسان جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ واقعتاً سچی ہو، صداقت ہو، سچائی ہو، واقعیت ہو اور صلاحیت اتنی ہو کہ اس واقعیت کو انسان کے دل و دماغ تک پہنچا دے اور اس سے انسان کو مطمئن کر دے جب کہ عوام انسان غیر حقیقی باتوں سے جلدی مطمئن ہوتے ہیں اور حقائق سے دیر میں مطمئن ہوتے ہیں۔

یہ بولنے والے کا کمال ہوتا ہے کہ حقائق کو لوگوں کے دلوں میں اتار دے اور

حقائق سے سامعین کو مطمئن کر دے، یہی معراج خطابت ہے۔

دنیا کے سارے اہل خطابت میں اور مذہب کے ذمہ دار خطیبوں میں ایک نیا کی فرق یہی ہوتا ہے کہ بات سمجھنا سب کو آتا ہے، بات منوانا سب کو آتا ہے، ہمیں ان سب کو آتا ہے۔ مگر کتنے ایسے بھی ہیں کہ انھیں حقائق معلوم ہی نہیں ہیں، یا حقائق کا اظہار نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ مذہب کی ذمہ داری انسان کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ فطری کامظاہرہ بعد میں ہو، حقیقت بیانی پہلے ہو۔ پہلے حقیقت بیانی کی صلاحیت پیدا کر دے اس کے بعد اگر مالک نے بولنے کی طاقت دی ہے تو اس طاقت کو راجح حقیقت میں صرف کر دے۔ اوہام، خیالات، تصورات اور بے بنیاد باتوں میں خبردار صرف مت کرنا۔ یہ پروردگار عالم کی ایک امانت ہے جس کا نام ہے قوت خطابت۔ اور امانت میں خیانت بہر حال جائز نہیں ہے۔

مالک کائنات نے انسان پر جو سب سے پہلا احسان کیا ہے اور بتایا ہے کہ میری رحمت کا سب سے بڑا مرقع اور سب سے پہلا مرقع یہ ہے کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَیْکَ الْغَفَّارُ وہ رحمن ہے جس نے قرآن کی تعلیم دی ہے۔ انسان کو پیدا کیا ہے اور انسان کو قوت بیان دی ہے۔

خلقت کے بعد کسی احسان کا ذکر خدا نے کیا ہے تو وہ قوت بیان ہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ساری زندگی میں وہ عظیم احسانات ہیں۔ ایک وجود انسانی ہے اور ایک بیان انسانی ہے۔

جتنا بڑا احسان انسان کو پیدا کر دینا ہے اتنا ہی بڑا احسان انسان کو قوت بیان دے دینا ہے۔ در نہ جذبات ہوتے، خواہشات ہوتے، ضمیر میں باتیں ہوتیں، اور قوت بیان نہ ہوتی تو انسان لمحوں میں گھٹ کے مر جاتا۔

ایک تجربہ آپ نے دنیا میں کیا ہوگا کہ اگر کوئی انسان ایسا پایا جاتا ہے جو لوگوں کو بولنے کے لائق نہ ہو تو وہ بہرا بھی ہوتا ہے۔ یعنی یہ تو ہو سکتا ہے کہ آدمی بہرا ہو مگر کوئی لگا نہ ہو، لیکن ایسے افراد مشکل سے ملیں گے جو کچھ کہیں اور ہر سے نہ ہوں۔ یہ

پروردگار کا کہہ کر انسان پر کہ انسان نہ مٹنے مگر دل کی بات کہہ تو سکتا ہے اپنے جذبات کا اظہار تو کر سکتا ہے۔ لیکن اگر زبان نہ ہو جائے اور بولنے کے لائق نہ رہ جائے تو خدا ایسے انسان پر یہ احسان کرتا ہے کہ اس کی قوت سماعت کو بھی روک بیٹھائے مگر دوسرے کی باتیں سننے کا اور اپنی بات کہنے کے لائق نہ رہ جائے گا تو تھوڑی سی زمین میں گھٹ جاسکا اور انسان نہ ہو جائے گا۔ ایسے ہی حالات میں اندازہ ہوتا ہے کہ قوت بینائی کی نعمت پروردگار بہت صغیر ہے۔

یہ اتنا بڑا احسان الہی ہے کہ اللہ نے خلقت کے بعد اسے دوسرا احسان قرار دیا ہے۔

اس کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ قوت بیان میں اللہ نے کتنے شعبے قرار دیے ہیں۔ ایک لفظ کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا کہ مولا کے کائنات نے ارشاد فرمایا ہے کہ پروردگار عالم نے وجود انسانی پر جو احسانات فرمائے ہیں ان میں ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ دنیا میں کہیں گوشت کو بولنے نہیں دیکھا ہے۔ مگر اس نے اسی گوشت کو دہن میں رکھ دیا ہے تو قوت گویائی بھی دے دی ہے۔ یہ زبان کیا ہے ایک گوشت کا ٹکڑا ہی تو ہے۔ نہ اس پر کوئی جلد ہے نہ اس میں کوئی ہڈی پائی جاتی ہے۔ ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جسے پروردگار عالم نے قوت گویائی دیدی ہے۔ بولنے کی طاقت دیدی ہے اور اللہ کے اس احسان کا قیاس نہ دنیا کی کسی مشین پر کیا جاسکتا ہے اور نہ دنیا کے کسی ٹائپ رائٹر پر۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اکثر دفنوں میں یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ آپ عربی اور انگریزی دونوں خانہ بھر داکر لے آئیں۔ یعنی جو عربی والا خاندان ہے وہ بھی پڑ کر نہا ہے اور جو انگریزی والا ہے وہ بھی پڑ کر نہا ہے۔ آپ اس فارم کو پڑ کرنے کے لئے کسی دوکان پر گئے جہاں وہ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں جو فارم بھرنا جانتے ہیں۔ اب جو وہاں پہنچے تو ان سے کہا جائی کہ یہ فارم اس طرح بھرا جائے کہ جو عربی والا خاندان ہے وہ بھی بھر جائے اور جو انگریزی والا ہے وہ خانہ بھی بھر دیا جائے۔ ہم نے دیکھا کہ وہاں دو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔

پلے ایک نے ہمارے فارم کو لیا، اس نے سارے فارم کو بھر دیا۔ اس کے بعد اسی خانہ کو بڑھا دیا دوسرے کی طرف۔ اب اس نے کھانا شروع کر دیا۔ جس نے کہا کیا آپ تنہا یہ کام نہیں کر سکتے ہیں دو آدمی کریں گے تو دھیرے سے ہانگیں گے۔ آپ انہیں اس کو کر دیں گے تو شاید کوئی ڈسکاؤٹ ہو جائے۔ کہنے لگے: ہاں! پاس جو مشین ہے جو ٹائپ رائٹر ہے اس میں انگریزی کے حروف پائے جاتے ہیں، لہذا ہم نے انگریزی والا ٹائپ کر دیا ہے اب آپ ان کے پاس لے جائیں وہ عربی والا ٹائپ کریں گے۔ یعنی اس کے حروف الگ ہیں اس کے حروف الگ ہیں۔ اس کے آلات الگ ہیں اس کے آلات الگ ہیں۔ یعنی ایک مشین دوسرے کام نہیں کر سکتی ہے۔ مگر ایک انسان جو عربی بھی جانتا ہے، اردو بھی جانتا ہے، انگریزی بھی جانتا ہے، اس کے وجود میں کتنی مشینیں فٹ کی گئی ہیں کہ ایک ہی زبان جو آپ کو اللہ نے دی ہے اسی زبان سے ابھی آپ ٹکڑے اردو والے سے بات کر رہے تھے کہ ایک لمحہ کے بعد ادھر ٹکڑے عربی بولنے لگے۔ ایک لمحہ کے بعد ادھر ٹکڑے انگریزی بولنے لگے ادھر ٹکڑے پنجابی میں بات کرنے لگے۔ ادھر چلے گئے پشتو میں بات کرنے لگے۔ ہر آدمی حیرت زدہ ہے، یہ کتنی مشینیں اندر فٹ کر دی گئی ہیں۔

لاکھوں کا سرمایہ خرچ کرنے کے بعد جو ایک مشین بنائی جاتی ہے وہ اس زبان میں کام آئی تو اس لمحہ میں کام نہ آئی۔ اس زبان میں کام آئی تو اس زبان میں کام نہ آئی۔ اور اگر کوئی مشین کام بھی اگلی تو لفظوں میں کام آئی لمحہ میں کام نہیں آئی مگر پروردگار عالم نے جو قوت بیان انسان کو دی ہے اس زبان میں اتنی طاقت دیدی ہے کہ لفظیں بھی اسی میں پائی جاتی ہیں، لہجے بھی اسی میں پائے جاتے ہیں کوئی مشین ایسی نہیں ہے جو ہمارے لہجہ کی ترجمانی کر سکے۔ لفظیں تو ہماری سب ٹائپ ہو گئیں مگر ہم یہ لفظیں کیوں ٹائپ کر رہے تھے۔ یہ الفاظ ہم نے بطور احترام کہے تھے یا بطور توہین کہے تھے یہ مشین کا کام نہیں ہے۔ یہ اللہ نے صلاحیت صرف زبان کو دی ہے۔ اگر اس نکتہ پر آپ غور کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ دیکھنے میں راجہ جوتا سا

jabir.abbas@yahoo.com

وجود ہے مگر وہ با برکت وجود ہے کہ جذبات گھٹ جاتے اگر یہ وجود نہ ہوتا، انسانی لیجوں میں فرق واضح نہ ہو سکتا اگر بیان کی ترجمانی نہ ہو سکتی اگر یہ وجود نہ ہوتا، انسانی لیجوں میں فرق واضح نہ ہو سکتا اگر یہ وجود نہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے مولا نے فرمایا ہے **الْمَرْءُ بِأَخْبَرِ نَبِيٍّ** انسان کی وجہ کا دار و مدار دو چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے۔ ہاتھ کی وہ اہمیت نہیں ہے، پیروں کی وہ قیمت نہیں ہے۔ دو چھوٹی چیزیں ہیں ایک اندر رکھ دی گئی ہے۔ ایک باہر رکھ دی گئی ہے۔ اندر دل رکھا گیا ہے۔ باہر زبان رکھی گئی ہے۔ انھیں دونوں پر انسانی کمال کا دار و مدار ہے۔ اندر اس کا دل ہے جس میں معلومات ہیں، جذبات ہیں، خواہشات ہیں۔ اور باہر وہ زبان ہے جو ان جذبات کا اظہار کرتی ہے۔ اگر جب انسانیت کا دار و مدار انھیں دو پر ہے تو جب تک ان کے تعلقات ٹھیک رہیں گے کام انسانیت کے مطابق ہوتا رہے گا اور جب ان میں جھگڑا شروع ہو جائے گا تو کام تباہ ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کی پہچان، یہی یہ قرار دی گئی ہے کہ جو دل میں ہوتا ہے وہ زبان پر ہوتا ہے اس کے خلاف نہیں ہوتا ہے۔ اور منافق کی پہچان یہ ہے کہ زبان پر کچھ اور ہوتا ہے اور دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔

پرو و رکاز عالم نے انسانیت کا دار و مدار انھیں دو پر رکھ لیا ہے جتنا انھیں ہم آہنگ بنا دو گے اتنی ہی انسانیت ترقی کرتی جائے گی۔ صلوات
تو یہ قوت بیان جو پرو و رکاز نے انسان کو عنایت فرمائی ہے اسی قوت بیان کے ایک کرسٹے کا نام ہے "خطابت"۔

اسی قوت بیان سے آپس کی باتیں بھی ہوتی ہیں، اسی قوت بیان سے ملازمت بھی ہوتی ہے، اسی قوت بیان سے جذبات کا اظہار بھی ہوتا ہے اور اسی قوت بیان کے ایک شعبے کا نام ہے خطابت۔ جہاں انسان کو مالک اتنی صلاحیت دیدیتا ہے کہ وہ اپنی بات سے دوسروں کو مطمئن کر سکتا ہے۔ تو اگر پرو و رکاز عالم نے انسانوں میں یہ صلاحیت رکھ دی ہے کہ اپنی بات کو منوا سکتے ہیں تو جن کو خدا ہی ہے اپنی بات منوانے کے لئے، انسانیت کو پیغام خدا سنانے کے لئے، بشریت

راہ حق پر لانے کے لئے۔ انھیں خدا جو قوت بیان دے گا وہ یقیناً عام انسانوں کی قوت بیان سے زیادہ ہوگی۔

سب کی قوت بیان میں اور ان کی قوت بیان میں فرق یہ ہوگا۔ کہ سب کی قوت بیان جب ظاہر ہوگی تو اسے بلاغت کہا جائے گا، اور ان کی قوت بیان جب سامنے آئے گی تو اسے رنج بلاغت کہا جائے گا۔ صلوات

ہمارا آپ کا بیان، ہماری آپ کی گفتگو اور ہماری آپ کی تقریر بلاغت کی حدوں میں آسکتی ہے لیکن بلاغت کا رنج نہیں بن سکتی ہے، بلاغت کا راستہ نہیں قرار آسکتا ہے۔ یہ پرو و رکاز عالم کے وہ بندے ہیں جن کو مالک نے اسی مقصد کے لئے ہمارا کمال عالم انسانیت کو پیغام الہی سے مطمئن کریں۔ لہذا ان کو وہ صلاحیت بیان دے دی ہے جو دنیا میں کسی اور انسان کو حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضائل و مناقب کا اعلان فرمایا تو فرمایا کہ میرے امتیازات میں ایک امتیاز خدا نے یہ رکھ لیا ہے کہ مجھے "جوامع الکلم" عنایت فرمائے ہیں۔ ایسے علم مجھے سکھائے ہیں کہ لفظ ایک ہی ہوگا مگر معنی میں اتنی جامعیت ہوگی کہ اک کا ناسخ یعنی ہوگی جو لغتوں کے اندر سمٹ جائے گی۔

بہر حال خطابت کا کام ہوتا ہے اپنی بات سے دوسروں کو مطمئن کر دینا، اپنی بات کو لوگوں کے دلوں میں اتار دینا۔ چاہے بات صحیح ہو یا غلط ہو۔ صحیح ہو جائے تو کمال خطابت ہے لیکن اگر خطابت نہیں ہے خطابت کا کام ہے فقط مطمئن کر دینا۔ اب اگر اتنی بات آپ کے ذہن میں ہے تو میں قرآن مجید کی انھیں آیات کو چن کر سامنے آئی ہیں آپ کے سامنے بڑھائے پھر پڑھنا چاہتا ہوں تاکہ آپ اللہ کے بندوں کی خطابت کے انداز اور اللہ کے ناسخوں کی خطابت کے انداز میں فرق محسوس کر سکیں۔ ان کی خطابت اور ہے، ناسخوں کی خطابت اور ہے۔ بندوں کی خطابت، ایسا ناسخ جو اپنے سننے والوں کو مطمئن کر لے، چاہے صحیح ہو یا غلط۔ لیکن ناسخوں کی خطابت میں یہ کچھ نہیں ہے۔ وہ مطمئن بھی کر لیں گے اور جو بات کہیں گے وہ

jabir.abbas@yahoo.com

سچی اور واقعی ہوگی۔ اَلْخَلْقُ وَهُوَ رَحْمَنٌ ہے۔ عَلَّمَ الْقُرْآنَ اس نے قرآن کی تعلیم دی ہے۔ خَلَقَ الْإِنْسَانَ انسان کو پیدا کیا ہے۔ عَلَّمَ الْبَيَانَ اُسے بیان سکھایا ہے۔ تو خلقت کے بعد بیان کا ذکر آیا جو اک عام طاقت ہے۔ جسے اللہ نے بندوں کو عبادت کیا ہے۔ لیکن نمائندوں کی طاقت کو پہنچانے کے لئے خلقت سے پہلے تعلیم قرآن کا ذکر کیا۔ یعنی خلقت کے بعد جن کا بیان سامنے آتا ہے وہ یہ سب بندے ہیں۔ اور جن کا علم قرآن پہلے ہے خلقت بعد میں ہے ان کا بیان سب سامنے آتا ہے تو بیان کی بنیادیں اسی قرآن پر ہوتی ہیں جس کا علم انھیں دیا گیا ہے اور وہ نمائندے ہیں۔ صلوات

گویا کچھ ایسے بندے بھی ہیں جنھیں مالک نے پہلے علم قرآن دیا ہے اس کے بعد اس دنیا میں بھیجا ہے اور وہ جب بیان کریں گے تو اس قوت بیان کی بنیاد قرآن اور کلام الہی ہوگا۔

ان کی خطابت اور ان کی تقریر میں خبردار کوئی بے بنیاد بات تلاش نہ کرنا اس کی بنیاد ہم نے خود بتا دی ہے۔ تو ہماری خلقت کے ساتھ خدا نے قوت بیان رکھی مگر علم نہیں رکھا ہے۔ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا ایسا پیدا کیا ہے کہ بالکل جاہل تھے۔ ہم دنیا میں آئے تو خدا نے بول بھیجا کہ بالکل جاہل تھے۔ ہمارے پاس خلقت اور خلقت کے ساتھ بیان تھا علم نہیں تھا۔ ان کے پاس علم علم کے بعد خلقت اور خلقت کے ساتھ بیان، تو دونوں کا فرق واضح ہو گیا کہ ہم بولیں گے تو اپنی مخلوق سے بولیں گے۔ جتنا سیکھتے جائیں گے بولتے جائیں گے۔

بچہ گو د میں ہے۔ کسی نے کہا ان کو ماں کہو۔ اس نے ماں کہہ دیا۔ کہا ان کو باپ کہو۔ اس نے باپ کہہ دیا۔ ماں نے گو د میں بٹھا کر کہا بٹھا کہو اللہ ایک اللہ ایک کہہ دیا۔ تو جو کہا جا رہا ہے اسی کو بچہ دہرا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے کی زبان کو مادری کہا جاتا ہے کہ جوں بتائی جاتی ہے وہی وہ دہراتا جاتا ہے۔ اب میں ایک لفظ کہوں گا شاید آپ کو یاد رہ جائے۔ جو ماں کے ہٹانے سے بات کو دہراتا

ہے۔ اس کی زبان کو ماں کی زبان کہا جاتا ہے اور جو خدا کے بڑھانے سے بات کو دہراتا ہے۔ اس کی زبان کو لسان اللہ کہا جاتا ہے۔ صلوات
یہ وہ نہیں ہیں جو دنیا کی سکھائی ہوئی باتوں کو دہراتے ہوں۔ یہ اپنا علم اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں پروردگار عالم نے انھیں علم قرآن دے کر بھیجا ہے۔ لہذا امتیاز ان کی گفتگو ہے سب قرآن کی ترجمانی ہے۔ قرآن کی تفسیر ہے۔ قرآن کی شرح ہے جب پروردگار عالم نے قرآن دے کر بھیجا اور ان کی ساری قوت بیان تفسیر قرآن ہے۔ تو جب ضرورت پڑے گی کہ قرآن کو کوئی مفسر دیا جائے تو کس کا نام لیا جائے گا یہی وجہ ہے کہ جب تک سرکارِ دو عالم رہے خود تفسیر قرآن کرتے رہے اور جب جانے لگے تو قرآن کو لاوارث نہیں چھوڑا ہے، نہ امت کے رحم و کرم پر چھوڑا ہے کتاب اللہ و عترتی اھل بیت میں کتاب خدا بھی چھوڑے جا رہا ہوں اور اہلبیت کو بھی چھوڑے جا رہا ہوں اس لئے کہ یہی وہ ہیں جو قرآن سے بولتے ہیں، یہی وہ ہیں جو قرآن کی ترجمانی کرتے ہیں، یہی وہ ہیں کہ جن کا ہر لفظ تفسیر قرآن حکیم ہے۔ لہذا بندوں کی زبان اور ہے نمائندوں کی زبان اور۔ یہ اللہ کے نمائندے ہیں تو بندوں کی خطابت پر نمائندوں کی خطابت کا قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے اور نمائندوں کی خطابت پر دنیا کے بندوں کا قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اسی ایک لفظ کو آپ ذہن میں رکھیں گے اور اسی سلسلہ بیان کو میں آخر تک پودھنا چاہتا ہوں۔ جو اللہ کے نمائندے ہیں ان کا لہجہ بھی، ان کا انداز بھی، ان کا اسلوب بھی، ان کا سلیقہ اور طریقہ بھی وہ ہے جو لوگوں کو مطمئن کر سکے، بات کو دل میں اتار سکے اور ان کی باتیں، ان کے حقائق اور ان کی گفتگو کا مواد جو دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ سب حقیقی ہے، منطقی ہے، عقلی ہے۔ اس میں کوئی بات نہ بے بنیاد ہے اور نہ کوئی بات ایسی ہے کہ جو فضا میں اڑ جانے کے قابل ہو۔ یہاں تک اس کے بعد اب خطابت کی ایک کمزوری بھی آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ قوانین اسلام کی مصلحتیں بھی ہم پہچان سکیں۔ اور وہ یہ ہے کہ جب انسانی خطابت

اور اس کی قوت بیان کا سب سے اچھا مصرف یہ ہے کہ انسان اپنی بات سے سب لوگوں کو مطمئن کر سکے۔ لیکن اس کمال کے اظہار سے ایک کمزوری انسان میں پیدا ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب انسان دیکھ لیتا ہے کہ لوگ ہماری بات سے مطمئن ہو جاتے ہیں، ہماری بات پر قانع ہو جاتے ہیں، ہماری بات مان لیتے ہیں تو اس وقت کمزوریاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔

پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ ذہن میں غرور پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے بچپن میں یہ سنا تھا لیکن نہ میں کل اس سے متفق تھا اور نہ آج متفق ہوں لیکن ہر حال بزرگ ہمیشہ ہی سکھایا کرتے تھے کہ اگر مجلس بڑھا دیکھنا ہو تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ منبر پر بیٹھنے کے بعد یہ سمجھو کہ سب سے بڑے بڑے گلے ہم ہیں، باقی بتنے بیٹھے ہیں سب جاہل ہیں تاکہ بولنا آجائے اور ہمت پیدا ہو جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جب بچے نے یہ سیکھ لیا تو واقعتاً ایسی ہمت پیدا ہو گئی کہ کتابیں پڑھنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی اور کہتے ہیں کہ چھپیس سال کی ریسرچ کا رزلٹ ہے جو آپ کو دے رہا ہوں۔ اگر کوئی پوچھ لے کہ کتاب کی نیچے کیا ہوتی ہے، کس زبان کی کتاب پڑھ لی ہے تو جواب دیتے نہ بن پڑے۔ لیکن ہر حال دھیرے دھیرے جب لوگ بات ماننے لگتے ہیں تو یہ خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ انسانی ذہن میں غرور پیدا ہو جائے۔ اور دوسرا عجیب غلط کام یہ ہے کہ انسان کو ہر وقت یہ فکر لگی رہتی ہے کہ سامعین خوش ہو جائیں، اس لئے کہ اس نے کل فن ہی یہی سیکھ لیا ہے کہ انہیں مطمئن کرنا ہے۔ لہذا اگر یہ سچ سے مطمئن ہوتے ہیں تو سچ بولو اور اگر جھوٹ سے مطمئن ہوتے ہیں تو جھوٹ بولو اور اس طرح کبھی جھوٹ بولنے کا باخلاف مرضی پروردگار بولنے کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ رضائے خدا ذہن سے نکل جاتی ہے اور بندوں کی رضا ذہن میں سما جاتی ہے۔

اگر دنیا کے کسی گوشے میں، کسی خطے میں خطابت کا کوئی عیب پایا جاتا ہے تو وہ عیب یہی ہے کہ بولنے والے کو ساری پریشانی یہی رہتی ہے کہ لوگ ہر سے خوش ہو جائیں۔ ہمارے سماج کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک مقام پر گئے تقریر

کرنے کے واسطے اور دیکھا کہ جو لوگ سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، بالکل ہی دین سے مذہب سے اللہ رسول نے کوئی رشتہ نہیں رکھتے ہیں۔ تو پیار سے سوجا کہ ان کو راہ حق پر لا جائے مگر شروع ہو گئے۔ یہ کام نہ کرو گے تو جہنم میں جاؤ گے، وہ کام نہ کرو گے تو جہنم میں جاؤ گے۔ ایسا کرو گے تو جہنم میں جاؤ گے، ویسا نہ کرو گے تو جہنم میں جاؤ گے۔ ایک پیارہ درمیان میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا حضور! کچھ جنت کی باتیں بھی کیجئے؟ کہا۔ وہاں کی بات من کے کیا کرو گے جہاں جانا ہی نہیں ہے۔ ارے اس جگہ کو پہچان لو جہاں جانا ہے تاکہ ابھی سے تیار ہو کے جاؤ۔ ظاہر ہے کہ جن کے پاس دین و مذہب نہیں ہے، ان کے پاس خطیب کا احترام کیا ہوگا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے ہی سب کو جہنم میں ڈھکیلنے کا ارادہ کیا دیسے ہی سب نے حملہ کر دیا کسی صورت سے بچاؤ وہاں سے جان بچا کے بھاگے۔ لیکن اس تلخ تجربے نے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ اب آئندہ جہنم کا نام ہی نہ لیا جائے گا۔ چنانچہ اب جو دوسرے گاؤں میں پہنچے تو وہاں جنت کا ذکر شروع کر دیا۔ کوئی کام نہ کرو یا نہ کرو جنت تمھاری ہے۔ دین دار ہو جاؤ جنت تمھاری ہے۔ بے دین ہو جاؤ جنت تمھاری ہے۔ ناز پڑھو جنت تمھاری ہے۔ ناز چھوڑ دو جنت تمھاری ہے۔ جو چاہو کرو جنت تمھاری ہے۔ ایک پیارہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا حضور! اگر ایسے ہی آپ سب کو جنت میں پہنچا دیں گے تو جہنم کیا ہوگا۔ کچھ جہنم کے بارے میں بھی تو بتائیے؟ کہا بھی جی میں جانتا تھا وہ جس نے بتا دیا ہے، باقی جب آپ جائیں گے تو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

تو انسانی کردار میں یہ عیب پیدا ہو جاتا ہے کہ انسان کی فکر ہوتی ہے کہ سننے والا کیسے خوش ہو جائے، کیسے مطمئن ہو جائے۔ لیکن یہ بندوں کی خطابت ہے۔ جو اللہ کے ہاتھ سے ہیں ان کی خطابت میں نہ وہ تصور پیدا ہو سکتا ہے اور نہ یہ تصور پیدا ہو سکتا ہے۔ غرور کا وہاں کیا گزر ہے جہاں مالک انھیں ساری کائنات سے بلند تر بنا دے اور انہیں اپنا بنادے کہ سیر الملائکہ بھی نہ جاسکے۔ اور پھر وہاں بھی جائے تو سر جبرہ مہرود ای میں رہ گئے اور پھر جن کو پروردگار نے اپنی مشیت کا ترجمان بنا دیا ہے ان کی زندگی

jabir.abbas@yahoo.com

میں غلط بیانی کا کیا تصور ہو سکتا ہے کہ وہ بندوں کو راضی کرنے کے لئے خدا کو ناراض کر دیں۔ یہ ہر ایک کے کردار میں ہو سکتا ہے، ناسندہ پروردگار کے کردار میں نہیں ہو سکتا ہے۔ مگر چونکہ ہمارے کردار میں یہ خطرہ تھا لہذا پروردگار نے اس کا بھی ایک انتظام کر دیا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ مسجدوں میں ایک مرکزی جگہ ہوتی ہے جس کا نام ہوتا ہے محراب اور اسی محراب کے برابر میں دو چار زینے یا کوئی نہ کوئی بلندی میں کیجانی ہے جس کا نام ہوتا ہے منبر۔ ہر مسجد میں یہ دونوں جگہیں پائی جاتی ہیں۔ مرکزی جگہ کا نام ہے محراب اور بلندی کو کہا جاتا ہے منبر۔

منبر کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ تین نیسے یا چار زینے کا ہو، بلکہ ہر وہ بلندی جہاں سے بات کہی جائے اسی کو منبر کہا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے یکڑی کا بنایا جائے، ہو سکتا ہے پتھر کا بنایا جائے، ہو سکتا ہے پلاٹک کا بنایا جائے، ہو سکتا ہے لوسے کا بنایا جائے اور مصلحت پروردگار ہو تو آدنوں کے کجاؤں کا بنایا جائے۔ ہر وہ بلندی جہاں سے بات کہی جاتی ہے اسے منبر کہا جاتا ہے۔ یہ وہ اسلامی طریقہ کار ہے جو سرکارِ دو عالم نے رائج کیا۔ کہ مسجد میں انتظام محراب ہی کیا اور انتظام منبر بھی کیا۔ اور پھر وہ نماز جس میں ہفتہ میں ایک دن ہی سارے مسلمانوں کو ایک مقام پر لاکر جمع کیا گیا یعنی نماز جمعہ۔ اس نماز جمعہ میں دونوں کا مصروف مقرر کر دیا۔

نماز جمعہ میں دونوں کا مصروف ہوتا ہے۔ نماز ظہر میں محراب کا کام آتی ہے منبر کا کام نہیں آتا ہے اور دو غلط کا وقت آجائے تو منبر کا کام آتا ہے محراب کا کام نہیں آتی ہے لیکن نماز جمعہ میں دونوں کا مصروف ہوتا ہے، منبر بھی کام آتا ہے اور محراب بھی کام آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جمعہ کی نماز ہوگی وہاں خطبہ بھی ہوگا اور کسی فقہ اسلامی میں یہ اجازت نہیں دی گئی ہے کہ کسی بیچارہ پرانے پڑھے فقیہ کو محراب میں کھڑا کر دیا جائے اور تیز طرار بولنے والے بلیغ انسان اور بہترین خطیب کو منبر پر کھڑا کر دیا جائے۔ بلکہ اسلامی قانون میں جو خطیب ہوگا وہی امام

ہی ہوگا۔ جو خطبہ پڑھے گا وہی امام بھی ہوگا۔ گویا اسلام نے ایک بہترین سلیقہ سکھا دیا ہے دونوں کے مصروف کا کہ لوگوں کے سمجھانے کے لئے وہ آئے جو محراب میں کھڑے ہونے کے لائق ہو اور نصیحت وہ کرے جو خود صاحبِ کردار ہو اور امانت وہ کرے جو نصیحت کرنے کے قابل ہو، یہ دو الگ دنیا میں نہیں ہیں۔

ہماری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم نے امامت کو عدالت سے مربوط کر دیا ہے اور خطابت کو عدالت سے آزاد کر دیا ہے، حالانکہ اسلام کا مزاج یہ نہیں ہے اسلام نے دونوں کو ساتھ رکھا ہے۔ دونوں کو الگ کرنے کا فساد یہ ہے کہ منبر تقویٰ سے الگ ہو گیا ہے۔ کردار سے الگ ہو گیا ہے۔ دینداری سے الگ ہو گیا ہے۔ کتنے بالائی دنیا کے ایسے ہوں گے جو منبر کے اوپر آکر بیٹھ جاتے ہیں اور محراب کے قابل نہیں ہوتے ہیں اور خدا کو الگ کرنے والوں نے مصلحتاً ہی الگ کیا تھا اور اسلام نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے کہ وہی خطابت کرے گا اور وہی امامت بھی کرے گا تاکہ معلوم ہو جائے کہ جیسے امام بننے کے واسطے عدالت ضروری ہے ویسے ہی خطیب بننے کے واسطے بھی کردار چاہئے، دینداری چاہئے۔ ایسا نہیں ہے کہ جو چاہے نفرت کرنا شروع کر دے اور جو چاہے کہنا شروع کر دے۔ اگر صاحبِ کردار نہ ہوگا تو اس کی امت کا اثر کس پر ہوگا اور دوسروں کو دعوت عمل کیسے دے گا۔

اس کے بعد ایک مسئلہ جو میں گزارش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں ایک ہی آدمی خطیب بھی ہے اور امام بھی ہے وہاں بھی دونوں کاموں میں ایک فرق ہے کہ جب آدھ سے آدھ رخ کرتا ہے تو خطیب کہا جاتا ہے۔ یعنی جب اس کا رخ بندوں کی طرف ہوتا ہے تو اسے خطیب کہا جاتا ہے اور جب بندوں سے منہ موڑ کے آدھ رخ کرتا ہے تو اسے امام کہا جاتا ہے۔ آدمی تو نہیں ہوتے ہیں آدمی ایک ہی ہوتا ہے۔ لیکن خطیب اور امام میں فرق یہ ہوتا ہے کہ جب تک ہماری طرف رخ کر کے خطیب ہے کہا جاتا ہے مولانا ابھی خطبہ پڑھ رہے ہیں اور پھر تھوڑی دیر کے بعد خطبہ ختم ہو گیا ہے تو نماز شروع ہو گئی۔ کیسے معلوم ہوا؟ کہا دیکھتے نہیں مجمع سے منہ موڑا۔ تو

jabir.abbas@yahoo.com

جب ادھر رخ ہوتا ہے تو خطیب ہوتا ہے اور جب رخ ادھر ہوتا ہے تو امام ہوتا ہے۔ لیکن یہ دو طرح کے کیرکڑ نہیں ہیں، دو طرح کے کردار نہیں ہیں، دو طرح کے کام ہیں ایک کام کا نام ہے خطابت، جو مجمع کی طرف رخ کر کے انجام پاتا ہے۔ اور دوسرے کا نام ہے امامت جو ادھر رخ کر کے انجام دیا جاتا ہے۔ اب پروردگار پرچا ہوتا ہے کہ کام بٹ جائیں لیکن کردار نہ بٹنے پائے۔ لہذا خطیب سے کہا کہ جیسے ہی بندوں کی طرف رخ کرو پہلے کہو **بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ** یعنی خطبہ شروع کرو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کرو، تاکہ یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ ادھر سے نماز گئے ہیں تو اُسے بھول گئے ہیں۔ آپ خطبہ جمعہ کے احکام پڑھ لیجئے گا رسالہ علیہ میں اس میں لکھا ہے کہ واجبات میں یہ ہے کہ محمد پروردگار کرے۔ ایسا نہ ہو کہ جب بندوں کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو گئے تو خدا کو بھول گئے اور صرف مومنین کو امام یاد رہے۔ ان کا ذکر تو بعد میں آئے گا۔ پہلے کہو **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ** تاکہ ہر مومن والا محسوس کرے کہ رخ ادھر ہے مگر ذہن ادھر ہے۔ اور جب رخ محراب کی طرف کیا تو اسلام نے دوسرا انتظام کر دیا۔

اگر دور سے آواز آجائے یا اللہ! اگر آخری صف سے آواز آجائے یا اللہ! تو رکوع کو طول دو **سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَلِیِّ عَزَّ وَجَلَّ وَبِحَمْدِہٖ**۔ **سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَلِیِّ عَزَّ وَجَلَّ وَبِحَمْدِہٖ** تاکہ یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ ادھر گئے تو ادھر والوں کو بھول گئے صلوات ادھر رخ کرو تو محمد پروردگار کرو تاکہ خدا ذہن سے نہ جانے پائے۔ ادھر رخ کرو تو کمزوروں کا خیال رکھو تاکہ بندے ذہن سے نہ جانے پائیں۔ ہم نے ایک انسان کو دو کام اسی لئے حوالہ کئے ہیں تاکہ ہر انسان اپنے اندر یہ جامعیت پیدا کرے۔ خدا کو لے کے بندوں کو بھول جائے اور نہ بندوں کو لے کے خدا کو بھول جائے۔ جو اس نکتہ کو نہ سمجھے وہ یہی سوچتے رہے کہ جب سائل کو انگوٹھی دے دو

تو نماز کا کیا ہو گا؟ یہ بیچارے یہ سمجھ کر نماز بندوں سے غافل ہونے کا نام ہے۔ کیا خبر کہ یہی کمال نماز ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ خدا نے علیؑ کی ولایت کے اعلان کے

وہ موقع منتخب کیا جہاں نماز بھی ہو اور کوفہ بھی ہو۔ نماز علامت ہے کہ ادھر ہے۔

کوفہ علامت ہے کہ ادھر ہے۔ صلوات

اب بات آگئی ہے تو ایک آخری جملہ اس سلسلہ کا اور سن لیجئے اور اس کے بعد ہذا فقرے اپنے اس موضوع سے متعلق گزارش کروں گا۔

گویا کمال امامت یہی ہے کہ بندوں کو ساتھ لے کے چلو۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری امت کا قانون ہے کہ امام اگر پستی میں ہو تو ماموم بلندی پر ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ماموم پستی میں ہو تو امام بلندی پر نہیں ہو سکتا ہے، اس لئے کہ امام کا کام ہے کہ قوم کو بلند بنائے۔ امام کا کام یہ نہیں ہے کہ قوم کے کاندھوں پر خود بلند ہو جائے۔ صلوات

یہاں تک اگر آپ توجہ میں تو ایک آخری لفظ اور سن لیجئے۔ یہ ہفتہ دار اجتماع ہو گیا تھا جس کی بہت سی برکتوں سے ہم آپ محروم ہو گئے ہیں غیبت امام کی بنیاد پر۔ پروردگار عالم وہ وقت لائے جب وہ منظر عام پر آجائیں اور عالم اسلام واقعی برکتوں سے فائدہ اٹھا سکے۔ انشاء اللہ المستعان۔ یہ نماز مسلمانوں کے اجتماع کے لئے ہے، اس کا اور کوئی پس منظر نہیں ہے۔ لہذا کہا گیا کہ جن کو ہم نے بلایا ہے پہلے ان کو سمجھاؤ اس کے بعد مصلیٰ پڑاؤ۔ اور اس کے بعد جو نماز عید کے دن ہوتی ہے یہ ایک چینی کے روزے کی توفیق کا شکر ہے۔ لہذا پہلے خدا کا شکر ادا کرو کہ بندوں سے بات کرو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جمعہ کا خطبہ پہلے ہوتا ہے اور نماز بعد

میں ہوتی ہے۔ اور عید کا سجدہ پہلے ہوتا ہے اور خطبہ بعد میں ہوتا ہے۔ صلوات اتنی باتیں جو آپ کے ذہن عالی میں ہیں ان کا پتھر دو لفظوں میں یہ ہے کہ خطابت ایک انداز بیان ہے اور ایک سلیقہ ہے جو پروردگار عالم عنایت کرتا ہے۔ اس سلیقہ کو صحیح راستے پر لگانا یہ ہماری آپ کی ذمہ داری ہے۔ مگر جو ناسدگان پروردگار ان کو اللہ نے یہ سلیقہ دیا ہے کہ وہ ہمیشہ صحیح راستے ہی میں لگائیں گے، کبھی غلطی سے نہیں لگا سکتے ہیں۔ اس کے بعد اب ائمہ ظاہرین کی زندگی پڑھیں، سرکارِ دو عالم کی امت کا جائزہ لیں، حضور کے خطبے، مولائے کائنات کے خطبے جن کا مجموعہ ہمارے سامنے

”نہج البلاغہ“ کی شکل میں موجود ہے۔ امام حسینؑ کے خطبات جن کا مجموعہ ہمارے سامنے موجود ہے اور جس آخری مرحلہ میں آپؑ ہی کے خطبات میں سے چار فقہ گزارش کر کے بیان کرتا ہے کہ دینا چاہتا ہوں جن خطبوں کے فقرات کا تعلق ہے واقعہ کربلا سے۔ یوں تو زندگی میں امام حسینؑ کے خطبات بہت ہیں لیکن یہ چار خطبات ہیں جن کا تعلق واقعہ کربلا سے ہے، جہاں امام حسینؑ نے قوم کو خطاب کر کے، لوگوں کی طرف رخ کر کے انھیں حقائق سے آگاہ کرنا چاہا ہے۔ میں چار ہی جملے بناؤں گا۔ کتابیں موجود ہیں جہاں آپؑ ان کا مطالعہ کریں۔ خود میری کتاب بھی ہے اور دیگر کتابیں حضرات علمائے تفصیلی بھی ہیں انھیں پڑھیں۔ میں اجمالی طور پر اس لئے تارہا ہوں کہ جب کتاب پڑھیں آپؑ، تو اس کتاب سے مطالب کو نکالنے میں سہولت ہو۔

ایک موقع تھا جب امام حسینؑ کے سر سے نکل رہے تھے، ہر ایک کو یہ خیال تھا کہ مدینہ چھوڑا تھا کہ مدینہ خطہ کی جگہ ہے۔ مدینہ میں پناہ نہیں مل سکتی ہے۔ تو کمرہ چھوڑا ہے ”مَنْ دَخَلَ كَانَتْ آمِنًا“ جو جہاں آجائے اس کے لئے امن و امان ہے۔ اب حسینؑ مکہ چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں، لہذا فرزند رسولؐ نے اپنا فریضہ سمجھا کہ لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے کہ میں مکہ چھوڑنے کیوں جا رہا ہوں۔

یہ پہلا موقع تھا جب امام حسینؑ نے راہ کر بلا میں، کر بلا جلتے ہوئے خطبہ ارشاد فرمایا کہ کی سرفروں پر اپنے قیام کی بنیادوں کو سمجھانے کے لئے اور اس میں یہ بھی یاد دہانی کی گئی تھی کہ میرے جد بزرگوار کی تعلیم کیا تھی، میرے جد بزرگوار کی ہدایات کیا ہیں۔ جن ہدایات پر عمل کرنے کے لئے اب میں مکہ چھوڑنے کے حقائق جا رہا ہوں۔ اس کے بعد دوسرا موقع آیا جب امام حسینؑ کی ملاقات ہوئی محکمہ لشکر سے۔ اس موقع پر امام حسینؑ کے دو خطبے ہیں پھوٹے پھوٹے۔ مگر دونوں میں حقائق ہیں۔ پہلا خطبہ امام حسینؑ نے لشکر سے خطاب کر کے فرمایا کہ میں خود نہیں آیا ہوں، میرا راستہ روکنے آئے ہو۔ تمھارے خطوط میرے پاس آئے ہیں۔ تم نے مجھے بلایا ہے، تم نے مجھے وطن سے باہر نکالا ہے، اب اس کے بعد تم میرا راستہ روکنا چاہتے ہو۔ آخر

کون سا طریقہ ہے۔ امام کے اس مختصر خطبے کا بہر حال اتنی مقدار میں اثر یقیناً ہوا کہ جب وقت نماز آگیا اور نماز کے لئے امام نے فرمایا کہ تم میں نماز ادا کرنے جا رہا ہوں۔ تم بھی اپنی قوم کے ساتھ، اپنے سپاہیوں کے ساتھ نماز ادا کرو کہ مسلمان تم بھی ہو، کلمہ پڑھتے ہو اور ہر مسلمان کو نماز پڑھنا چاہئے۔

ترے کہا کہ فرزند رسولؐ! یقیناً یہ میرے سپاہی ہیں، میں ان کا سردار ہوں، میں ان کا امیر و رئیس ہوں، مگر یہ ناممکن ہے کہ میں آپ کے ہوتے ہوئے نماز پڑھاؤں۔ آپ نماز پڑھا نہیں گئے میں بھی آپ کے پیچھے نماز پڑھوں گا اور یہ لشکر بھی پڑھے گا۔ یہ امام حسینؑ کے خطبہ کا پہلا اثر تھا۔ جہاں امام حسینؑ نے نماز پڑھائی اور جب نماز تمام ہو گئی تو اس کے بعد پھر گفتگو شروع ہوئی یہاں تک کہ نماز عصر تمام ہو گئی۔ اب لوگ آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو پھر امام حسینؑ نے ایک مختصر خطبہ ارشاد فرمایا۔ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ میرے جد بزرگوار نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی ظالم بادشاہ کو دیکھے جو تمام خدا کو حلال بنا رہا ہے، عبد خدا کو توڑ رہا ہے اور پیغمبر اسلامؐ کے کردار کی مخالفت کر رہا ہے اور اس کے بعد چپ رہ جائے تو اس قابل ہے کہ خدا اس کو جہنم میں ڈال دے۔ اور انھیں معلوم ہے کہ بزرگوار کا در کیا ہے، انھیں معلوم ہے کہ تمھارے حاکم کا در کیا ہے۔ میرے جد بزرگوار کی ہدایت ہے کہ ایسے موقع پر مسلمان خاموش نہیں رہ سکتا ہے لہذا قیام واجب ہے۔ میں اپنے واجب کو ادا کرنے کے لئے اٹھا ہوں۔

تیسرا موقع ہے کہ ملائکہ میدان میں امام حسینؑ نے روز عاشورہ دو خطبے ارشاد فرمائے ہیں۔ ایک خطبہ اول صبح امام حسینؑ نے ارشاد فرمایا اور وہ خطبہ میدان میں جا کے نہیں بلکہ خیمہ گاہ کے سامنے۔ اور دوسرا خطبہ تھا جو امام حسینؑ نے اس کے بعد میدان میں صعب دشمن کے سامنے آکے ارشاد فرمایا تھا۔ پہلا خطبہ تھا خیمہ گاہ سے قریب اور دوسرا خطبہ تھا میدان میں آئے کے بعد۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ امام حسینؑ نے جب پہلا خطبہ پڑھا ہے تو امام حسینؑ ناقد

jabir.abbas@yahoo.com

پر تھے اور جب دوسرا خطبہ پڑھا ہے تو امام حسینؑ گھوڑے پر تھے۔ یہ ساری باتیں وہ ہیں کہ اگر انسان غور کرے تو اندازہ ہوتا ہے کہ خطابت کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اس فریضہ کو ادا کرنے کے لئے انسان کو کتنا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

پہلا خطبہ امام نے ارشاد فرمایا جب آپؑ پشت ناقہ پر تھے۔ اور دوسرا خطبہ ارشاد فرمایا جب آپؑ پشت فرس پر تھے۔ اتنا فرق تو آپؑ لوگ جانتے ہیں کہ میدان جنگ میں جو جانور استعمال ہوتے ہیں ان میں گھوڑا شامل ہے ادھر شامل نہیں ہے۔

امام حسینؑ نے پہلا خطبہ ناقہ کی پشت پر ارشاد فرمایا۔ اس لئے کہ پہلا ہی خطبہ پشت فرس پر فرمایا جس کے تو دشمن کو خیال ہو گا کہ امام حسینؑ جنگ کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ امام حسینؑ چاہتے ہیں کہ پہلے مجھ پر تمام کیے جائیں لہذا اتنا اہتمام کیا کہ سواری بھی وہ استعمال نہ کی جو جنگ میں کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا پیغام پشت ناقہ سے دیا جاسکتا ہے پشت فرس سے نہیں دیا جاسکتا ہے۔

اب آئیے دیکھیں مضمون کیا ہے۔ فرمایا اَلَيْسَ بِنُوفٍ مِّنْ اَنَا۔ دشمنو! فوجو! شام والو! میں کچھ نہیں کہنا چاہتا ہوں، صرف اتنا کہ چھٹا چاہتا ہوں کہ اگر تم مجھے جانتے ہو تو بتاؤ کہ میں کون ہوں؟ میرا نسب بتاؤ۔ میری سببیں بتاؤ۔ مجھے پہچان لو کہ میں کون ہوں۔ اور اگر نہیں پہچانتے ہو تو میں پہچانے دیتا ہوں۔ میں تمہارے نبیؐ کی بیٹی کا بیٹا ہوں۔ مجھ سے لڑنا چاہتے ہو۔ مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ میرے نانا کا کھڑے ہونے کے بعد مجھے ذبح کرنا چاہتے ہو۔ پہچان لو میں تمہارے نبیؐ کی بیٹی کا بیٹا ہوں۔ اگر اب بھی نہیں پہچانا تو جن جن شخصیتوں کو پہچانتے ہو سب کو پہچانو۔ نبیؐ کو جانتے ہو وہ میرے نانا ہیں۔ حمزہؑ کو جانتے ہو وہ میرے باپ کے چچا ہیں۔ جعفرؑ کو جانتے ہو وہ میرے چچا ہیں۔ کس کو پہچانتے ہو۔ جتنی شخصیتیں اسلام میں گذری ہیں میں ساری شخصیتوں کا ایک نام لے رہا ہوں۔ یعنی مجھ سے جنگ، تنہا مجھ سے جنگ نہیں ہے۔ مجھ سے جنگ، حمزہؑ سے جنگ ہے۔ جعفرؑ سے جنگ ہے۔ مجھ سے جنگ، پیغمبر اسلامؐ سے جنگ ہے۔ اب بھی فیست ہے مجھ سے پہچان لو۔

لیکن اس کا کیا جواب ملا وہ آپؑ کو معلوم ہے حملہ اولیٰ شروع ہو گیا اور تیغ پر ہوا کہ امام حسینؑ قتل میں آئے اور آپؑ نے اپنے چاہنے والوں کو دیکھا تو بچاؤ لاشے چاہنے والوں کے خاک پر پڑے ہوئے تھے۔

بس عزیز و بیان تمام ہو رہا ہے، چند منٹ کے اندر مجلس تمام ہو جائے گی جب امام حسینؑ نے دیکھ لیا کہ حملہ شروع ہو گیا۔ جنگ کا آغاز ہو گیا، تو اب دوسرا خطبہ پڑھنے کے لئے پشت فرس پر سوار ہو کے آئے، فوج دشمن کے سامنے آئے اور اس کے بعد فرمایا:

اَکْشَاهُ هُوَ اَوْ يَرِى نَاقَتِي قَدْ تَحْتَقِيقُ مِثْلَ مَا اسْتَنْصَحْتُمْ بِهٖ دُرَّ اَبْرَءُ يَرَاكَ كَهْ اَكْرَبَا هُجْرًا مِّنْ تَلَوَّارِ كَيْفَ لَوْ يَا ذَلَّتْ بِرَدَّ اَشْتِ كَرُلُوں اور علیؑ کا بیٹا ذلت برداشت نہیں کر سکتا ہے، فاطمہؑ کا لال ذلت برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ لہذا میں آگیا ہوں۔ حجت تمام ہو چکی ہے۔ اب میں تلوار چلانے کے لئے تیار ہوں۔ اب میں جہاد کرنے کے لئے تیار ہوں۔

یہ ہے امام حسینؑ کے خطبوں کا خلاصہ جو میں نے آپؑ کے سامنے عرض کر دیا۔ مگر اس کے ایک ایک لفظ نے کتنا اثر کیا کہ جب درخیمہ کے قریب خطبہ پڑھ رہے تھے تو آواز سننے میں جا رہی تھی۔ کہرام برپا ہو گیا سیدانہوں میں، بیبیوں میں۔ اسے مولا مرنے کی خبر سن رہے ہیں، شہادت کی خبر سن رہے ہیں۔ تیغ یہ ہوا کہ ہر خاتون کا جگر بڑھ کر قریبی جوش اڑنے لگا۔

میں سیدانہوں کا ذکر نہ کروں گا، علیؑ کی بیٹیوں کا کہہ کر دے تو بہت بلند ہے۔ جو باہر کے افراد ہیں ان پر حسینؑ کی تقریر کا اثر کیا ہوا۔ بس تین جملے سنیں اور اس کے آگے کچھ گزارش نہ کروں گا۔

ایک منظر یہ دیکھا کہ جب بیٹا میدان میں جانے لگا اور ایک لمحہ کے لئے ٹھہر کے روہ سے باتیں کرنے لگا تو ماں نے پکار کے کہا بیٹا! کیا یہ زوجہ سے باتیں کرنے کا وقت ہے؟ جاؤ اور جا کے فرزند رسولؐ کے قدموں پر قربان ہو جاؤ۔ ورنہ اگر بنی ہاشم کا کوئی آدمی بھی کام آگیا تو میں شہزادیوں کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاؤں گی۔

یہ مانتا ہے مانتا، جو بیٹے کو میدان میں مرنے کے لئے بھیج رہی ہے۔ یہ پہلا اثر تھا۔

دوسرا اثر یہ دیکھا کہ جب شوہر میدان میں آگیا اور وہ سب نے جہاد شروع کر دیا تو ایک مرتبہ آپٹ محسوس کی۔ اب جو پلٹ کے دیکھا تو کیا دیکھا کہ زوجہ چلی آ رہی ہے۔ کہا مومنہ! ابھی تو مجھے لے کے مولائے پاس گئی تھی۔ یہ میدان میں کیوں آگئی؟ کہا تھا کہ جلسے کے بعد جب میں خیمہ میں گئی تو میں نے دیکھا کہ مولائے کسی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور فریادیں ہیں واغیربتاؤ۔ واقفہ ناہنراہ! ہائے میری غربت میرے چاہنے والے مرے جارہے ہیں۔ اسے وہب، کیا یہ نظر دیکھ کر میں نیچے میں بیٹھ جاؤں؟ یہ نہ ہو سکے گا۔ وہ ایک مانتا کا کردار تھا کہ بیٹے کو میدان میں بھیج دیا۔ یہ زوجہ کا کردار ہے کہ شوہر کے ساتھ میدان میں آگئی۔

اب ایک تیسرا کردار دیکھئے کہ امام حسینؑ متقل سے خیمہ گاہ کی طرف آرہے ہیں۔ دیکھا خیے کا پردہ اٹھا اور ایک بچہ خیمہ گاہ سے برآمد ہوا۔ آتے ہوئے بچے کو دیکھ کر فرمایا۔ حبیب ذرا اس بچے کو روکو۔ دیکھو یہ کہاں جا رہا ہے۔ حبیب آگے بڑھے۔ بچے کو کلیجے سے لٹایا۔ کہا بیٹا کہاں جا رہے ہو؟ کیا ارادہ ہے؟ کہا جا رہا ہوں مولائے قدوں پر سر قربان کرنے کے لئے! حبیب نے کہا ذرا پہنچو! تو کہ تم کون ہو؟ بچہ نے اپنا تعارف کرایا۔ حبیب بچے کو لے کے مولائے کے سامنے آئے۔ بس اولاد دار آخری جملہ۔ میری بہنیں بھی سن رہی ہیں اللہ ان کی اولاد کو سلامت رکھے۔ یہ کرلا ہے کرلا۔ جہاں مائیں یوں بچوں کو قربان کرتی ہیں۔ کہا بیٹا کیا ارادہ ہے؟ کہا جا رہا ہوں آپ پر جان قربان کرنے کے لئے! کہا بیٹا ابھی تو میں تیرے باپ کو روک کر آ رہا ہوں۔ اسے میرے لال! تیری ماں کے لئے تیرے باپ کا صدر بہت کافی ہے۔ اب یہ نیا غم کیوں دینا چاہتا ہے؟ کہا مولائے یہ کیا فرما رہے ہیں، مجھے سجا یا کس نے مجھے مجھے میدان میں جانے کے لئے تیار کس نے کیا ہے؟ میری ماں نے مجھے سجا کے بھیجا ہے۔ حسینؑ روکنا چاہتے تھے کہ پس پردہ سے آواز آئی۔ مولائے! اک بیوہ کا دلیر ہے، رو

نہ کیجئے صگا۔ سنو سنو تار بچ کر بلا۔ ایک واقعہ ادھر سلم کلال ادھر عروین جنادہ۔ بیٹا میدان میں آیا، جہاد کرتا رہا۔ ماں دیکھ کر پکڑی ہوئی آواز دے رہی ہے۔ شاباش میرے لال۔ شاباش میرے لال۔ مولائے قربان ہو جا بیٹا۔ تاکہ ماں منہ دکھانے کے لائق ہو جائے۔ بیٹا جنگ کر رہا تھا۔ اک مرتبہ ظالموں نے گھیرا۔ جب بچہ خاک پر گرا تو سر تلک کر کے ماں کی طرف پھینکا۔ ماں نے بڑھ کے بچے کا سر اٹھایا۔ خون کو صاف کیا اور غسل کی طرف پھینک دیا۔ آواز دی ہم جو کچھ راہ حق میں دیدیتے ہیں پھر واپس نہیں لیتے ہیں۔ شاباش میرے لال، تو نے میدانوں کے سامنے ماں کو سر خود کر دیا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

پانچویں مجلس محبت امام حسین علیہ السلام

"حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔ اللہ اُسے دوست رکھے جو میرے حسین سے محبت کرے۔"

سرکارِ دو عالم کے اس ارشادِ گرامی کی روشنی میں "عرفانِ حسین" سے متعلق جو سلسلہ کلام آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا اس کے پانچویں مرحلہ پر کچھ باتیں محبتِ حسین ابن علی سے متعلق گزارش کرنا ہے۔ اس لفظ سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اس موضوع کے دو درج ہیں۔

لفظ "محبت حسین" کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اگر حسین سے محبت کی جائے تو محبت کا مرتبہ کیا ہے۔

اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اگر حسین کسی سے محبت کریں تو اس محبت کا مرتبہ کیا ہوگا۔ اور اس انسان کی حیثیت اور شخصیت کیا ہوگی کہ جس سے فرزندِ رسولِ ثقلین امام حسین محبت کریں۔

میں اس گفتگو میں یہ دونوں باتیں آپ کے سامنے گزارش کروں گا اور اس سلسلہ میں چند ضمنی مسائل پر بھی آپ توجہ دیں گے۔

ایک سلسلہ یہ ہے کہ محبت کسے معنی کیا ہیں؟

اور دوسرا سلسلہ یہ ہے کہ محبت کے اسباب کیا ہیں؟

عَلَمَدَارِ کربلا مَوْلَا عَبَّاسؑ کے معجزات

تحقیق و پیشکش
عَالِیہ ایوب

عصمت پبلیکیشنز

بلی۔ او بکس نمبر۔ 18168 کراچی 74700 پاکستان

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ محبت کا نتیجہ کیا ہے اور آخری مسئلہ یہ ہے کہ تمام محبتوں کے درمیان محبت جین کا مرتبہ کیا ہے؟
تہدید کی طور پر اس نکتہ کو آپ ذہن میں رکھیں کہ اس دنیا میں جتنے بھی اعمال انجام دیئے جاتے ہیں ان کی تین قسمیں ہوتی ہیں:
بعض اعمال وہ ہیں جو امتیوں کے شایانِ شان ہیں، پیغمبروں کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ اور بعض پیغمبروں کے شایانِ شان ہیں، مگر پروردگار کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

ہر ایک کا اپنا ایک مرتبہ ہے۔ ہر ایک کی اپنی ایک منزل ہے اور اس کا عمل اسی کی منزل اور اسی کے مرتبہ کے مطابق ہوگا۔

مثال کے طور پر کائنات کو پیدا کرنا، کائنات کو زندہ رکھنا یا اُسے فنا کر دینا، بندوں کو روزی دینا، یہ سارے کام پروردگار کے ہیں۔ ان کا تعلق بندوں سے نہیں ہے۔ سجدے کرنا، نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا، بندگی کرنا، عبادت کرنا، یہ کام بندوں کے ہیں۔ ان سے پروردگار کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی لئے آپ کو یاد ہوگا کہ جب فرزند رسول امام علیؑ ابن موسیٰ الرضاؑ اور عیسائی عالم کے گفتگو ہو رہی تھی اور اس نے مسلمانوں کو دعوت اتحاد دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہمارے پیغمبر کو ہم بھی پیغمبر مانتے ہیں اور مسلمان بھی پیغمبر مانتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے پیغمبر کو مسلمان مانتے ہیں اور ہم عیسائی نہیں مانتے ہیں۔ لہذا اتحاد اور مصالحت کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ جن پیغمبر پر دونوں متفق ہیں اُسے مان لیا جائے اور جس پیغمبر کی رسالت میں اختلاف ہے اُسے چھوڑ دیا جائے۔

تو امام نے فرمایا کہ ہم مسلمان جس عیسائی پر ایمان رکھتے ہیں وہ آخری پیغمبر نہیں تھے بلکہ آخری پیغمبر کی بشارت لینے والے تھے لہذا کسی ایک عیسائی پر دونوں کا اتفاق نہیں ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اگر انصاف کرو تو جناب عیسیٰؑ کو بھی ہم ہی مسلمان مانتے ہیں تم عیسائی تو انھیں مانتے بھی نہیں ہو۔ مگر ہرے کر جذباتی طور پر اسے غصہ کرنا چاہتے ہو۔

کائنات پر الزام، اتنا بڑا اتہام۔ ہم عیسائی کہے جاتے ہیں اور آپ ہم سے کہتے ہیں کہ عیسائی کو نہیں مانتے ہیں۔ آپ مسلمان کہے جاتے ہیں اور آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ آپ عیسائی کو مانتے ہیں، یہ کیسی بات آپ فرما رہے ہیں؟

فرمایا یہ بھی کوئی ماننا ہے کہ عیسائی کو تارک الصلوٰۃ کہا جائے بے نمازی کہا جائے، اور یہ خود کہا جائے، بے عمل کہا جائے۔ کسی نبیؐ خدا کو ماننے کا یہی طریقہ ہوتا ہے؟

اس نے کہا یہ آپ مسلمانوں کا الزام ہے ہم پر۔ ہم عیسائی کو ایسا نہیں مانتے ہیں۔ ہم عبادت گزار مانتے ہیں۔ سجدہ گزار مانتے ہیں۔ نمازی مانتے ہیں۔ روزہ دار مانتے ہیں۔

اور یہ سب کچھ مان کے پروردگار مانتے ہیں۔ صلوات اگر کوئی بندگی کرنے والا ہے، عبادت کرنے والا ہے، سجدہ گزار ہے، تو وہ بندہ

پروردگار کیسے ہو جائے گا؟ اس کا نام بندہ خدا ہوگا فرزند خدا نہیں ہوگا۔ تو میں یہ گزارش کروں گا کہ کچھ کام بندوں کے ہیں جو خدا نہیں کرتا ہے اور کچھ کام خدا کے ہیں جو بندہ انجام نہیں دیتا ہے۔ اور یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں صرف

الفاظ کے لئے اشارۃً ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں، جن کے ذہن میں بات ہے وہ وہ محسوس کر لیں گے۔ بندوں کے کام الگ ہیں، خدا کے کام الگ ہیں۔ بندوں کی شان الگ ہے، خدا کی شان الگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کو لوگ بندہ خدا مانتے

ہے، تیار نہیں تھے پروردگار نے اس کے وجود میں بندگی کا انتظام کیا۔ اور جس کو لوگ خدا مانتے والے تھے اللہ نے اس کے سلسلہ میں وہ انتظام کیا کہ کوئی خدا نہ مانے۔ واقعات آپ کے سامنے ہیں۔ مادرِ جناب عیسیٰؑ خاندانِ تھیں۔ یہ خاندان کعبہ

میں تھا لیکن بہر حال بیت المقدس بھی اللہ ہی کا گھر ہے۔ مگر جب عیسیٰؑ کی ولادت کا وقت آیا تو وہاں پروردگار کا۔ مزیم باہر جاؤ، یہ خاندان عبادت ہے، یہ خاندان ولادت نہیں ہے۔

دوسرا منظر یہ ہے کہ کینز خدا گھر سے باہر ہے اور دیو امیں در بنا کر بلا یا جائے۔ خدا اندر آ جاؤ۔ خدا یا کیا اب یہ گھر خاندان عبادت نہیں ہے۔ کیا یہ کوئی زچہ خاندان

مالک نے کہا مجھے نہ سمجھاؤ۔ میں دونوں کی مصلحتوں کو جانتا ہوں۔ عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہا جانے والا تھا۔ ان کے معاملہ میں پکے دلے انھیں بیٹا کہنے والے تھے۔ لہذا میں نے کہا مریم پر چلی جاؤ تاکہ یہ نالائق یہ نہ کہنے پائیں کہ جس کا بیٹا تھا اس کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ علیؑ کو کوئی بیٹا کہنے والا نہیں تھا۔ علیؑ کو ہر سکا ہوا نصیری خدا کہنے والا تھا۔ لہذا ہم نے کہا کہ بنت اسد اندر آ جاؤ تاکہ نصیری کی آنکھ کھل جائے کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ بندہ ہوتا ہے خدا نہیں ہوتا ہے۔ صلوات

تو میں یہ گزارش کر رہا تھا کہ کچھ کام بندے انجام دیتے ہیں، ان کا خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور کچھ کام خدا کرتا ہے اس کا بندوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر بندوں میں بھی کاموں کی تقسیم ہے۔ کچھ کام ایسے ہیں جو انبیاء و شایانِ شان ہیں، پیغمبروں کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ اور کچھ کام ایسے ہیں جو پیغمبروں کے شایانِ شان ہیں، انبیاء و شایانِ شان نہیں ہیں۔ گویا کام دنیا میں تین طرح کے ہیں:

۱۔ عام انسانوں کے کام الگ ہیں۔

۲۔ پیغمبر کے کام الگ ہیں۔

۳۔ خدا کا کام الگ ہے۔

جب ہم نے یہ اندازہ کر لیا کہ کام بٹے ہوئے ہیں۔ جو کام خدا کے کرنے کا ہے وہ نبی نہیں کرتا ہے۔ جو کام نبی کے کرنے کا ہے وہ کام امتی نہیں کرتا ہے، اور جو کام پیغمبروں کا ہے وہ امتی نہیں کرتا ہے۔ تو اس کے بعد ہم نے محبتِ حین کو دیکھا۔ تو ہمیں ایک ایسا کام مل گیا جو سب کے شایانِ شان ہے۔ درمیان میں حسینؑ ابن علیؑ ہیں۔ خدا بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ نبی بھی ان سے محبت کرتا ہے اور امتی بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ محبتِ حین اس بلند مرتبہ عمل کا نام ہے، جو بندوں کے بھی کام آتا ہے، خدا بھی وہی کام انجام دیتا ہے اور نبی بھی وہی کام کرتا ہے۔ دائرہ بہت وسیع ہے اور مرکز ہے ذاتِ حسینؑ ابن علیؑ۔ صلوات

اور اگر نصیری بات کا اندازہ میرے بعض بچوں کو نہیں ہو سکا ہے، تو میں ذرا اور وضاحت سے گزارش کروں کہ ملکہ محبتِ حینؑ ابن علیؑ کا اتنا عظیم ہے کہ وہ نہ ہر محبت ایسی نہیں ہے۔ کتنے افراد ایسے ہیں جن سے عام لوگ محبت کرتے ہیں۔ مگر سرکارِ دو عالم محبت نہیں کرتے ہیں اور کتنے افراد ایسے ہیں جن سے سرکارِ محبت کرتے تھے مگر لوگ محبت نہیں کرتے تھے۔ حسابات سب بٹے ہوئے ہیں۔ ان کے محبوب الگ ہیں دنیا والوں کے محبوب الگ ہیں۔ کتنے ایسے انسان ہیں کہ جن سے خدا ہمیشہ محبت کرتا رہا مگر بندگان خدا محبت نہیں کرتے۔ اور کتنے ایسے افراد ہیں جو بندوں کی نظر میں انتہائی محبوب ہیں، مگر خدا کی نگاہ میں دیکھنے کے بھی لائق نہیں ہیں۔ تو جب محبتوں کی یہ تقسیم دیکھ لی اور اس کے بعد حسینؑ ابن علیؑ کو دیکھا تو محبت کرنے والا پیغمبر پر اعلان کر رہا تھا "جو حسینؑ سے محبت کرے خدا اُس سے محبت کرے گا" یعنی حسینؑ تنہا میرا محبوب نہیں ہے۔ بلکہ یہ محبوب کر دگار بھی ہے۔ اور دیکھو تنہا یہ حسینؑ محبوب نہیں ہے بلکہ اگر تم اس سے محبت کرو گے تو تم بھی محبوب کر دگار بن جاؤ گے۔ صلوات

ذکر آگیا ہے قیامت کو مکمل کرنے کے لئے دو فطری اور گزارش کردوں۔ یہ تنہا ایک محبتِ حینؑ ہی کی بات نہیں ہے بلکہ اگر آپ غور کریں گے اور قرآن مجید کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ بہت سے کام ایسے ہیں کہ پروردگارِ عالم نے اپنے اور بندوں کے درمیان مشترک رکھا ہے اور انھیں کاموں کے ذریعہ شخصیتوں کو پہچنوا یا ہے۔

یہ تو میں نے محبت کی ایک مثال دی ہے درندہ دوسری مثال صلوات کی بھی ہے کہ پروردگار نے فرمایا ذرا میرے حبیب کو بیچاؤ! اس کا مرتبہ یہ ہے کہ:

"إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ"

اس صلوات میں خدا بھی شریک ہے، ملائکہ بھی شریک ہیں۔ اور اسے ایمان والو! اگر شریکِ عمل خدا بننا چاہتے ہو تو تم بھی پیغمبر پر صلوات بھیجو۔

jabir.abbas@yaho

یہ پیغمبر کی غفلت کی علامت ہے کہ خدا بھی نبی کے لئے صلوٰات پڑھے، ملائکہ بھی پڑھیں اور امتیوں کو بھی حکم دیا جائے۔
یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ اس کے بعد جب دشمنوں کی باری آئی تو وہاں بھی کوئی الگ نہیں رہا۔ **يُكَفِّرُهُمُ اللَّهُ وَيُغْنِيهِمُ اللَّهُ عَنِ الْكَافِرِينَ** ایسے لوگ بھی ہیں جن پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔

صلوات

میں چاہتا ہوں اس لفظ پر آپ توجہ دیں گے دشمنانِ خدا سے بیزاری اور دشمنانِ خدا اور رسول پر لعنت کرنا یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، بہت بڑا کام ہے۔ یہ کام اللہ انجام دیتا ہے اور آپ صاحبانِ ایمان ہیں شاید اس بات کو بہت جلدی محسوس کر لیں گے۔ نماز سے بڑا اسلام میں کوئی عمل نہیں ہے۔ فروغِ دین یا اولِ نماز کا ذکر آتا ہے لیکن اتنا عظیم عمل جن پر بنیادِ دین قائم ہے۔ یہ تحفظِ دین ہے۔ یہ عبادِ دین ہے۔ رکنِ مذہب ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ کام ہے جسے بندے کرتے ہیں خدا انہیں کرتا ہے۔ اتنا مقدس اور پاکیزہ عمل مگر بندے پڑھتے ہیں خدا انہیں پڑھتا ہے۔ اور لعنت کا عمل اس قدر پاکیزہ ہے کہ اس میں بندوں کے ساتھ خدا بھی شریک ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کیسے کہا جائے کہ یہ کوئی ذلیل عمل ہے۔ ذلیل عمل بندے کر سکتے ہیں خدا انہیں کر سکتا ہے۔ صلوٰات

دشمنانِ خدا سے بیزاری، دشمنانِ خدا پر لعنت، یہ نہ کوئی خبیث عمل ہے اور نہ کوئی گھٹیا عمل ہے۔ اتنا طیب و طاہر اتنا پاکیزہ عمل ہے کہ جس کو پروردگار انجام دیتا ہے، جس کو مالک کائنات انجام دیتا ہے۔ اور اس سے زیادہ سمجھنا چاہتے ہیں تو یوں پہچان لیجئے کہ جس کام میں ذرا کمزوری کا شہ پہتا ہے وہ کام ڈھکے چھپے انجام دیا جاتا ہے۔ سرِ یدان نہیں ہوتا ہے۔ مگر لعنت ایسا مقدس کام ہے کہ جس کے لئے پیغمبر گھروالوں کو میدان میں لے کر آگئے تھے۔ صلوٰات

کون سا مشکل کام تھا جہاں عیسائیوں سے مسجد میں بحث ہو رہی تھی، وہیں حضور فرمادیتے کہ مانتے ہو تو مارو ورنہ تم پر خدا کی لعنت۔ قصہ ختم ہو جاتا۔ مگر نہیں جیتک بحث تھی۔ علی یاتیں ہو رہی تھیں۔ آیات پڑھی جا رہی تھیں تب تک بنو مسجد کے اندر باتیں ہو رہی تھیں اور جب فیصلہ لعنت کے ہاتھوں میں آیا تو بندہ کہہ کی بات نہیں رہی، مسجد کے اندر کا مسئلہ نہیں رہا۔ اب میدان میں آجاؤ کہ یہ کام اتنا عظیم ہے جو صرف بتوں کے کرنے کا ہے اور نہ صرف بوڑھوں کے کرنے کا ہے، نہ صرف مردوں کا ہے اور نہ صرف عورتوں کا ہے۔ سب کے کام ہے ہوتے ہیں گریہ کام اتنا مشترک ہے کہ جو بزرگ ترین ہے وہ بھی شامل ہے، جو جوان ہے وہ بھی شامل ہے، جو بچے ہیں وہ بھی شامل ہیں اور جو عاتقون ہے وہ بھی شامل ہے۔ صلوٰات

بلکہ مباہلے کی آیت آپ کے سامنے ہے۔ پیغمبر نے اسے بھی اللہ ہی کا کام قرار دیا ہے **فَنَجَّيْنَاهُ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ**۔

یعنی اصل کام تو خدا ہی کا کام ہے۔ اب جو خدا کے راستے پر چلنا چاہتا ہے وہ اسے اختیار کر لے، ورنہ اصل کام یہ پروردگار کے انجام دینے کا ہے۔ تو میں بگڑاؤں کر رہا تھا کہ محبتِ حسین ابن علی ایک اتنا عظیم عمل ہے کہ حسین سے خدا بھی محبت کرتا ہے، رسولِ خدا بھی محبت کرتا ہے اور صاحبانِ ایمان بھی محبت کرتے ہیں۔ آسمان کے فرشتے بھی محبت کرتے ہیں اور زمین کے بندگان خدا بھی محبت کرتے ہیں۔

اسلام کو ایک ایسا محبوب مل گیا ہے جو سب کا محبوب ہے اور کتنا بڑا قیمت وہ مسلمان ہے کہ جس کے حق میں حسین نہ آئے اور کتنی خوش قسمت وہ قوم ہے کہ جس کے حسین میں آگئے۔ جسے درمیان میں رکھ دیا جائے تو سب چاہنے والے ہوں گے اور سب کا محبوب ایک ہی ہوگا۔ صلوٰات

بس عزیزانِ محرم! محبتِ حسین ابن علی ایک انتہائی عظیم شے ہے۔ جس کی قدر و قیمت انسان کو پہچانا چاہیے کہ اللہ اور رسول سب حسین سے محبت کرتے ہیں۔ اب اس کے بعد دوسرا مرحلہ آتا ہے کہ محبت کے دوطریقے ہوتے ہیں اور اس کے

دو طرح کے آثار ہوتے ہیں۔ محبت اپنے چھوٹے سے بھی کی جاتی ہے اور اپنے سے بڑے سے بھی کی جاتی ہے۔ ماں باپ کو اولاد سے محبت ہوتی ہے اور اولاد کو ماں باپ سے محبت ہوتی ہے۔ لیکن دونوں کی محبتوں کے آثار میں ذرا فرق ہوتا ہے۔ اور دونوں کے اثرات کے نام الگ الگ ہیں۔ آپ کو اپنی اولاد سے محبت ہے اور بڑا کہتا ہے کہ میں چاکلیٹ چاہئے۔ آپ گئے بازار سے لے آئے۔ بچے کی بات بڑے نے مان لی۔ آپ کا چھوٹا بھائی ہے اس نے آپ سے مطالبہ کیا کہ آپ امارات میں رہتے ہیں، وہاں چیزیں بہت اچھی اچھی ملتی ہیں کچھ ہمارے واسطے بھیج دیجئے۔ آپ نے کہا چھوٹا بھائی ہے ہم اس سے محبت کرتے ہیں اس نے تقاضا کیا ہے اسلئے بھیج دیا۔

اس کے برخلاف کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں اپنے بزرگ سے محبت ہے۔ اپنے استاد سے محبت ہے۔ اپنے شہر کے حاکم سے محبت ہے۔ اپنے شہر کے عالم سے محبت ہے۔ اپنے خاندان کے بزرگ سے محبت ہے۔ تو جو انہوں نے فرمایا وہ بھی کر دیا مگر دونوں کے نام الگ الگ ہیں۔

جب بڑے سے محبت کر کے اس کی بات پر عمل کیا تو اس کا نام رکھا اس اطاعت اور جب چھوٹے سے محبت کر کے اس کی بات مان لی تو اس کا نام رکھا اس ناز برداری۔ اسے اطاعت نہیں کہا جاتا ہے مگر کام ایک ہی ہوتا ہے۔

یہ ہیں اس لئے گزارش کر رہا ہوں کہ عام طور سے لوگ جو میں آکے کہہ دیتے ہیں کہ محبت کا ایک ہی اثر ہوتا ہے اطاعت۔ اور اس کے بعد پھر یہ خبر پڑا کر یا جانا ہے کہ اگر محبت کا اثر اطاعت ہے تو جب پیغمبر حسین سے محبت کریں گے تو کیا پیغمبر کی اطاعت کریں گے؟ اگر خدا حسین سے محبت کرے گا تو کیا خدا حسین کی اطاعت کریں گے؟ نہیں عزیز! محبت کا ایک ہی اثر ہوتا ہے اور وہ ہے بات کا مان لینا۔ لیکن بتاؤ ان کی دو قسمیں ہیں۔ چھوٹے کی بات مانی جاتی ہے تو اسے ناز برداری کہا جاتا ہے، اور بڑے کی بات مانی جاتی ہے تو اسے اطاعت کہا جاتا ہے۔

حسین کو خدا سے محبت ہے۔ خدا کو حسین سے محبت ہے۔ یہ محبت طرہی ہے۔ تو اس کے اثرات کیا ہیں؟

حسین کو خدا سے محبت ہے تو پوری زندگی میں ایک حکم خدا ڈھونڈ نکالو جسے حسین نے نہ مانا ہو۔ حسین ابن علیؑ نے جب سے دنیا میں قدم رکھا ہے اور عرصہ عاشر تک ایک موقع تلاش کرو جہاں خدا نے حسین سے کچھ کہا ہو اور حسین نے نہ مانا ہو۔ تو اب میں گزارش کروں گا کہ خدا یا! جب بندہ نے تجھ سے محبت کی تو وہ تو اطاعت میں اتنا کامل ثابت ہوا کہ تیری کوئی ایک بات نہ ٹال سکا۔ تو جب تو بندہ سے محبت کرے گا تو تیری شانِ محبت کا ہونے کا کیا اچھا باب ڈھونڈ کے کوئی ایسی جگہ بتاؤ جہاں حسین نے تجھ سے کچھ کہا ہو اور میں نے نہ مانا ہو۔ صلوات

اگر حسینؑ کے کردار میں کوئی ایسا موقع نہیں آیا جہاں حسین نے میری بات کو نہ مانا ہو تو مجھے بھی دیکھو میری سنت و سیرت میں بھی کوئی ایک موقع ایسا نہ ملے گا جہاں میرے حسین نے مجھ سے کوئی بات کہی ہو اور میں نے اس کی بات کو ٹال دیا ہو۔ اگر وہ اطاعت میں کامل ہے تو میں ناز اٹھانے میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ وہ بندہ ہے اس کا کام اطاعت کرنا ہے۔ میں پروردگار ہوں میرا کام اپنے بندہ کا دل رکھنا ہے۔ شاید ہی جسے کچھ کہہ کر سارے انسان جب دعا کرتے ہیں تو کوئی دعا قبول ہوتی ہے اور کوئی رد ہو جاتی ہے لیکن جو خدا کے معصوم بندے ہیں ان کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی ہے۔ تو کیا ان کی خدا سے کوئی رشتہ داری ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ سب اب الدعوات ہیں تو صرف اس لئے ہیں کہ جو عزت و خدا کے ساتھ کرتے ہیں وہ کوئی دوسرا نہیں کرتا ہے۔ اور تمھارا کالی کرنا صرف یہ ہے کہ تم نے میری بات کو جان بوجھ کے نہیں ٹھکرایا، مگر کبھی بھولے سے ٹھکرا دیا، کبھی ہو گیا ٹھکرا دیا، کبھی نسیان کی نذر کر دیا، کبھی سوئے میں بھول گئے کہتے مواقع ایسے آئے جہاں ہم سے الگ ہو گئے۔ مگر میرے بندے وہ ہیں جن کی زندگی میں نہ ہوئے نہ نسیان۔ وہ غلطی ہے۔ حد یہ ہے کہ یہ اگر کسو بھی جائیں تو میری مرضی ہی کا سودا کرتے ہیں صلوات تو عزراؑ ان محرم! سرکارِ دو عالم اگر مستجاب الدعوات ہیں۔ آبل بول کر سبجا الدعوات

ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان سے پروردگار کی کوئی رشتہ داری ہے۔ انھوں نے مالک سے رشتہ عبودیت قائم کر لیا ہے۔ انھوں نے بندگی کے رشتہ کو مستحکم اور مضبوط بنایا ہے۔ خدا کی کسی بات کو ٹالا نہیں ہے لہذا پروردگار نے بھی ان کی کسی خواہش کو ٹھکرایا نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ اگر ان کے نزدیک دعا کر دی جائے تو پروردگار اسے بھی رد نہیں کرنا چاہتا ہے۔ یاد رکھئے کہ شریعت میں ایسے کام کچھ وہ ہیں جن کو واجب کہا جاتا ہے۔ اور کچھ وہ ہیں جن کو مستحب یا تحب کہا جاتا ہے۔ واجبات کا مفہوم یہ ہے کہ ان کا ہونا ضروری ہے کہ انسان نہ کرے گا تو مستحق سزا ہو جائے گا۔ مگر مستحبات کی شان یہی ہے کہ اگر وہ کرے تو ثواب مل جائے گا، نہ کرے تو عذاب بھی ہونے والا نہیں ہے۔ یعنی ہم کو ایک جگہ پابند بنایا گیا ہے تو ایک جگہ آزاد بھی رکھا گیا ہے۔ خطرات کے آنے کے بعد مغرب و عشاء کی نماز واجبات میں ہے کہ جو نہ پڑھے مستحق عذاب ہو جائے گا۔ لیکن نماز شب واجبات میں نہیں ہے، مستحبات میں ہے کہ پڑھے تو ثواب مل جائے گا ورنہ عذاب بھی نہ ہوگا۔

یہ اور بات ہے کہ یہ بہترین موقع ہوتا ہے، بہترین لمحات ہوتے ہیں جہاں بندہ مالک سے مناجات کرتا ہے لیکن پھر بھی پروردگار کہتا ہے اگر تم مناجات نہ کرو گے، اگر نصف شب کے بعد ہماری بارگاہ میں نہ آؤ گے تو میں نہ عذاب کروں گا اور نہ سزا دوں گا۔ میں نے مغرب و عشاء میں پابند بنایا ہے اور نماز شب میں آزاد چھوڑ دیا ہے۔ مگر متعجب الدعوات کے بنایا ہے؟ اُس پیغمبر کو بنایا ہے کہ جس کے لئے جیسے مغرب و عشاء کو لازم قرار دیا ہے ویسے ہی نماز شب کو لازم قرار دیا ہے۔ ہمارے یہاں ایک زور دہر گھر میں آجائے تو نماز شب کیا، نماز صبح بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اور وہاں تو آذواج گھر کے اندر ہیں مگر سرکارِ دوعالم کی نماز شب قضا نہیں ہوتی ہے۔ جب بندہ ایسی بندگی کرتا ہے تو مالک کہتا ہے، اے میرے بندے جب تو نے میری ہر بات کو مان لیا ہے تو میری کسی بات کو میں ٹھکرانا نہیں چاہتا اور بات اس کی ٹھکرانی جاتی ہے جو مرضی سے ہٹ کے مانگتا ہے۔ جن کو مالک

نے اپنی مرضی کا محل و مرکز بنا دیا ہے۔ وہ نہ مرضی خدا سے ہٹ کے بولنا جانتے ہیں اور نہ ان کی بات کے ٹھکرانے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے۔ صلوات عزیزانِ محترم! یہ ٹھگلو کا دوسرا مرحلہ تھا جس کو مختصر گزارش کر دیا۔ اب تیسرا مرحلہ ہے لہذا آئیے محبت کی بنیادوں کو پہچانیں۔

مذہب کی سب سے پہلی محبت ہے محبت پروردگار۔ یہ سارا مذہب محبتوں کا مذہب ہے اگر کوئی محبت کے معنی جانتا ہو۔ لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم محبت کے معنی جانتے ہی نہیں ہیں۔ یہ لفظ بھی استعارہ نام ہو گیا ہے کہ ہر جینے دو جینے کے بعد مومنین کرام یا مسلمین کرام یہ سوال ضرور کرتے ہیں کہ کیا اسلام میں محبت حرام ہے؟ ہم کیا جواب دیتے ہیں یہ الگ مسئلہ ہے۔ آپ سوال کا مزاج پہچانئے کہ مسلمان نے یہ سوچا کیسے کہ محبت حرام ہے جب کہ قرآن مجید بار بار دہرا رہا ہے **يُحِبُّكَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ**۔

خدا ایسی قوم کو لے آئے گا کہ وہ خدا سے محبت کرنے والے ہوں گے اور خدا ان سے محبت کرنے والا ہوگا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام کا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔ سارا قرآن ذکر محبت سے بھرا ہوا ہے اور مسلمان مسئلہ پوچھتا ہے کہ کیا اسلام میں محبت حرام ہے۔ یعنی مسلمان ذہن و ذلت کی اس منزل پر آ گیا ہے جہاں محبت کے معنی سوائے ناجائز تعلقات کے اور کچھ نہیں ہیں۔

الحمد للہ کہ معاشرے میں سب ایک جیسے نہیں ہیں۔ لیکن اگر ایک بھی کہیں پیدا ہو گیا تو معاشرے کے لئے انتہائی شرمناک بات ہے کہ جہاں محبت کا لفظ اتنا پاکیزہ لفظ تھا کہ جس کو پروردگار اپنے واسطے استعمال کرتا تھا کہ میں محبت کرتا ہوں وہاں اُس لفظ کو اتنا ذلیل بنا دیا گیا کہ مسلمان اس کے بارے میں یہ نہ پوچھے کہ کیا محبت واجب ہے بلکہ یہ پوچھے کہ کیا محبت حرام ہے۔ یہ سب نتائج اس بات کے ہیں کہ دنیا داری میں مزاج انسانی اتنا ڈوب گیا ہے کہ مذہب کے تقدس سے کیسے غافل ہو گیا اور انہیں غفلتوں کا نتیجہ ہے کہ محبت کی قدر و قیمت سے بھی غافل ہو گیا ہے۔ مذہب

میں بنیادی طور پر سب سے پہلی محبت ہے پروردگار کی محبت۔ اس کے بعد پیغمبر خدا سے محبت۔ اس کے بعد اولیاء اللہ سے محبت۔ سب سے پہلا فرض مسلمانوں پر یہ ہے کہ خدا سے محبت کرے۔ اس کے بعد نبی خدا سے محبت کرے اور اس کے بعد ان سے محبت کرے کہ جن کی محبت کو رسول خدا نے رسالت کا اجر قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ساری محبتیں آپس میں تقسیم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اگر اتنی باتیں آپ کے ذہن عالی میں محفوظ ہو گئی ہیں تو میں ایک سوال کرتا ہوں۔ یہیں سے سارے حقائق آپ پر واضح ہو جائیں گے۔

ہم آپ سب مسلمان ہونے کے رشتے سے خدا سے محبت کرتے ہیں یا نہیں؟ یہ کوئی انسان جو کہ ہم انسان ہیں اور خدا سے محبت نہیں کرتے ہیں۔ اگر کوئی بد نصیب یہ کہہ دے تو خدا تو کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وہ کہے گا ٹھیک ہے اگر تم کو ہم سے محبت نہیں ہے تو ہم کو ہی کیا غرض ہے کہ تم جیسے نالائقوں سے محبت کریں۔ لہذا ہر مسلمان ہر مومن، مسلمان، مومن ہونے کے اعتبار سے پروردگار سے محبت کرتا ہے۔ اب آپ اس سے پوچھئے کہ خدا کی کون سی ادا پسند آگئی ہے جو خدا سے محبت ہو گئی ہے، خدا کا چہرہ پسند آگیا ہے جو دیکھا ہی نہیں۔ خدا کی آنکھیں پسند آگئی ہیں جو دیکھی نہیں۔ خدا کی زلفیں پسند آگئی ہیں، جو کسی کے خیال میں بھی نہیں ہیں۔ تو خدا سے محبت کیسے ہو گئی کیا مسلمان دیا انہی سے کہ بغیر کسی بنیاد کے محبت کر رہا ہے یا بھڑکے بولتا ہے۔ محبت ہے ہی نہیں۔ یہیں ٹھہر کر فیصلہ کر لیجئے، تاکہ آگے سوچنے میں کوئی زحمت نہ ہو۔

ہر مسلمان کے پاس ایک ہی جواب ہے۔ خدا کے چہرے سے محبت نہیں ہے، آنکھوں سے نہیں ہے، حسن سے نہیں ہے، جمال سے نہیں ہے۔

پھر محبت کیوں ہے؟

محبت خدا کے کمال سے ہے۔ وہ عالم ہے اس لئے محبت ہے۔ وہ قادر ہے اس لئے محبت ہے۔ وہ حی ہے اس لئے محبت ہے۔ وہ صادق ہے اس لئے محبت ہے۔ وہ اتنے کمالات کا مالک ہے اس لئے محبت ہے۔

اب تو اندازہ ہو گیا کہ مذہب میں نہ جمال کی محبت ہے، نہ مال کی محبت ہے، نہ مذہب میں تنہا کمال کی محبت ہے۔

اسے پروردگار، جب تیسرے دین میں سوائے کمال کے اور کوئی محبت نہیں ہے، تو تو نے کسی بندے سے محبت کرنے کا حکم کیوں دے دیا؟

خدا نے کہا۔ اگر بے کمال ہوتا تو کبھی حکم محبت نہ دیتا۔ جب میں سب پر کسی کی محبت کو واجب کر دوں تو سمجھ لو کہ اس میں اتنا کمال ہے کہ سب کے لئے محبوب بننے کے قابل ہے۔ صلوات

اور جب محبت پروردگار کی بنیاد ہے کمال، تو اس کے معنی یہ ہونے کہ محبت کی دو قسمیں ہو گئیں۔ ایک جذباتی محبت اور ایک مذہبی محبت۔

جذباتی محبت جمال کو دیکھ کے پیدا ہوتی ہے، مال کو دیکھ کے پیدا ہوتی ہے، چہرے کو دیکھ کے پیدا ہوتی ہے، ظاہری شخصیت کو دیکھ کے پیدا ہوتی ہے۔ مگر مذہبی محبت وہ نہ کسی کے جمال سے مرعوب ہوتی ہے اور نہ کسی کے مال سے مرعوب ہوتی ہے۔ مذہبی محبت کمال چاہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو مادیات والے ہیں وہ حسن و جمال سے محبت کرتے ہیں اور جو مذہب والے ہیں وہ کمال سے محبت کرتے ہیں۔ وہ چاہے جنس والا ہو مگر محبوب ہے۔ چاہے عرب والا ہو مگر محبوب نہیں ہے۔ مذہبی محبت کا معیار جمال نہیں ہے بلکہ کمال ہے۔

دلیل سنیں گے آپ۔ جتنے جمال والے تھے، جتنے حسن والے تھے، جتنے حسین چہرے والے تھے کوئی اس قابل نہ ہوا کہ سرکار اُسے موزن بنا دیتے بلکہ کسی کی شان میں تَبَّتْ يَدَاہُ، کسی کی شان میں قُومُوا عَجْثًا۔ مگر ایک تھا جو ایسا بندہ تھا کہ نبی اُس سے محبت کر رہے تھے تاکہ آج ہی سے پہچان لو کہ میری محبت کا تعلق جمال سے نہیں ہے کمال سے ہے۔ تو جو ایک بندہ موزن سے محبت کرنے میں اس کے کمال کو دیکھتا ہے تو جس سے اول سے لے کر آخر تک ساری زندگی محبت کرے سوچو وہ کتنا پاک ال

ہو گا اور جس کے حق میں دعا کرے خدا اس سے محبت کرے جو اس سے محبت کرے،

وہ کیسا صاحب کمال اور کیسا صاحب کردار ہوگا۔

یاد رکھئے مگر مذہبی محبت اطاعت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کمال سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی بنیاد ہے محبت کے لئے کمال اور اثر ہے اس کا اطاعت یا ان کی محبت کرنے والے اپنے محبوب کی راہ میں بہک جاتے ہیں، بھٹک جاتے ہیں، عورت بچہ ڈالتے ہیں، مال ناکر دیتے ہیں، تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، منہ دکھانے کے لائق نہیں رہ جاتے ہیں۔ مگر جو مذہبی محبت کرنے والے ہیں، وہ نہ بھٹکے والے ہیں، نہ بھٹکے والے ہیں، نہ گمراہ ہونے والے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مادی محبت والوں نے پیغمبر کو محبت کرتے دیکھا، سمجھ کر شاکہ یہ بھی بہک گئے ہیں اس لئے کہ ان کے دھن میں صرف یہی ہوئی محبت ہے۔ وہ کمال کی محبت سے آشنا ہی نہیں ہیں، وہ تو رسول کی محبت میں بھی زلفت و رخسار کو شامل کر لیتے ہیں، غیروں کا کیا ذکر ہے۔

تاریخ قرآن میں اس کی مثال موجود ہے کہ معرفت برادران یوسف نے جب باپ کو یوسف سے محبت کرتے دیکھا تو فوراً کہہ دیا کہ یہ بہک گئے ہیں یعنی جناب یعقوب اللہ کے ایک بندہ سے محبت فرما رہے ہیں اور برادران یوسف کہہ رہے ہیں کہ یہ بہک گئے ہیں۔ کیوں اس لئے کہ ان کی نگاہ میں سوائے یہی محبت کے اور کوئی محبت تھی ہی نہیں۔ اگر برادران یوسف نے کبھی کمال کی محبت دیکھی ہوتی یا کمال کی محبت کی ہوتی تو انھیں اندازہ ہوتا کہ جناب یعقوب کی محبت جناب یوسف سے برائے کمال ہے اور کبھی یہ نہ کہتے کہ باپ بہک گئے ہیں، لیکن پہلے مرحلے پر جب باپ کو بیٹے سے محبت کرتے دیکھا تو کہا کہ بہک گئے ہیں اور آخر میں جب یعقوب کو فراق یوسف میں روئے دیکھا تو کہا "ابھی اسی بڑائی گراں پر چل رہے ہیں" اب یہ اندازہ ہوا جو مذہب کی حقیقت کو نہیں پہچانتے ہیں وہ اللہ والوں سے محبت کو بھی گمراہی کہتے ہیں اور اللہ والوں کے غم میں رونے کو بھی گمراہی کہتے ہیں۔ صلوات

لیکن جو معنویت کو پہچانتے ہیں وہ محبت کی واقعی قدر و قیمت کو جانتے ہیں اور انھیں معلوم ہے کہ ہم نے سرکارِ دو عالم سے محبت کی ہے تو حضور کے کمال کی بنا پر۔ ہم نے اکی محمد سے محبت کی ہے تو آل محمد کے کمال کی بنا پر۔ ہم نے جن سے عباد کرام سے محبت کی ہے وہ بھی ان کے کمال ہی کی بنا پر ہے۔ اور ہم نے دنیا میں اگر کسی سے محبت نہیں کی ہے تو پہچانے کہ وہ بے کمال ہے۔ اس لئے کہ ہم نے ہمیشہ کمال کو بنیاد بنایا ہے۔ لیکن عزیز و ہماری محبت سے واقف خدا کا کمال نہیں پہچانا جاسکے گا۔ ہماری محبت سے واقف سرکار کا کمال نہیں پہچانا جائے گا۔ ہماری محبت سے واقف آل محمد کا کمال نہیں پہچانا جائے گا۔ البتہ اگر اکی محمد ہم سے محبت کر لیں تو ہمارا کمال پہچان لیا جائے گا۔ ان کی ذرہ فازی سے، ان کی عزت افزائی سے ہمارے بارے میں یہ فیصلہ ہوگا کہ یقیناً یہ بندہ کچھ تو صاحب کمال ہے۔ جو اللہ کے نیک بندے اس سے محبت کرتے ہیں اور اسی بنیاد پر ہم نے پہچانا کہ وہ کتنا بڑا صاحب کمال ہوگا جس کو حسین اپنا حبیب بنالیں جس کو حسین اپنا محبوب قرار دے دیں اور واقعہ یہ ہے کہ ایسا صاحب کمال جو اس قابل ہو کہ فرزندِ رسول اسے اپنا محبوب بنالیں۔ اس کا نام حبیب غلط نہیں رکھا گیا ہے۔ تاریخ کر بلا میں اس کو سب با کمال ہیں۔ وہ چھ مہینے کا بچہ ہو یا انسی سال کا سب با کمال ہیں۔ ان کے کمال میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن دو شخصیتیں ایسی ہیں کہ جن کا کمال پروردگار کے ناموں میں جذب ہو گیا ہے اور یہ بھی انسان کے مقدر کی بات ہے کہ جیسا نام رکھ دیا جائے آدمی ویسا ہی ہو جائے۔ یا حبیب ہونے والا ہے اتنا سے اس کا نام بھی ویسا ہی ہو جائے۔

ہم نے کر بلا میں دو ایسے خوش قسمت دیکھے ہیں :

ایک حسین کا وہ محبوب ہے جو محبوبِ بعد میں دکھائی دیا حبیبِ پہلے سے تھا۔ اور ایک وہ تھا جس نے اپنی تحریرت کا مظاہرہ بعد میں کیا مگر نام پیدا انسی طور پر اسے "محمد" مل گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حق تحریرت ادا کر دیا اور یزید

کی غلامی سے آزاد ہو کر حسینؑ کی غلامی میں آگیا تو مولانا سندسے دی۔

اسے خرابی مالتی تھی کتنی تھی کہ اس نے تیرا نام گھر رکھا تھا۔ تو دنیا میں باطل کی غلامی سے آزاد ہو گیا اور آخرت میں آتش جہنم سے آزاد ہو گیا۔

وہ جس کو ماں نے حبیب بنایا تھا وہ حسینؑ کا حبیب بن کے سامنے آیا اور جس کو اس کی ماں نے خراب قرار دیا تھا اس نے کہلا میں اپنی حریت کا ثبوت دے دیا۔ لیکن چونکہ میں ذکر محبت کر رہا تھا لہذا اسی تذکرہ حبیب ابن مظاہر کو گفتگو کو تمام کرنا چاہتا ہوں۔ حبیب میں وہ کون سا کمال تھا جس کی بنا پر حسینؑ نے ایسا محبوب بنایا کہ سب حسینؑ کے ساتھ آئے تھے۔ اور یہ ایک ایسا چلبے والا تھا جس کے کمال کی بنا پر حسینؑ نے اس کو بلایا تھا اور شاید کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اسی ایک کو کون بلایا تو حسینؑ نے کسی اور محبت کا حوالہ نہیں دیا کمال ہی کا حوالہ دیا۔

”مَنْ احْبَبْنِي احْبَبْنِي عِلِّيَّ إِلَى الرَّجُلِ الْقَوِيَّةِ“

یہ خط ہے حسینؑ ابن علیؑ کا ایک مروفیہ کے نام۔ یہ مروفیہ لکھ کے حسینؑ نے بتا دیا کہ میری محبت سے کمال کی محبت ہے۔ حبیب چونکہ مروفیہ ہے لہذا میں اس سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ اس کا فراق گوارا نہیں کرتا۔ جہاں سب میرے چاہتے والے ہیں حبیب کو بھی آنا چاہئے۔

حسینؑ نے خط لکھا، نامہ بر خط لے کے چلا اور اس وقت آیا حبیب کے دروازے پر، جب حبیب دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تھے اور زوجہ کے ساتھ کھانا کھانا چاہتے تھے کہ ایک مرتبہ آنے والے نے دق الباب کیا۔ پوچھا کون؟ کہا انا بنی ہاشم میں فرزند رسولؐ کا قاصد، حسینؑ کا نامہ بر ہوں۔ آئے دروازے پر۔ آئے والے قاصد نے خط دیا۔ حبیب نے خط کو آنکھوں سے لگایا یہ ہر لکھا سینے سے لگائی یہی زادے کا خط ہے۔ زہر کے زور نظر کا خط ہے۔ لفاظی کھولا خط پڑھا۔ حبیب تم کو جانتے ہو کہ میں سے ہماری قربت کیا ہے۔ تم کو جانتے ہو کہ رسول اللہؐ سے ہمارا رشتہ کیا ہے۔ شاید تمہیں ہمارے حالات نہیں معلوم ہیں۔ اسے حبیب! ہم مصیبتوں میں گھرتے جا رہے ہیں۔

ہم چاروں طرف سے زخم اعداء میں گھرتے جا رہے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو ہماری مدد کے لئے آ جاؤ۔

حبیب گھر کے اندر آئے۔ زوجہ نے پوچھا:

کس کا خط ہے؟

کہا، میرے مولا حسینؑ ابن علیؑ کا خط ہے۔ نبیؐ کے نواسے کا خط ہے۔

کیا لکھا ہے؟ زوجہ نے کہا۔

خط کا مضمون سنایا۔

حبیب کیا ارادہ ہے؟

کہا میں سوچ رہا ہوں کہ حالات تو زمانے کے بہت خراب ہیں۔ ہر طرف اگر بندی ہے۔ حسینؑ کی مخالفت پر دنیا آباد ہو گئی ہے۔ اس خط کا کیا جواب دوں؟ کہا، حبیب جواب کے بارے میں سوچ رہے ہو؟ اگر تم مولائی نصرت کے لئے نہیں جاسکتے ہو تو تم گھر میں بیٹھو، میں جاؤں گی۔

حبیب نے کہا، مومنہ میں چاہتا تھا کہ تیرے جذبہ محبت کا بھی اظہار ہو جائے اور میرا آقا یاد کرے اور غلام نہ جائے۔ یہ بھلا کس طرح ممکن ہے۔

اس کے بعد اپنے خادم کو بلایا اور مولا کے کہاد یہ میرا ہوا رہے، اسے فلاں مقام پر لے جا کر میرا انتظار کرنا۔ میں کسی نہ کسی بہانے وہاں تک پہنچ جاؤں گا۔ حبیب چلے ایک مرتبہ راستہ طے کرتے ہوئے۔ جب اس منزل پر پہنچے جہاں غلام گھوڑائے ہوئے انتظار کر رہا تھا تو حبیب نے عجب نظر دیکھا۔ دیکھا کہ گھوڑے کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور غلام اس سے باتیں کر رہا ہے:

اے اسپ بادشاہ! اگر کسی مجبوری کی بنا پر میرا آقا زادہ اسکا تو میں تیری پشت پر سوار ہوں چلوں گا اور فرزندِ ناطقہ کی مدد کروں گا۔

بس یہ سننا تھا کہ حبیب کا دل ٹپ گیا۔ کہا زہر کے لال! مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ پر یہ وقت آگیا ہے کہ غلام جان قربان کرے اور جاؤر آنسو بہائے۔ آنسو کھڑ

jabir.abbas@yahoo.com

عَلَى اللَّهِ - خدا آپ کو کسی غم میں نہ ڈالے سوائے غم آل محمد کے :-
آئے قریب - وفاداری کی داد دی غلام کو اور گھوڑے پر سوار ہوئے - کہا
جاؤ تم جاؤ، اب میں جا رہا ہوں مولائی مدد کے لئے -

جیسے ہی غلام نے یہ فقرہ سنا، حبیب کے پاؤں پکڑ لئے - کہا مالک یہ خوب
انصاف فرمایا آپ نے - جب تک اپنی خدمت کا وقت تھا آپ نے مجھے اپنے ساتھ
رکھا اور جب فرزند رسول کی خدمت کا وقت آیا ہے تو آپ مجھے الگ کرنا چاہتے
ہیں - یہ نہ ہو سکے گا میں ساتھ چلوں گا -

حبیب نے غلام کو بھی ساتھ لیا اور جب اس منزل کے قریب پہنچے، تو
ایک مرتبہ فرزندِ فاطمہؑ نے آواز دی، میرے چاہنے والو! اٹھو - ہاشمی جو! اٹھو - بتایا
عباسؑ - علی اکبرؑ - اسے میرا بچپن کا جاں نثار آ رہا ہے - اصحاب بڑھے - بنی ہاشم
کے جوان بڑھے - حبیب کا استقبال کیا - حبیب جب درخیمہ کے قریب آئے، اصحاب
میں مسرت کی لہر دوڑ گئی - خیمہ کے اندر یہ خبر جیسے ہی پہنچی کوئی آیا ہے - شہزادی
نے فرمایا فقہ! ذرا اندر لے کر آؤ کون آیا ہے؟ ہم جب سے بلا کے بن میں آئے ہیں
یہی سن رہے ہیں کہ وہیں آ رہی ہیں - فکر آ رہی ہے - دشمن آ رہے ہیں - یہ اصحاب
کیوں مسکرا رہے ہیں - خبر لے کر آؤ کون آیا ہے - کہا آقا کا بچپن کا جاں نثار حبیب
آیا ہے -

جیسے ہی زینبؑ نے یہ سنا، کہا فقہ جاؤ، جا کے حبیب سے ہمارا سلام کہو اور
کہنا حبیب تم نے بڑا احسان کیا جو میرے بچپن کی مدد کے لئے آ گئے -

فقہ نے سلام پہنچوایا - حبیب نے دین پر بیٹھ گئے - خاک اٹھا کر سر پر ڈال دیا
پر ملائے مارے - اسے زہر کی بیٹیوں پر یہ وقت آ گیا ہے کہ غلاموں کو سلام کہنا
حبیب بے قرار ہو گئے اب اس وقت کے منتظر ہیں کہ کب وہ وقت آجائے کہ حبیب
اپنی جان قربان کر دیں - وقت گزرتا رہا - عاشور کا دن آیا - ظہر کا بخام آیا - نماز
ہو گئی - حبیب کو اجازت ملی، میدان میں آئے - جہاد تمام ہوا، گھوڑے سے گرتے

ہوئے مولاکہ پکارا -

وہ پہلا کمال تھا جس کا حوالہ حسینؑ نے دبا خط لکھتے ہوئے ۱۰ اور یہ آخری کمال ہے
کہ حسینؑ مقتل میں آ کے سر ہٹانے بیٹھے - سر اٹھانے والا نہ ہو کر کھا - فرمایا رَجَعْنَا إِلَى
مَدِينَةِ خُدَا میرے حبیب پر رحمت نازل کرے - میرا حبیب ایک رات میں پورا
قرآن ختم کر لیا کرتا تھا - یہ حبیب کا آخری کمال ہے ایک رات میں پورے قرآن
کی تلاوت -

اب جو حسینؑ لاشیں حبیب سے اٹھے تو راوی کہتا ہے میں نے دیکھا حسینؑ
کے چہرے پر خشکی کے آثار دکھائی دے رہے ہیں - حسینؑ کے چہرے پر راوی چھائی
ہوئی ہے - اسے مولایہ کیا ہوا؟ فرمایا میرا بچپن کا جاں نثار مارا گیا -
بس عزیز و فرق پہنچاؤ - حبیب مارے گئے تو چہرے پر خشکی کے آثار تھے
اور عباسؑ نے فرات سے آواز دی تو کمر کو تھام لیا -

بھیا کمر ٹوٹ گئی - عباسؑ اب تھا را بھائی اکیلا ہو گیا - دشمن طعنے دے رہے
ہیں - علما رہاں ہے - بتاؤ عباسؑ! حسینؑ کیا جواب دے -

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

چھٹی مجلس حکمت امام حسین علیہ السلام

"حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔ اللہ اس سے بحبت

کرے جو میرے حسین سے بحبت کرے"

سرکارِ دو عالم کے اس ارشادِ گرامی کی روشنی میں جو سلسلہ کلامِ عرفان امام حسینؑ کے عنوان سے آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔ اس کے چھٹے مرحلہ پر کچھ باتیں حکمت امام حسینؑ سے متعلق آپ کے سامنے پیش کرنا ہے۔ سب سے پہلے اپنے عزیز بھائیوں اور نوجوانوں کے لئے لفظ حکمت کی مختصر سی تشریح۔ اور اس کے بعد یہ گزارش کرنا ہے کہ اسلام دین حکمت ہے اور اسلام کا کوئی قول، کوئی عمل حکمت سے نکالی نہیں ہے۔ یہ درودِ دگارِ عالم نے جب اپنے پیغمبر کو بھیجا تو پیغمبر کی بعثت کا بنیادی مقصد یہی قرار دیا کہ لوگ دواہم چیزوں سے بے خبر ہیں، پیغمبر انہیں دونوں سے باخبر بنائے گا۔ یہ کتاب جاننے ہیں نہ حکمت جانتے ہیں۔ لہذا پیغمبر کا کام ہے کہ انہیں کتاب کی تعلیم بھی دے اور حکمت کی تعلیم بھی دے۔

چونکہ قوم ایسی ہے جو ضلالِ بین کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہے۔ علی اعتبار سے اس عالمی ہاتھ ہے اور علی اعتبار سے بھی یا بے عمل ہے یا بد عمل۔ لہذا پیغمبر کی ضرورت ہے کہ انہیں علی اعتبار سے مالا مال بنانے کے لئے کتاب کی تعلیم دے اور علی اعتبار سے سدھارنے کے لئے حکمت کی تعلیم دے۔ جو چیز انسانی زندگی

مُشکلِ گشتِ علیؑ مولا

کے
معجزات اور اقوال

تحقیق و پیش
عالیہ ایوب

عصہ پبلیکیشنز

بانی۔ ادب اکسپریس۔ 18168 کراچی 74700 پاکستان

میں علم کے کام آتی ہے اس کا نام ہے کتاب اور جو انسان کے کردار کی اصلاح کرتی ہے، اس کا نام ہے حکمت۔

فلسفہ کی دنیا میں علم بھی حکمت ہی میں شامل ہے۔ لیکن میں ان تمام تفصیلات میں آپ کا وقت نہیں صرف کر سکتا۔ صرف اجمالاً یہ گزارش کرنا ہے کہ انسانی زندگی کے جتنے عملی مرحلے ہیں، ذاتی اصلاح سے لے کر ملکی انتظام تک یہ سب دائرہ حکمت میں شامل ہیں اور حکمت اس مستحکم مضبوط، جامع عقلی عمل کا نام ہے کہ جسکی بنیادیں علم پر قائم ہوں اور اس کے بعد انسانی کردار کی بنیاد اس حکمت پر قائم ہو۔

حکمت کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے اپنے نفس کی اصلاح۔ اس لئے کہ جب تک اصلاح نفس نہ ہو سکے اس وقت تک دنیا کی اصلاح نہیں ہو سکتی ہے۔ اور آج دنیا کا ہر مصلح جو اصلاح کے مرحلے میں ناکام ہو جاتا ہے اس کا بنیادی راز یہی ہوتا ہے کہ دوسروں کو سنوارنا چاہتا ہے اپنی ذات سے بے خبر ہو کر۔ اور میں یہاں بھی ایک افغان کہنا چاہتا ہوں کہ دنیا کا کوئی مصلح اگر اپنے نفس کی اصلاح کر کے بھی دنیا کی اصلاح کرنا چاہے جب بھی وہ منزل اصلاح میں کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ بہت پرانی مثل ہے کہ طیب، حکیم، ڈاکٹر اپنا علاج خود کرے تو وہ علاج اتنا کامیاب نہیں ہوتا ہے جتنا کامیاب وہ علاج ہوتا ہے جب مریض کوئی اور ہوتا ہے اور دعا ہے اور دعا کوئی اور ہوتا ہے۔ دور قدیم میں فن طب میں یہ ماحورہ مشہور تھا کہ رَأَى الْقَيْلُ عَيْلًا بیمار کی رائے خود بھی بیمار ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ جو رائے قائم کرنے والا ہے خود ہی پہلے سے بیمار ہے تو اسے اپنی بیماری کا اندازہ ہی نہیں ہوتا ہے علاج کیا کرے گا۔ ساری دنیا میں ساری بیماریوں کے علاج جو ناکام ہوتے ہیں اس کی ایک بڑی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جو علاج کرنے والا ہے وہ مرض کو نہیں جانتا ہے اور جو مریض ہے وہ علاج نہیں جانتا ہے۔ بیمار ڈاکٹر صاحب کے سامنے جائے بیٹھ گیا۔ پوچھا کیا تکلیف ہے؟ اس نے اگر کہہ دیا کہ سر میں درد ہے، تو ہے۔ اور اگر کہہ دیا نہیں ہے، تو ہر نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس کوئی ایسا آکھ نہیں ہے جو بتائے کہ میرے سر میں

درد ہے یا نہیں؟ تکلیف میں بیان کروں گا دوادہ دیں گے۔ تو اگر تکلیف بیان کرنے والا خود ہی اپنی تکلیف کو نہیں سمجھا یا اپنی ہی ذات سے خیانت اور بددیانتی کا عمل انجام دینے لگا تو پھر طیب اور ڈاکٹر کیا کرے گا۔ وہ علاج جانتا ہے۔ مریض نہیں جانتا ہے اور یہ جو بیمار ہے یہ بیماری جانتا ہے مگر علاج نہیں جانتا ہے۔ اب کام دو انسانوں میں تقسیم ہو جائے گا تو ناکامی کے اسباب زیادہ ہو جائیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ ساری خرابی یہ ہوتی ہے کہ جو بیمار ہے وہ علاج نہیں جانتا ہے اور جو علاج کرنے والا ہے وہ بیماری نہیں جانتا ہے۔ اس لئے جب دونوں میں اتفاق ہو جاتا ہے تو علاج کام آ جاتا ہے اور جب ذرا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے تو وہ بیماری نہ سمجھ سکا یا یہ علاج نہ سمجھ سکا تو بیماری بڑھتی جاتی ہے اور علاج بگاڑتا ہے اور ایک دن وہ آ جاتا ہے جب مریض دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ علاج کرنے والا عالم الغیب نہیں تھا۔ تو جب تک علاج کرنے والا معالج اور صاحب علم غیب نہیں ہو گا تو اگر صحیح بیماری معلوم کرے گا تو علاج ہو جائے گا اور تباہی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسمانی علاج کے لئے بھی ایسے طبیوں کی ضرورت ہے۔ جن کے ساتھ مریض عذاری نہ کرے اور وہ لاکھ کہے کہ میں صحت مند ہوں مگر یہ پہچانتے ہوں کہ بیمار ہے۔ وہ لاکھ کہے کہ سر میں درد نہیں ہے، مگر یہ جانتے ہوں کہ کتنا درد دوسرے۔ اسی لئے خدا نے جنھیں طیب بنایا تھا انھیں بیماروں کے درد و کرم پر نہیں چھوڑا تھا بلکہ وہ ہر ایک کے نفس کی کمزوری جانتے والے تھے۔ ہر ایک کی بیماری کو پہچانتے تھے۔ درد جو سامنے آئے بیٹھتا ہی کہنا کہ ہم سے کوئی نہیں ہے۔ ہم سے بڑا مصلح کوئی نہیں ہے۔ ہم سے بڑا بہترین کردار والا کوئی نہیں ہے۔ مگر جیسے ہی کہا بہترین کردار والا ہے پھر دیکھو کہ کیا پیغمبر ہو یا شاعر یا مصلح کہتے ہیں، اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ ہم بتا رہے ہیں کہ یہی مفسد ہیں۔ جب مریض ہی اپنے ساتھ عذاری کرے گا تو معالج علاج کیا کیسے گا۔

وہ لوگوں نے اپنے نفس کی اصلاح کرنے والا نہ ہو، اور اس سے یہ نہ کہا جائے کہ پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرو اس کے بعد لوگوں کو پاکیزہ بنانا۔

اور یہی وجہ ہے کہ پروردگار نے جن کو نفس پاکیزہ بنانے کا ذمہ دار بنایا تھا، ان کے نفس کی پاکیزگی کو ان کے حوالہ نہیں کیا تھا بلکہ ان کے نفس کو اس نے خود پاکیزہ بنایا تھا اور کائنات کے نفس کو وہ پاکیزہ بنائیں۔ صلوات

اگر نہیں سمجھتے تو اب سمجھیں۔ اُپر تطہیر کے معنی کیا ہیں۔ اہلبیت! تمہاری طہارت کا ذمہ دار ہے۔ تمہاری پاکیزگی کا خدا ذمہ دار ہے۔ تم میں اور ساری دنیا میں بنیادی فرق ہے کہ سب اپنے نفس کی خود اصلاح کرتے ہیں۔ تمہارے نفس کو اس نے پاکیزہ بنایا ہے۔ اور جب تک مریض اور معالج ایک رہے گا کمزوری برقرار رہ جائے گی اور جب خدا کی مصلحت اصلاح کرنے والا اور پاکیزہ بنانے والا ہوگا تو جب تک راۃ خدا کو رو نہ ہو جائے طہارت اکل محمد کمزور نہیں ہو سکتی ہے۔ صلوات

تو عزیز! حکمت علی کا پہلا مرحلہ ہے اپنے نفس کو پاکیزہ بنانا اور دوسرا مرحلہ اپنے احباب کو، گھر والوں کو، اپنے سے متعلق افراد کو پاک و پاکیزہ بنانا اور ان کے نفس کی اصلاح کرنا۔ آخری مرحلہ ہوتا ہے اصلاح عالم۔ اور یہ ساری باتیں وہ ہیں جو حکمت علی کے مختلف مراحل کی شکل میں بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن سب کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان وہ طریقہ کار اختیار کرے جو طریقہ کار واقعاً اصلاح کر سکتا ہو اور جس کے ذریعہ بہترین نسخہ قرآن حکیم۔ پیغمبر کتاب خدا کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ یعنی پہلے کتاب پڑھتا ہے کہ وہ معلوم ہو جائے، نسخہ معلوم ہو جائے، علاج معلوم ہو جائے۔ اس کے بعد حکمت سکھاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہاں کیسے اعمال کیا جائے گا، نسخہ پر کیسے عمل کیا جائے گا۔ یہ خلاصہ ہے کتاب و حکمت کی

سرکارِ دو عالم نے یہ دونوں کام اپنی زندگی میں انجام دیئے اور فیضِ الہی کو سب کے لئے وسیع کر دیا اور ایسا ادا کر دیا کہ پروردگار عالم سے سب کمال حاصل

اسی لئے خدا نے اپنے معالج کو جس کو اس نے طیب بنایا تھا ایسا صاحبِ علم و کردار بنایا تھا کہ لاکھ مریض کہتا رہے کہ میں بیمار نہیں ہوں، مگر پیغمبر بیماری کو جانتا ہے، علاج کرنا بھی جانتا ہے۔

ہم زندگی بھر قرآن پڑھتے رہیں اور بڑھ بڑھ کر دم کرتے رہیں نزلے کا سبب علاج نہیں ہوتا ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ بیمار کے سامنے نہیں اگر مردہ کے سامنے سو رہے بڑھ دیا جائے اور مردہ اٹھ کے بیٹھ جائے تو خبردار تعجب نہ کرنا کہ کلام پروردگار کا کام ہے مردوں کو زندگی دینا۔ صلوات

تو میں یہ گزارش کر رہا تھا کہ اگر ہم آپ دنیا کی اصلاح کرنا چاہیں تو اصلاح عالم کی بنیادی شرط ہے کہ پہلے اپنے نفس کی اصلاح کریں اور پھر مسئلہ یہ ہوگا کہ اپنی اصلاح کون کرے گا۔ ہم آپ کو کہیں گے یعنی ہم ہی بیمار، ہم ہی معالج۔ آپ سے سنا اصلاح یوں ہوتی ہے کام شروع کر دیا۔ ان سے سنا اصلاح نفس یوں ہوتی ہے کام شروع کر دیا۔ جہاں جو کام سن یا یا کہ نفس اس سے پاکیزہ ہوتا ہے وہی کام شروع کر دیا۔ لیکن بہر حال یہ نفس اپنے خاتم پر رہے گا۔ ہم ہی اپنے نفس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو یہ اصلاح خود ہی کمزور رہ جائے گی اور پھر اس کے نتیجے میں جو اصلاح عالم ہوگی اس میں بھی استحکام نہیں ہو سکتا ہے۔

کاش میری بات واضح ہو جائے یہ مجھے بھی معلوم ہے اور ہر انسان جانتا ہے کہ دوسرے کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہئے۔ مگر کہے گا کون؟ ہم ہی اپنے نفس کی اصلاح کریں گے۔ یعنی جو بیمار ہے وہی تو معالج ہوگا اور جب تک کمزوری رہے گی اُس وقت تک نہ اُس کی اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ کسی کی اصلاح کر سکتا ہے۔

اگر آپ نے اس نکتہ کو محسوس کر لیا ہے تو میں ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں جو سب تک ہم خود اپنی اصلاح کر کے اصلاح کرنا چاہیں گے نہ مصلحت کا اعتبار ہوگا اور نہ اصلاح کا اعتبار ہوگا ضرورت اس بات کی ہے کہ جس کو اصلاح عالم کی ذمہ داری دی جائے

کرلی۔

یہ مختصر تہذیبی اب میں چاہتا ہوں کہ تاریخ اسلام کے چند اوراق آپ کے سامنے رکھوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ حکمت کی راہ میں آگے بڑھنے والے اور تمام اعمال انجام دینے والے کیسے افراد ہوتے ہیں۔ لیکن بات آگے بڑھانے سے پہلے دو نغلیں اور ضمنا یاد رکھیں گے۔

پہلا درودگار عالم نے قرآن مجید میں بار بار اپنا تعارف کرایا ہے لفظ حکیم یہ حکیم وہ نہیں ہے جو ہمارے یہاں طبیب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ اس نے بھی نسخہ ہی لکھا ہے اور اتنا طویل نسخہ لکھا ہے کہ جس میں دنیا کی ہر بیماری کا علاج موجود ہے لیکن یہ درودگار عالم نے اپنے کو حکیم قرار دیا ہے۔ اس کے لئے دوشنبے قرار دئے ہیں اور دونوں میں اپنی حکمت کا مظاہرہ کرنا چاہا ہے۔

خدا کی اس کائنات میں ایک کا نام ہے تخلیق پیدا کرنا۔ اور دوسرا کام ہے ہر ایک کی زندگی کے لئے ایک قانون بنانا۔ اس نے اگر درخت کو پیدا کیا ہے تو درخت کی بقا کا ایک قانون بنایا ہے۔ اگر درخت کو پیدا کیا ہے تو درخت کی بقا کا ایک قانون بنایا ہے۔ اگر جانوروں کو پیدا کیا ہے تو ان کی زندگی کا ایک قانون بنایا ہے۔ اگر انسان کو خلق کیا ہے تو جو کچھ صاحب عقل و ارادہ تھا لہذا اس کی زندگی کے واسطے بھی ایک مفصل قانون بنادیا ہے، جس کا نام ہے شریعت۔ جو درخت کی بقا کا قانون ہے اس کو شریعت نہیں کہا جاتا۔ جو جانوروں کی زندگی کا قانون ہے اس کو شریعت نہیں کہا جاتا ہے۔ لیکن جو انسانی زندگی کا قانون ہے اسے شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ شریعت اس نظام کا نام ہے جس کو بناتا ہے خدا، عمل کرنا ہے بندہ اپنے ارادہ اور اپنے اختیار سے۔ جانوروں کے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ پتھروں میں یہ بات نہیں ہے۔ درختوں میں یہ بات نہیں ہے۔ لیکن نظام پروردگار کے ہر جملہ اپنا کام کر رہا ہے تو تخلیق میں بھی اسی کا نظام ہے اور زندگی گزارنے میں

اسی کا نظام ہے۔ یہ دوشنبے ہیں پروردگار عالم کے کاموں کے۔ اب پروردگار نے کہا کہ میں ہوں خدا ہے حکیم یعنی اگر میری حکمت کو پہچاننا ہے تو چاہے میری تخلیق میں دیکھو، چاہے میری نشوونما میں دیکھو، جو قانون بھی بنادیا ہے وہ حکمت سے الگ نہیں ہے اور جو مخلوق بھی بنادی ہے وہ حکمت سے الگ نہیں ہے۔ اگر آپ آلی محمد کے ارشادات کا جائزہ لیں گے تو آپ کو ان باتوں کی مصونیت کا مزید اندازہ ہو جائے گا۔

آنے والا امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور وہ امام سے کچھ حکمت پر درودگار کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے۔ امام نے ایک وجود انسان کو سامنے رکھ کے پورے انسانی طبقہ کا نقشہ کھینچ دیا اور سر کے بالوں سے لے کر پیروں کے ناخنوں تک ہر جزو بدن کی حکمت و مصلحت کا ذکر کر دیا۔ اور اس کے علاوہ جب کوئی امام کے سامنے آگیا اور ذرا اپنی قابلیت کا اظہار کرنے لگا تو آپ نے فوراً پوچھ لیا کہ اگر خدا حکیم ہے تو ذرا اس کام کی حکمت بتاؤ۔ ساری قابلیت رکھی رہ گئی۔ واقعات آپ کو معلوم ہیں اور اگر نہیں معلوم ہیں تو کتابوں میں دیکھیں۔

آج ساری دنیا میں جتنے ڈگری پانے والے ہیں۔ سب خالی حکمتوں کو ڈھونڈ رہے ہیں، کوئی حکمتوں کا موجد نہیں ہے۔ آنکھوں میں اتنے پردے کیوں رکھے گئے ہیں۔ روشنی اتنے پردوں سے کیوں گزرتی ہے۔ ادھر سے کیوں جاتی ہے، ادھر سے کیوں آتی ہے۔ پیرایسے کیوں بنے۔ ہاتھ ایسے کیوں بنے۔ ناک ایسی کیوں بنی۔ بال اتنے کیوں بنے۔ یہ ساری ریسرچ دنیا میں ہو رہی ہے اور ایک ایک جزو بدن کی ریسرچ پر بڑی بڑی ڈگریاں لوگ لے کر پھیل رہے ہیں اور سب ان کی عظمتوں کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ بات آئی ہے عزیز تو ایک جملہ کہنا چاہتا ہوں کہ کم سے کم مومن مسلمان ہونے کے اعتبار سے اتنی معرفت خدا تو ہونی چاہئے کہ جب انھوں نے ناخون پروردگار کے ہر جملہ کی انھوں نے ہاتھ کی انگلیوں پر ریسرچ کرلی۔ انھوں نے انگلیوں پر ریسرچ کرلی۔ انھوں نے پیشانی کے خطوط پر ریسرچ کرلی۔ انھوں نے آنکھوں پر

jabir.abbas@yahoo.com

تحقیق کی۔ انھوں نے کانوں کے پردوں پر ریسرچ کی۔ انھوں نے ناک کے سوراخ پر تحقیق کی اور جب سیٹوں تحقیق کرنے والے اکٹھا ہو گئے تو ایک انسان کے وجود کی تحقیق ہوئی۔ اب تو پہچان کر لاکھوں محققین مل کے جس وجود کو پہچانتے ہیں اکیلا خدا اُس وجود کو ایجاد کرتا ہے۔ صلوات

عزیزان محترم! بات دور نہ چلی جائے کہ موضوع نامکمل رہ جائے جس بہت ہی اختصار کے ساتھ گزارش کرنا چاہتا ہوں ورنہ باتیں بہت ہیں۔ تو پروردگار عالم کا ایک نظام تخلیق ہے اور اسی کے مقابلہ میں ایک نظام تشریع ہے جہاں خدا قوانین بناتا ہے۔ زندگی گزارنے کے اصول طے کرتا ہے۔ لوگوں کو بتاتا ہے کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا ہے۔ لیکن دونوں شعبے وہ ہیں جہاں انسان جاہل ہے۔ نہ تخلیق کے بارے میں کچھ جانتا ہے نہ تشریع کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ خدا ہی کا کام یہ بھی ہے اور خدا ہی کا کام وہ بھی ہے۔

ایک صاحب آئے کہا یہ بتائیے کہ مغرب کی تین رکعتیں کیوں ہیں، آپ مولانا صاحب ہیں۔ میں نے کہا میں بتا دوں گا، میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے مگر ایک سوال میرا ہے اس کا جواب آپ دینے دیجئے۔ کہنے لگے پوچھئے؟ میں نے کہا یہ ہاتھ میں پانچ انگلیاں کیوں ہیں اور چھوٹی بڑی کیوں ہیں؟ کیا بنانے والے کا سانچہ ٹیڑھا ہو گیا تھا اور اگر بنانے والے کا سانچہ ٹیڑھا ہو گیا تھا تو انسان نے چاقو بھی تو پیدا کر دیا ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ بنانے والے نے ٹھیک نہیں بنا یا ہے یا وہی نتیجہ ہے سادات کے خلاف ہے، عقل و منطق کے خلاف ہے تو چاقو آپ کے ہاتھ میں ہے کہ اسے کم اپنی انگلیاں تو ٹھیک کر لیجئے تاکہ یہ کہا جائے کہ ہم سادات کے علم بردار ہیں۔

کہنے لگے یہ تو بنانے والا جانتا ہے میں کہاں سے بتاؤں گا۔

میں نے کہا عزیر محترم! اُسی بنانے والے نے دو چیزیں بنائی ہیں۔ آپ کی انگلیاں بھی اسی نے بنائی ہیں اور مغرب و عشاء کی رکعتیں بھی اسی نے بنائی ہیں۔

ایک آپ بتا دیجئے ایک میں بتا دوں گا اور اگر یہ چھوٹی بڑی ہو سکتی ہیں اور اسی سے کاروبار چل رہا ہے تو وہ بھی چھوٹی بڑی نمازیں ہوں گی اور اسی سے کاروبار زندگی چلے گا۔ صلوات

عزیزان محترم! یہ میں کسی کو خاموش کرنے کے لئے بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس نکتہ کو پہچانیں کہ یہ نظام تخلیق بھی خدا کا ہے۔ اور نظام تشریع بھی خدا کا ہے۔ جو مخلوق آپ کے سامنے ہے اس مخلوق کے بارے میں بھی آپ کو کچھ نہیں معلوم ہے تو جیسے مخلوقات کے بارے میں نہیں جانتے ہیں اور توڑ پھوڑ کرنے کا ارادہ نہیں کرتے ہیں ویسے ہی اگر قانون کے بارے میں نہیں جانتے ہیں تو کُل انسان کا ارادہ نہ فرمائیں۔ یہ چھوٹی بڑی انگلیاں ہیں جن سے زندگی کا کام چل رہا ہے وہ دور کست، چار رکعت کی نمازیں ہیں جن سے زندگی کا کام چل رہا ہے۔ اب کیسے زندگی کا کام چل رہا ہے یہ انگلیاں بنانے والا جانتا ہے اور کیسے زندگی کا کام چل رہا ہے یہ رکعتیں بنانے والا جانتا ہے۔

کہا یہ بتائیے قیام کیوں ہے؟ رکوع کیوں ہے؟ سجدہ کیوں ہے؟ ایک ہی طرح سے ہو جاتا۔؟

تو میں نے کہا آپ خود بتائیے کہ آپ کبھی سیدھے کیوں کھڑے ہوتے ہیں۔ مگر میں اتنی لچک کیوں ہے کہ چھک جاتے ہیں۔ نہ کہ میں لچک ہوئی نہ حکم رکوع آتا۔ تو پہلے تخلیق میں لچک پیدا ہوئی اس کے بعد تشریع کا قانون آیا۔ تو پہلے آپ بتائیے کہ یہ کب بالکل سیدھی کیوں نہ کر دی گئی۔ چوبیس گھنٹوں کی کھڑے رہنے اور آخر میں پارسوں کی طرح دفن ہو جاتے۔ کہیں بھٹکنے کی فوجت ہی نہ آتی۔ عوام ہونا انسان ایسا سر بلند ہے کبھی جھکتا ہی نہیں ہے مگر معلوم ہوا کہ زندگی اس سر بلندی میں نہیں ہے کہ سیدھے کھڑے رہیں۔ اس زندگی کا نظام یوں ہی چلتا ہے کہ کبھی اٹھنا پڑتا ہے کبھی جھکنا پڑتا ہے۔ تو اگر نظام زندگی بڑی ہی چل رہا ہے کہ کبھی سیدھے ہو جاؤ اور کبھی جھک جاؤ تو نظام زندگی بھی بڑی ہی چلتا ہے۔ مالک کہتا ہے کہ جیسے جیسے زندگی کے رنگ بدلتے جائیں ویسے ویسے

ہمارے سامنے سر جھکانے جاؤ، اگر سیدھے کھڑے ہو تو مجھے یاد رکھو اور اگر جھک جاؤ مجھے یاد رکھو۔ اگر اور آگے بڑھ جاؤ تو بھی مجھے یاد رکھو۔ تخلیق تشریع سے الگ نہیں ہے اور تشریع تخلیق سے الگ نہیں ہے۔ صلوات

یہ ایک عذراں ہے جو میں نے آپ کے حوالے کیا ہے۔ اس پر غور کرنے کے لئے ہمیں نو کا وقت درکار ہے بلکہ پوری زندگی بھی ناکافی ہے اور کم از کم مجھے علم کو تو بیان کرنے کے لئے بھی ہفتوں چاہئے کہ پروردگار عالم نے تخلیق میں اور قانون میں کیسا ارتقا رکھا ہے اور جب تک انسان تخلیق کی مصلحتوں کو نہ پہچان لے اس وقت تک تشریع کی مصلحتوں کو نہیں پہچان سکتا ہے۔ یہ تو خالی زبان ہے کہ جس کو اللہ نے قوت گویائی دے دی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ کسی اور پر اعتراض کریں گے تو مار کھا جائیں گے۔ تو خدا ہی پر اعتراض کرنے لگتا ہے کہ وہی ایسا حلیم و کریم ہے کہ سب کی سن لیتا ہے۔

اللہ کیا حلیم ہے وہ پروردگار۔ اسے حکمتوں کا کیا ذکر ہے وجود تک کا انکار کر دیا اور کروڑوں انسان اس کے وجود کے بھی قائل نہیں ہیں۔ مگر وہ کسی سے لڑتا ہے نہ کسی سے بحث کرتا ہے نہ کسی کو سزا دیتا ہے نہ کہیں مار پڑتی ہے بلکہ جتنا انکار کرتا ہے اس کو اتنی ہی ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ بھی اس کی حکمت کا ایک شعبہ ہے کہ اگر سزا دے دی تو دونوں برا رکھے جائیں گے۔ ان کی اذیتا ہی کیا ہے کہ ان سے مقابلہ کیا جائے۔ انھیں پھوڑو دو ان کے حال پر جتنا آگے بڑھنا چاہیں آگے بڑھیں جب وقت آجائے گا تو ہم ایسی سزا دیں گے کہ جس کے بل پر اگر وہ رہے تھے وہی سزا دے گا۔ جس کی وجہ سے اگر وہ رہے تھے وہی سزا دے گا۔

جناب موسیٰ نے آگے فرعون سے کہا کہ ایک خدا ہے اس کے آگے تم بھی جھکاؤ کھانم کون ہو، مجھ میرے سامنے بات کر دو گے؟ دیکھو میرے سامنے نہیں ہے۔ رہی ہیں۔ تم کو تو ایک چٹو پانی بھی نصیب نہیں ہوتا ہے، تم ہمیں کیا سمجھاؤ گے۔ سارا غور یہ ہے کہ نہر میں میرے قبضے میں ہیں۔ پروردگار نے کہا اب میرا

بھی سزا نہ دوں گا یہ نہر ہی سزا دے گی۔

قانون کے سامنے قانون پروردگار آیا۔ کہا تم کون ہو۔ تمہیں تو سہنے کے لئے مکان نصیب نہیں ہے یہ زمینیں میرے قبضہ میں ہیں۔ پروردگار نے کہا میں کیا سزا دوں گا یہ زمین ہی سزا دے گی۔ یعنی جو جس کے بل پر اکڑا اسی نے سزا دی۔ جو جس کی بنا پر غور میں مبتلا ہوا خدا نے اسی کے ہاتھوں سزا دلوائی۔ یہی وجہ ہے کہ جو عوامی طاقت سے اوپر کتے ہیں عوام ہی انھیں کھینچ کر نیچے اتارتے ہیں صلوات بس عزیزان محترم! میں چاہتا تھا کہ آپ کے سامنے ایک پورا تفصیلی جائزہ لیتا اس حکمت کا جو پروردگار عالم نے اپنے نمائندوں کے حوالے کی ہے تاکہ ہم محسوس کر سکیں کہ ان کے اعمال میں کتنی حکمت پائی جاتی ہے۔ اور انھوں نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو قدم غیر حکیمانہ ہو۔ اللہ کے نمائندوں کا کوئی عمل خالی از حکمت نہیں ہے اور جو کام کیا ہے وہ ویسا ہی منظم اور مرتب ہے جیسے پروردگار عالم نے اپنی حکمت کا مظاہرہ اپنی تخلیق میں کیا ہے ویسے ہی اس نے اپنے نمائندوں کو ایسا حلیم بنایا ہے کہ ان کا کوئی عمل بھی خلاف حکمت نہیں ہے۔ مگر اب تفصیلی جائزے کے لئے وقت نہیں رہ گیا ہے۔ لہذا بات کے صرف دو رخ ہیں ابتدا اور انتہا تاکہ میں سے آپ کو اندازہ ہو جائے کہ دنیا میں کوئی آدمی ہم آپ جیسا جب اسے فکر اصلاح پیدا ہوتی ہے تو وہ اصلاح کے لئے فیصلہ تلاش کرتا ہے کہ کہاں سے کام شروع کرے اور عام طور سے ہر آدمی اپنے علاقے سے کام شروع کرتے ہوئے گھبراتا ہے کہ جیسے ہی اپنے علاقہ کے لوگوں سے کہے گا کہ یہ جو آپ داڑھی منڈاتے ہیں یہ غلط کام ہے۔ فوراً کہیں گے اچھا اپنے ابا جان کو بھول گئے، اپنے چچا کو بھول گئے، اپنے بچپن کی شرارتیں بھول گئے۔ کس قدر مشکل ہے کہ بچپنا انھیں کے درمیان گزرا۔ جوانی انھیں کے درمیان گزری۔ زندگی انھیں کے درمیان گزری۔ خاندان وہی جانتے ہیں۔ اعزاء ان کو وہی جانتے ہیں۔ تاریخ کو وہی جانتے ہیں۔ لہذا سب سے اچھا کام یہ ہے کہ بڑھو کہیں اور اور مظاہرہ کرو کہیں اور کہ وہاں نہ کوئی بچپن کو جانتا ہے نہ کوئی

جوانی کو جانتا ہے۔ سب سمجھیں گے کہ بڑے مولانا ہیں، بڑے مقدس ہیں۔ تو ہر مصلح کو یہ فکر ہوتی ہے کہ وہاں سے کام شروع کرے جہاں کوئی کمزوریوں کو جاننے والا نہ ہو، تاکہ بات میں اثر ہو۔

لیکن ذرا حکمت پیغمبر کو دیکھیے۔ اللہ نے کہا میرے حبیب! یہ پوری کائنات میری ہے۔ میں کہیں سے کہہ سکتا ہوں کام شروع کرو۔ لیکن پہلے اپنے عشیرہ سے کام شروع کرو۔ پہلے اپنے قبیلہ سے کام شروع کرو۔ پہلے اپنے خاندان سے کام شروع کرو اس لئے کہ انھوں نے تمہارا بچپنا دیکھا ہے۔ انھوں نے تمہاری جوانی دیکھی ہے۔ اب تو چالیس سال کے ہو گئے ہو۔ اب وہ جذبات انگوں کا زنا نہ گذر گیا ہے۔ وہ سارا زمانہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ جب تم ان کے سامنے کھڑے ہو گے تو کوئی تو کہے گا بچپن میں ایسے تھے۔ کوئی تو کہے گا دس سال کی عمر میں ایسے تھے۔ کوئی تو کہے گا بیس سال کی عمر میں ایسے تھے۔ کوئی تو کہے گا چالیس سال کی عمر تک ایسے تھے۔ کوئی تو بولے گا اور جب ان میں سے کوئی بولنے والا نہ پیدا ہو تو پھر اس کے بعد جب تمہارا پیغام باہر جائے گا تو باہر کسی کو بولنے کا حق نہیں ہے۔ حکمت تبلیغ پیغمبر ہی ہے کہ وہاں سے کام شروع کیا جائے جہاں والوں نے پوری زندگی کو دیکھا ہو۔ اور بات آئی ہے تو یہ جملہ بھی یاد رکھیں کبھی کام آئے گا۔

معاشرہ نے پیغمبر کے باپ کو دیکھا ہے خود پیغمبر نہیں دیکھا ہے۔ تو کتنی آسان بات تھی کہ جیسے ہی کہتے قولوا لا الہ الا اللہ، یہ بت پرستی غلط ہے، پتھروں کے سامنے جھکنا حماقت ہے۔ ویسے ہی کوئی پلٹ کر کہتا تمہارے بابا جان تو ہمارے ساتھ بت پرستی کرتے تھے۔ مگر کتنا پاکیزہ کہ اسے کہہ دیکھنے والوں کے سامنے نہ دیکھنے والا بول رہا ہے مگر کسی میں ہمت نہیں ہے کہ کچھ کہہ سکے۔

پیغمبر نے کہا کہ میں نے تنہا اپنے کمال کو دار کا کلمہ نہیں پڑھوایا۔ عبد اللہ کی توحید کا کلمہ پڑھوایا ہے۔ اپنے بابا کے کردار کا کلمہ بھی پڑھوایا ہے۔ اور اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جیسے ہی پیغمبر نے کہا کہ میں توحید کا علمبردار ہوں بت پرستی

کے خلاف پیغام لے کر آیا ہوں۔ ایک بچہ کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا کھڑے کا نہیں میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ ایسے موقع پر تو بڑھوں کو کہنا چاہیے تھا کہ پہلے اپنے باپ کو جا کے ٹھیک کرو۔ ساری دنیا کو متحد بعد میں بنانا ابھی تمہارے باپ تو زندہ ہیں۔ پہلے ان کو جا کے مسلمان بناؤ۔ مگر کوئی ایک بولنے والا نہیں پیدا ہوا۔

اب آپ کو اندازہ ہوا کہ اہل معاشرہ سے نبی نے آواز کیوں اٹھائی ہے۔ تاکہ کردار پیغمبر بھی معلوم ہو جائے اور عبد اللہ کا موحد ہونا بھی معلوم ہو جائے۔ اور علی کو شریک تبلیغ اس لئے کیا کہ ابوطالب کا ایمان بھی واضح ہو جائے۔ صلوات تین صدیوں کے بعد محروث پیدا ہوئے اور ہزار سال کے بعد تحقق پیدا ہوئے جو طے کر رہے ہیں کہ ابوطالب مسلمان تھے یا نہیں تھے۔ اسے چھوڑیے۔ تھے قاجروں کو اب مل جائے گا۔ نہیں تھے تو خدا کے یہاں پہنچ چکے ہیں۔ وہی جو آپ کو کھاتے ہیں وہی ہم آپ کو سمجھا رہے ہیں۔ ہم نے جہاں کسی ایک شخصیت کے بارے میں زبان کھولنے کا ارادہ کیا۔ کہنے لگے اپنی عاقبت کیوں خراب کر رہے ہو۔ وہ بڑے تھے تو خدا کے یہاں پہنچ چکے ہیں۔ سزا مل ہی چکی ہوگی۔ اچھے تھے تو انہیں ثواب ملے گا تم بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو۔

تو یہی تو ہم بھی آپ کو سمجھا رہے ہیں کہ اگر ابوطالب مومن تھے تو جنت میں بیٹھے ہوں گے۔ اور اگر مومن نہیں تھے تو اپنی سزا کو برداشت کر رہے ہوں گے آپ کیوں اپنی عاقبت کو خراب کرنے پر تامل ہوئے ہیں۔ ورنہ اگر یہ راستہ نہیں کھل گیا تو پھر سبھی کو تحقیق کرنے کا شوق پیدا ہو جائے گا اور بلاوجہ ایک پریشانی پیدا ہو جائے گی۔ چھوڑیے جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب تو پرانی تاریخ پڑھ کر صرف اتنا اندازہ کر لیجئے کہ ان کے ایمان کے بارے میں کل بولنے والا کوئی نہیں تھا۔ ان کے اسلام کے بارے میں کل نکتہ اٹھانے والا کوئی نہیں تھا اور جس کے دور کا انسان اس کو کافر نہ کہہ سکے، بعد دلتے کو کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

یہ پیغمبر اسلام کی پہلی حکمت علی تھی کہ منبر کا رد و عالم نے کام اپنی بستی سے شروع

کیا اور اپنے علاقے سے کام شروع کیا تاکہ دنیا والوں کو اندازہ ہو جائے کہ میرے کردار میں صداقت کتنی ہے۔ میرے کردار میں پاکیزگی کتنی ہے اور کہیں سے کسی کو شبہ کرنے کا امکان نہ پیدا ہو سکے۔

اس کے بعد اگر آپ حیات پیغمبر کا جائزہ لے لیتے جائیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ کا ہر کام مطابق حکمت و مصلحت تھا۔

اس کے بعد مولائے کائنات کا دور آیا۔ مولائے کائنات کی پوری زندگی بھی چاہے وہ خانہ نشینی کی ہو یا مسند نشینی کی ہو، پوری زندگی کے ہر عمل میں وہ قیوس صحتیں پائی جاتی ہیں کہ جن کو سمجھنے کے لئے اور بیان کرنے کے لئے ایک بڑا وقت درکار ہے۔ بس ایک چھوٹی سی بات گذارش کروں گا تاکہ سلسلہ بیان مرتب رہے۔

صفین کا معرکہ جل رہا ہے اور آخری مرحلہ تک معرکہ پہنچ چکا ہے کہ درمیان میں قرآن آگیا۔ پہلے مولائے لوگوں کو سمجھا یا کہ دیکھو یہ قرآن جو ملے کے آئے ہیں، یہ خالی قرآن کا نام لے رہے ہیں، یہ قرآن پر عمل کرنے والے نہیں ہیں، یہ منکاری کرنے والے ہیں۔ اگر ان کو قرآن سے کوئی دلچسپی ہوئی تو یہ سمجھنے بچھے قرآن کے ساتھ رکھا تھا۔ علیؑ مع القرآن۔ خدا نے مجھ کو لٹا ہوا قرآن بنا دیا ہے۔ اگر یہ قرآن کے ماننے والے ہوتے تو مجھے مان لینے۔ مگر جب قوم سمجھنے کے لئے تیار نہ ہوئی تو آپ نے حکم دے دیا کہ جنگ کو روک دیا جائے۔

میرا جواب آپ جانتے ہیں کہ یہ خالی منکاری اور ریاکاری ہے اس میں کوئی وقعت و صداقت نہیں ہے تو جنگ کو کیوں روک دیا؟

فرمایا، میری حکمت کو تم نہیں جانتے ہو، میری مصلحت کو تم نہیں پہچانتے ہو۔ وقت آنے کا تو اس مصلحت کی صداقت کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ دیکھو یہ روزِ اول سے یہ نعرہ لگا رہے ہیں، قرآن۔ قرآن۔ میرے مقابلہ میں امت کے پاس ایک سی نعرہ ہے، قرآن۔ یہیں قرآن چاہئے۔ قرآن چاہئے۔ اگر میں نے جنگ کو مقدمہ کر دیا تو جنگ تو حیت لوں گا، لیکن یہ لوگ یہی کہیں گے کہ علیؑ نے اقتدار حاصل کیا ہے پھر قرآن

اٹھانے کے بعد۔ لہذا یہ ممکن ہے کہ میں جیتی ہوئی جنگ کو چھوڑ دوں، مگر یہ لازم نہیں آتا کہ میں نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بعد جب فیصلہ کرنے والے لوگوں کے اور کہیں سے ذکر قرآن نہ آئے گا تب پہچاننا کہ میں نے قرآن کو کتنا مانا ہے اور انہوں نے قرآن کو کس طرح چھوڑ دیا ہے۔ صلوات

اس کے بعد آئیے ذرا امام حسنؑ کی زندگی میں امام حسنؑ کی حکمت عملی کا جائزہ لیں کہ اس وقت بھی کچھ لوگ پریشان تھے اور آج بھی پریشان ہیں کہ امام حسنؑ نے امام حکومت کیوں چھوڑ دی۔ اور اگر حکومت چھوڑ دی تو کسی اچھے شریف، سچدار، شہسوار، پڑھے لکھے انسان کے حق میں چھوڑ دینا ہوتا۔ ایسے لوگوں کے حوالہ کیوں کر دیا جاتا ہے ذیل تھے اور جس کی بنا پر بہت سے مومنین بھی ذلیل ہو گئے۔ آج بھی کتنے لوگ ہیں جو روزانہ اسی پر بحث کیا کرتے ہیں کہ امام حسنؑ تو یہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یہ تو کہیں واضح ہوگا کہ امام حسنؑ کو کیا کرنا چاہئے تھا۔ میں حکمت امام حسنؑ کے

اس سے میں فقط ایک جملہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس نے بھی پیغمبر اسلامؐ کے دور سے بنی امیہ کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے وہ یہ جانتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے مقابلہ میں ابوسفیانؑ کا طریقہ کار کا قصا اور مولائے کائنات کے مقابلہ میں ابوسفیانؑ کا اور اس کے بیٹے کا طریقہ کار کیا تھا۔ اس کے بعد اس بڑیدار کا کردار کیا ہوگا جو انتہائی بیخوشی سے اس امر کا اعلان کر رہا تھا کہ نہ کوئی وحی ہے نہ کوئی خبر ہے۔ یہ سب بنی ہاشم کا کھیل تھا نہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ بنی امیہ پورے اسلام کو بنی ہاشم کا کھیل تھا نہ تصور کرتے ہیں اور اسے بنی ہاشم کی ایجاد طبع سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اقتدار کے واسطے ایک ڈھونگ رکھا ہے۔ اپنی حکومت قائم کرنے کے واسطے ایک نظام بنا لیا ہے۔ اس کا نام

امینیت سے کوئی تعلق ہے اور نہ خدا سے۔ لہذا تمام تر فکر ہر مرحلہ پر یہ ہے کہ اس نظام کو دبا دیا جائے جس نظام کی بنا پر پیغمبرؐ کا نام بلند ہو گیا ہے اور بنی ہاشم ہمارے مقابلہ میں اونچے ہو گئے ہیں کہ ان کا نام جب بھی آتا ہے تو بلند یوں سے لیا جاتا ہے۔ یہ رسالت ہے جس نے ان کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ ان کا نام مگر سزا اذان سے

jabir.abbas@yahoo.com

لیا جاتا ہے لہذا رسالت ہی کا مذاق اڑایا جائے اسی کو کھیل تماشہ قرار دیدیا جائے۔ اُسی کو ڈھونگ بنا دیا جائے۔ اُسی کو پامال کر دیا جائے۔ اگر رسالت بے دستار ہو جائے گی تو رسول کا کلمہ بلند نہیں ہو سکے گا۔

یہ ایک بکر تھی جو بنی امیہ میں پائی جاتی تھی اور جس کی برابر کوششیں ہو رہی تھیں۔

امام حسنؑ نے دیکھا کہ نانہ نے مقابلہ کیا اس کا انجام سامنے ہے۔ بابائے میدان جنگ کا رخ کیا اس کا انجام بھی دیکھ لیا۔ اُس وقت کی ضرورت وہی تھی وہ بات اتمام پا چکی۔ اب ایک تیسری حکمت عملی کی ضرورت ہے۔

عزیزو امیری زندگی کا تعلق دیہات ہے لہذا میں دیہات کے مزاجوں کو زیادہ جانتا ہوں۔ شائد شہری لوگ بھی اس بات سے اتفاق کریں گے۔ ایک صاحب گاؤں کے رہنے والے تھے، اُن کے پاس کچھ پیسے تھے۔ شہر والوں کے پیسے تو اس لئے محفوظ رہتے ہیں کہ وہ بینکوں کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ لیکن پچاسے دیہات میں رہنے والے لوگ وہ تو اپنے پیسے کے خود ہی محافظ ہوتے ہیں۔ ایک صاحب کے پاس اتفاق سے کچھ پیسے زیادہ آ گئے۔ اب جو پیسے رکھے ہوئے ہیں تو دن رات پیسے ہی کی فکر ہے۔ پیسے ہی کی حفاظت میں سونا جاکنا سب ایک ہو گیا ہے، کوئی پیسہ نہ لے جائے۔ چور نہ آجائیں۔ ڈاکو نہ آجائیں۔ پچاسے کو ایک دن کوئی ضرورت پیش آگئی اور انھیں جانا پڑا گیا کہیں سفر میں۔ اب پریشان ہیں کہ سارا پیسہ اٹھا کے لے جائیں یا سارے سکے لاد کے لے جائیں، تو یہ اور زیادہ خطرناک سلسلہ ہے۔ گھر میں تو کچھ محفوظ بھی ہے، باہر تو جس کا جی چاہے گا لوٹ لے گا۔ اب پچاسے پریشان ہیں۔ نہ جائیں یہ بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ چھوڑ کے چلے جائیں کسی کے رحم و کرم پر یہ اور مصیبت ہے۔ آخر میں کسی دوست نے دیکھا کہ آجکل کچھ زیادہ ہی پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ کہا بھائی خیریت تو ہے۔ کہا ایک ضرورت پیش آگئی ہے اور مجھے سفر میں جانا ہے اور آپ کو تو معلوم ہے کہ اللہ کا دیا ہوا میرے پاس کچھ ہے۔ اتنا میں یہاں تھا تو میں خود حفاظت

کر رہا تھا۔ اب میں چلا جاؤں گا تو اگر ٹٹ گیا تو کیا ہوگا؟ کہا کیوں ٹٹ جائے گا؟ گاؤں میں تو سب شریف پائے جاتے ہیں، سب اللہ والے مقدس پائے جاتے ہیں۔

کہا اچھا تو فلاں کو آپ نہیں جانتے ہیں۔ وہ ایک آدمی ہے جس کا پیشہ ہی ہے چوری کرنا۔ وہ راتوں کو گھروں میں نقب لگاتا ہے اور سامان لوٹ لے جاتا ہے۔

کہا جب آپ پہچانتے ہیں تو کیا پریشانی ہے؟

کہا کیا چور کے جان لینے سے مال محفوظ ہو جاتا ہے؟

کہا جب چور کو پہچان لیا جاتا ہے تو وہی راستے ہوتے ہیں۔ یا اسے بھی اپنے ساتھ لے لیا جائے یا بہترین بات یہ ہے کہ پیسہ اُسی کے پاس رکھوا دیا جائے۔ جس دن چور کو یہ احساس پیدا ہو جائے گا کہ آپ اسے امانت دار سمجھتے ہیں، وہی محافظ بن جائے گا۔ اسلام میں ہمیشہ ہی دونوں حکمت عملی استعمال ہوتی ہیں۔ صلوات جس سے خطرہ ہو اُسی کے پاس رکھوا دیجئے خود ہی محفوظ ہو جائے گا۔

یہی وہ بات ہے جو مولائے کائنات نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمائی تھی جب دو عورتوں کے درمیان بچہ کا فیصلہ ہو رہا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ جو چاہتا ہے کہ بچہ محفوظ رہے وہ یہی چاہتا ہے کہ کسی کے پاس رہے مگر محفوظ رہے۔ امام حسنؑ پہچانتے تھے کہ خطہ کس سے ہے، بس اُسی کے ہاتھ میں رکھ دیا جائے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے گا۔ نہ جنگ کی فوج آئے گی نہ جھگڑے کا معاملہ ہوگا، وہ اپنا مال سمجھ کے بچاتا رہے گا اور میں اپنا سمجھ کے محفوظ دیکھ کے خوش ہوتا رہوں گا۔ صلوات

بس عزیزان محرم، میں نے تسلسل کو رقرارکتے ہوئے یہ دو تین مثالیں گزاریں کر دیں، اب ایک آخری مرحلہ امام حسینؑ کی حکمت عملی کے بارے میں گزارش کرنا ہے کہ امام حسینؑ کی حکمت مدینہ چھوڑنے میں کیا تھی؟ امام حسینؑ کی حکمت مکہ ترک کرنے میں کیا تھی؟ امام حسینؑ کی حکمت ارض کر بلا کو اختیار کرنے میں کیا تھی؟ مگر چونکہ گزارش

کے موضوع کے تحت بہت سی باتیں گزارش کر چکا ہوں لہذا اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے کیٹ الحمد للہ موجود ہیں۔ آپ خود ساعت فرما سکتے ہیں۔

بس ایک آخری بات کہ امام حسینؑ جب ارض کو بلا کر آگے تو امام حسینؑ علیہ السلام کی حکمت عملی پہچانے۔

یکسی اور کو معلوم ہو یا نہ معلوم ہو۔ امام حسینؑ مدینے سے جب نکلے تھے، اُس دن سے برابر اعلان کر رہے تھے کہ میں شہید ہونے کے لئے جا رہا ہوں۔ جناب ام سلمہ سے کہا۔ ابن عباسؓ نے پوچھا تو ابن عباسؓ سے کہا۔ محمد مصطفیٰ کو وصیت نامہ لکھ کے دیا اور اس سے پہلے دور قدیم سے پیغمبر اسلامؐ بتا رہے تھے کہ میرا لال سرزمین کو بلا پر شہید کیا جائے گا۔ نولائے کائنات برابر نواح کو چلے گئے۔ امام حسینؑ کے اعلانات کو سب سن رہے تھے اور امام حسینؑ اس سرزمین کو بلا پر دُورِ مَحْرَم کو دارِ مَحْضے جہاں صرف آٹھ دن رہنا ہے اور اس کے بعد پھر ہمیں شہید ہو جانا ہے۔ یہیں دُفن ہو جانا ہے۔ اور آٹھ دن کے اندر زندگی کا فیصلہ ہو جانا ہے۔ جتنے میرے ساتھی ہیں سب یہیں دُفن ہو جائیں گے اور جو بچ جائیں گے وہ یہاں نہیں رہیں گے وہ آگے چلے جائیں گے تو جس انسان کو یہ معلوم ہے کہ فقط آٹھ دن یہاں رہنا ہے اور ہمارے ساتھ والے کچھ شہید ہو جائیں گے، دُفن ہو جائیں گے اور جو زندہ رہ جائیں وہ چلے جائیں گے۔ تو وہ اتنی بڑی زمین کو ساٹھ ہزار درہم دے کر کیوں خرید پا رہے۔ کون سا محل یہاں بننے والا ہے۔ کون سا قصر بننے والا ہے۔ ایک دُفن ہے۔ عام زمین ہے۔ کوئی بھی انسان انتقال کر جائے گا وہ اسی زمین میں دُفن ہو جائے گا۔ اس کے دُفن ہونے میں کوئی شرعی اشکال بھی نہیں ہے۔ لیکن امام حسینؑ نے آنے کے بعد پہلے اس پورے علاقہ کو خریدا۔ اگرچہ خریدنے کے بعد انھیں لوگوں کے انتظام میں دے دیا اور انھیں لوگوں کے حوالہ کر دیا جن

لیا تھا۔

لیکن اس ایک حکمت حسینؑ پر غور کیجئے کہ یہاں کوئی مکان نہیں بنا تا ہے، یہاں کوئی منزل نہیں بنا تا ہے، مگر امام حسینؑ نے اس علاقہ کو خریدا۔ حکمتِ فرزندِ رسولؐ پہچانے مسئلہ زندہ رہنے کا ہے، نہ مکان بنانے کا ہے، نہ آباد ہونے کا ہے، نہ چار قبروں کی جگہ کا ہے۔ اتنا بڑا علاقہ امام حسینؑ نے خریدا اور پہلے علاقہ کو اپنا بنا یا اس کے بعد قیام فرمایا۔ اس لئے کہ امام حسینؑ جانتے ہیں کہ بہتی دنیا تک جب جنگوں کے بارے میں فیصلے ہوں گے تو دنیا کی ہر لڑائی میں ہر فرقہ کی ایک ہی فکر ہوگی کہ اپنے کو مظلوم ثابت کرے اور دوسرے کو ظالم بتائے اور ظالم و مظلوم کے فیصلہ کا ایک ہی طریقہ دنیا والوں کا ہوگا کہ کچھ عطا کر دے کون ہے۔ جو حملہ آور ہوگا وہی ظالم ہوگا اور جس پر حملہ کیا جائے گا وہی مظلوم ہوگا اور باہر ملے کرنے کے لئے یہ طے کیا جائے گا کہ جنگ کس کی زمین پر ہوئی ہے، کس کے علاقہ میں ہوئی ہے۔ جس کے علاقہ میں جنگ ہوگی وہی مظلوم ہوگا کیونکہ زمین پر ہوئی ہے، کس کے علاقہ تھا اور حملہ کرنے والے نے حملہ کر دیا۔ امام حسینؑ نے چاہا کہ قیامت تک کے لئے ایک فیصلہ کر دیا جائے کہ اب جب تک بربدیت حسینؑ کو جارح قرار دیتی رہے گی، زمین کو بلا آواز دیتی رہے گی کہ یہ حسینؑ کا خرید ہوا علاقہ ہے جو یہاں آئے ہیں وہ جارح تھے حسینؑ جارح نہیں تھے۔ صلوات

امام حسینؑ نے تو اپنی زمین پر قیام کیا تھا۔ اب اس کے بعد جو کوئی فوجیں آئی تھیں، جو شام کے لشکر آئے تھے، یہ سب زمین حسینؑ پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ یہی وہ ہیں جو ظالم تھے۔ تو اگر سیاسی نقطہ نظر سے بھی واقعہ کو بلا کا فیصلہ کیا جائے تو مظلومیت حسینؑ کا حصہ ہے۔ اور ظالم وہ ہیں جنھوں نے فرزندِ رسولؐ انقیلین پر حملہ کیا تھا اور اس کے بعد بھی امام حسینؑ نے آخری سانس تک چاہا کہ جو قدم اٹھے وہ قدم حکیمانہ ہوتا کہ میرے عمل کے بارے میں دنیا کا کوئی انسان کوئی نکتہ اشکال نہ اٹھا سکے اور دنیا میں جو بھی پاکیزہ زندگی گزارنا چاہے وہ میری ہی سیرت کو نمونہ عمل بنائے۔ اسی لئے آپ دیکھتے ہیں کہ جب فرزندِ رسولؐ انقیلین مدینہ سے باہر آئے تو ایک طرف تو یہ دیکھا گیا کہ امام حسینؑ اس کسٹن کے کبھی لے کے چلے ہیں جو پانچ بیسے گذرنے کے بعد چھ بیسے کا ہوگا اور چھوٹی چھوٹی

کو بھی لے کر چلے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی دیکھا کہ خاندان کے بزرگ بڑے افراد کو امام حسینؑ نے چھوڑ دیا ہے کہ یہ مصلحت حسینؑ کی تھی اور نہ ایسا ان کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جن کے لئے مقدر ہے کہ جائیں انھیں لے کے جائیں اور جن کے لئے مصلحت ہے کہ رہیں انھیں چھوڑ کے جائیں۔

وہ افراد جن کو امام چھوڑ کے چلے ہیں، انھیں افراد میں سے ایک جناب عبداللہ ابن جعفر بھی تھے۔ نہ جناب عبداللہ ابن جعفر کے اخلاص میں کوئی کمی تھی اور نہ ایسا ان کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ شجاعت میں کوئی کمی تھی اور نہ تقویٰ میں کوئی کمی تھی مگر مصلحت حسینؑ یہی تھی کہ یہ رہیں اور اس مصلحت کا ایک رخ تو پہلے ہی سامنے آگیا کہ جناب عبداللہ ابن جعفر نے حاکم مدینہ پر محنت تمام کرنے کا انتظام کیا اور جب فرزند رسولؐ چلنے لگے تو حاکم مدینہ کو جا کر سمجھایا کہ تجھے شرم نہیں آتی ہے۔ یہ نبی زادے کا وطن ہے، یہ پیغمبر کا مدینہ ہے اور پیغمبر کے وطن میں فواسق کی جگہ نہیں ہے، یہ کس قدر شرم ناک بات ہے کہ تیرے قدم ان فواسق ناک بات ہے۔ کچھ تو سوچنا چاہئے کہ پیغمبر کے وطن میں امان نہ ملے۔ کیا فرق ہوگا تو جیسے اہل مدینہ میں اور کفار مکہ میں کہ انھوں نے نبیؐ کو وہاں نہ رہنے دیا اور تم نے نبیؐ کے فواسق کو یہاں نہ رہنے دیا۔

ایسی تقریر کی جناب عبداللہ ابن جعفر نے کہ حاکم مدینہ اپنے اقدام کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ کہا اچھا اگر حسینؑ رہنا چاہیں تو ہم انھیں امان دے سکتے ہیں۔ جناب عبداللہ ابن جعفر ان مصلحتوں کو نہیں جانتے ہیں جو امام حسینؑ جانتے ہیں۔ خوش ہو گئے۔ اُسے فرزند رسولؐ کی خدمت میں۔ کہا میں نے حاکم سے بات کر لی ہے۔ حاکم اس بات پر تیار ہو گیا ہے کہ اگر آپ مدینہ رسولؐ میں رہنا چاہیں تو وہ سکتے ہیں آپ کو امان مل جائے گی۔

فرمایا، آپ ان باتوں کو نہیں سمجھتے ہیں جن باتوں کو میں سمجھتا ہوں اور جن کو اللہ نے مجھ سے بتایا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ میں وطن کو چھوڑ کے چلا جاؤں۔ یہ امان نامہ! یہ امان کا بیخام قابل اعتبار نہیں ہے لہذا میں جا رہا ہوں۔

کیا نبیؐ کے فواسق! یہ طے ہو گیا ہے کہ آپ جائیں گے؟ فرمایا ہاں، یہ طے ہو چکا ہے کہ میں وطن کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ عرض کی، اچھا اگر آپ جا رہے ہیں تو مجھے بھی لے چلئے۔ فرمایا، مصلحت پر درود گاریہ ہے کہ آپ یہیں رہیں۔

فرمایا اے حسینؑ! آپ مصیبتوں کی خبرنا کے اکیلے جانا چاہتے ہیں۔ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے ہیں تو اگر آپ بتلائے مصیبت ہو گئے تو میں کیسا کروں گا۔ مجھے کب معلوم ہو گا میں آپ کے کیسے کام آسکوں گا؟۔ کم سے کم یہی کہ میں کہ یہ میرے دوست ہیں، انھیں کو اپنے ساتھ لیتے جائیں تاکہ خدا نہ کر دہ اگر کوئی مصیبت آجائے اور میں آپ کے کام نہ آسکوں تو کم سے کم یہ میرے بچے ہی آپ پر قربان ہو جائیں۔

آخر کفر علی اللہ۔ خدا آپ کو کسی غم میں نہ ڈالے، سوائے غم آل محمد کے۔ بس اور باب غرا، میں بیان کو آخری منزل تک لے آیا۔

ایک طرف جناب عبداللہ ابن جعفر نے یہ اہتمام کیا اور دوسری طرف ثانی نہر اُٹیں اور عبداللہ کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ چہرہ اُداس ہے خاموش بیٹھی ہیں۔ جناب عبداللہ نے کہا بنسبت فاطمہؑ! آج آپ کو اُداس دیکھ رہا ہوں خاموش دیکھ رہا ہوں کچھ دلچسپی بھی نہیں ہیں کچھ فرمائی بھی نہیں ہیں، خیریت تو ہے؟ کہا عبداللہ، آپ کو تو معلوم ہے کہ میرا بھائی وطن چھوڑ کر جا رہا ہے۔ کہا ہاں مجھے معلوم ہے۔ مولائے فرمایا ہے کہ حکم ہے پیغمبر کا میں جا رہا ہوں۔ کہا اے عبداللہ! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ زینبؑ نے کبھی اپنے بھائی کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔

کہا دختر زہرا! پھر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ کہا میں بھائی کے پاس گئی۔ بھتیانے کہا کہ میں تم کو ضرور لے جاؤں گا۔ مگر تم پر عبداللہ کا بھی حق ہے۔ جاؤ ان سے اجازت لے کر آؤ۔ والی! آپ فرمائیے کہ کیا

فرماتے ہیں:-

کہا مولا اگر لے جانے کے لئے تیار ہیں تو میں کون روکنے والا؟
ثانی زہرا انھیں اور مطمئن نفس کے ساتھ بھائی کی خدمت میں آئیں۔ کہا بھیا!
میں جدا اللہ سے نصرت ہو کر آگئی۔ اب میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔
قافلہ مدینہ سے چلا مکہ آیا۔ ۸ ذی الحجہ کو مکہ سے قافلہ چلا۔ ۲ محرم کو سرزمین کربلا
پر وارد ہو گیا۔ عاشور کی رات آئی۔ اور آخری گفتگو تمام ہو گئی تو بہن نے بھائی سے
پوچھا۔

بھیا! آخری گفتگو کا نتیجہ کیا ہوا؟

کہا، بہن یہ آخری رات ہے۔ کل بہن بھائی میں جدا ہو جائے گی۔ کل
آل محمد کی قربانی کا دن ہے۔
ساری خواتین نے سنا کہ کل قربانیوں کا دن ہے۔

اب جو عاشور کی رات گذر رہی ہے تو مورخین کی رسائی تو خیام حسینی تک
نہیں ہے مگر جذبات کی رسائی ہر جگہ ہے۔ لہذا مورخین نے، محدثین نے، مقتسل
لکھنے والوں نے ان جذبات کی تصویر کشی کی ہے کہ یہ رات خیام حسینی میں کیسے گذری۔
بیبیوں کا جہیز قربانی انھیں آمادہ کر رہا ہے کہ ہر خاتون اپنے بچے کو سمجھا رہی ہے، بیٹا!
دیکھو کل قربانی کا دن ہے۔ بیٹی ہاشم میں کوئی نہ جانے پاسے۔ پہلے تم قربان ہو جانا پہلے
تم مولا کے قدموں پر قربان ہو جانا تاکہ میں سیدانیوں کے سامنے جانے کے قابل رہ جاؤں
ہر طرف ایک ہی چرچا ہے۔

اور ثانی زہرا اپنے سامنے گود کے پالوں کو بٹھائے ہوئے فرما رہی ہیں۔
بیٹا! کل قربانی کا دن ہے۔ میرے لال! ماموں پر قربان ہونا ہے۔ اور بیٹا دیکھو
داد شجاعت دے کے قربان ہونا ہے۔ اللہ نے تمہیں دہرا دہر دیا ہے۔ دادا
جعفر طیار۔ نانا جبرہ کرار۔ میدان میں یوں جہاد کرنا کہ کوئی جعفر طیار کی شان کو
پہچانے اور کوئی جبرہ کرار کے انداز کو پہچانے:

تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
فوجیں بیکار آٹھیں کہ ذرا سے علی کے ہیں

اَجَلُكُمْ عَلَى اللَّهِ

رات گذری۔ یہاں تک کہ قربانیوں کا وقت آ گیا۔ جب چاہنے والے کام
آگے اور بنی ہاشم میں اولاد عقل بھی قربان ہو چکی، تو ایک مرتبہ پھر اُداں چہرہ
کے ساتھ بہن بھائی کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

زینب! کچھ کہنا چاہتی ہو؟

کہا ہاں بھیا کچھ تو کہنا ہے۔

کہا بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو؟

کہا دیکھ تو رہے ہیں آپ ایک کے بعد ایک جاکے قربان ہو رہا ہے۔

اے بھیا ایک بات مجھے آپ سے کہنا ہے اور اس اعتماد سے کہنا ہے کہ

زینب کی بات آپ ٹال نہیں سکتے ہیں۔

کہا زینب! بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو؟

کہا آقا۔ مولا۔ میرے مانجھے! میری گود کے پالوں کو اجازت دیجئے،

فرزند رسولؐ نے سر جھکا لیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ زینب تم نے عجیب

سوال کر لیا۔ مگر کیا کروں آج قربانی کا دن ہے۔ آج سب کو راہِ خدا میں قربان ہونا ہے۔

ہاؤ میں نے اجازت دے دی۔

ماں نے بیٹوں کو سجایا، سب کے میدان کی طرف بھیجا۔ دونوں لال چلے۔ مہینہ

کی طرف عون چلے، میسرہ کی طرف محمد چلے۔ اور دونوں زینب کے لال مصروف جہاد

ہیں۔ بڑھتے بڑھتے جب ایک بھائی نہر کی طرف چلا تو دوسرے نے پکار کے کہا

بھیا قدم آگے نہ بڑھانا۔ بھیا دریا کا رخ نہ کرتا۔ علی اصغر بیا سے ہیں۔ سیکھتے

سیا سی ہے۔ داد شجاعت دیتے رہے یہاں تک کہ زخموں سے چور ہو گئے گھوٹے

ہے گئے۔ آہ از دی مولا بلغاموں کی خبر لیجئے مولا!

حسینؑ قتل کی طرف چلے۔ عباسؑ کو ساتھ لے کر چلے۔ بچوں کے سر چھلنے آئے۔ ایک لاشہ کو عباسؑ نے اٹھایا۔ ایک لاشہ کو حسینؑ نے اٹھایا۔ لاکے خیمہ میں رکھا۔ فتنہ دوڑ کے آئیں۔ شہزادی چلے آپ کے لال آئے ہیں۔ بس روکنے والو مجلس تمام ہو گئی۔ کہا میں کیا کروں۔ میں نے کوئی واپس آنے کے لئے بھیجا تھا؟ یہ کیوں پلٹ کے آئے؟

کہا شہزادی! چل کے دیکھئے کہ کیسے آئے ہیں؟

اب جو مڑ کے دیکھا تو صحن خیمہ میں دو لاشے۔ زینبؑ نے سر سجود میں رکھ دیا۔ پروردگار! تیرا شکریہ کہ میرے بچوں نے مجھے بھیٹا کے سامنے سرخو کر دیا۔ شاہاش میرے بچو! تم نے ماں کے دودھ کی لاج رکھ لی اور بہن کو بھائی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دیا۔ جاؤ خدا حافظ۔ اب زینبؑ ہے اور مصائب ماں ہے اور کوئو شام کی منزلیں۔ افسوس میرے بھیٹا کے محافظ مارے گئے اور اب بچتن کا خاتمہ قریب آیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ساتویں مجلس

انقلاب امام حسین علیہ السلام

”حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ اس سے محبت کرے جو میرے حسینؑ سے محبت کرے۔“

سرکارِ دو عالمؐ کے ارشادِ گرامی کی روشنی میں جو سلسلہ کلام ”عزنان امام حسینؑ“ سے متعلق آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا، اس کے ساتویں مرحلے پر کچھ باتیں انقلاب امام حسینؑ سے متعلق گزارش کرنا ہیں۔

انقلاب ایک ایسا لفظ ہے جس سے دنیا کا ہر انسان آشنا ہے۔ اور شائد ہی کوئی مان ایسا ہو جس نے دنیا میں انقلاب کی آواز نہ سنی ہو۔

فرق صرف یہ ہے کہ دنیا کے انقلاب کا انداز اور ہوتا ہے اور مذہب کے انقلاب کا انداز اور ہوتا ہے۔

میں آج مختصر انداز سے سہی مگر امام حسینؑ کے انقلاب کے خصوصیات اور اثرات کے بارے میں کچھ باتیں قدرے تفصیل سے گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ کوشش یہ کر دوں گا کہ تمہید میں زیادہ وقت صرف نہ ہونے پائے اور جو خصوصیات سرکارِ شہداءؑ میری نگاہ کے سامنے ہیں ان میں سے کچھ دس پانچ تو بیان ہو جائیں۔

دنیا میں جو انقلابات آتے ہیں عام طور سے ان کے ڈو ذرائع ہوتے ہیں اور دو عناصر ہوتے ہیں۔ یا تو انقلاب لانے والے لوگ اپنے اندر کوئی صلاحیت چھپاتے

ہیں اور ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کو مانا نہیں گیا ہے لہذا کسی کے تحت اقتدار کو اٹھ کر اپنی شخصیت کو منوایا جائے۔ یا انقلاب کرنے والے لوگ وہ ہوتے ہیں جو جانتے ہیں کہ انقلاب کے بغیر ہماری کوئی شخصیت نہیں ہے۔ اگر ہمارے ہاتھوں انقلاب آگیا تو ہماری کوئی شخصیت ہو جائے گی۔

ان دونوں باتوں کا فرق آپ پر واضح ہے۔ انقلاب لانے والے اپنی شخصیت کا اظہار چاہتے ہیں یا اپنی کمزری کے احساس کی بنا پر انقلاب کے ذریعہ اپنی شخصیت بنانا چاہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر آدمی کی نگاہ انقلاب کے نتیجے میں یا مال و منال، راحت و آرام اور کسی اقتدار پر ہوتی ہے یا وہ اپنی شخصیت بنا کر اس کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔ پھر ان دو مقاصد حاصل کرنے کے لئے دو راستے اختیار کئے جاتے ہیں۔

ایک راستہ کا نام ہے ظلم اور دوسرے راستہ کا نام ہے فساد۔ ظاہر ہے کہ فساد بھی ایک ظلم ہی کی قسم کا نام ہے اور ظلم بھی فساد ہی کی ایک قسم ہے۔ لیکن دونوں میں تھوڑا سا فرق ضرور پایا جاتا ہے، جس سے آپ ظلم کے معنی بھی محسوس کر لیں گے اور فساد کے معنی بھی سمجھ لیں گے۔

یہ ساری باتیں جو میں گزارش کر رہا ہوں ان سب کے پیچھے قرآن مجید کی بیان کی ہوئی تاریخ بھی ہے۔ مگر ان تفصیلات میں جانے کے بعد خدا کا اصل مدعا کا وقت نہ رہ جائے۔ اس لئے جو باتیں میں گزارش کر رہا ہوں آپ قرآن سے ان کا مطالعہ کر لیں گے تو ساری باتیں آپ کو نظر آجائیں گی۔

مثلاً قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ جب جناب ہمارے نے قوم خود کے سامنے پیغام الہی پیش کیا تو لوگوں نے نبی خدا کی مخالفت کرنے کے لئے اور نبی خدا کی آواز کو دبانے کے لئے نبی کے کردار میں وہی شبہ پیدا کرنا چاہا جو دنیا کے ہر انقلاب میں ہوتا ہے۔

کہا بھائیو خبردار! ان کے کہنے میں نہ آجانا۔ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں ان کو کہنے دو۔ ان کے کلمات، ان کے کرامات، ان کے معجزات ان کے ساتھ ہیں۔ ورنہ یہ کوئی بات

سمجھ میں آنے والی ہے کہ ہم بھی میں کا ایک انسان، ہمارا ہی جیسا ایک بشر۔ اور وہ گناہ پروردگار بن جائے اور ہم سب اس کے غلام بن کر اس کی اطاعت کرنے لگیں، یہ نہیں ہو سکتا ہے۔

کیا اس کا امکان ہے کہ پروردگار ہم سب کو چھوڑ کر اپنا پیغام ایک انسان پر نازل کر دے۔ آخر اس انسان میں کون سی بات پائی جاتی ہے، جیسے ہم بشر ویسے یہ بشر جیسے ہم انسان ویسے ہی یہ بھی انسان۔ اعضاء و جوارح ایک جیسے حرکات و سکنات ایک جیسے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس پر ذکر نازل کر دیا جائے ہم سب کو چھوڑ کر۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ خدا پر الزام رکھنے والا، جھوٹ بولنے والا انسان ہے، اور لالچی ہے۔ چاہتا ہے کہ اس طریقہ سے قوم کے سروں پر حکومت کرے اور لوگ اسے نبی خدا مان لیں۔

گو یا یہ پہلا الزام تھا جو قوم نے نبی خدا پر لگایا کہ ان میں ہوس اقتدار ہے۔ ہر کسی پر بیٹھنا چاہتے ہیں۔ یہ بیت المال پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ قومی سرمایہ کو اپنی شہمی میں لینا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد پروردگار عالم نے اپنے نیک بندوں کو جو صاحبان ایمان کہے جاتے تھے، جو کلہ پڑھ کے مسلمان ہو گئے تھے انہیں یہ بھیجا کہ دیکھو خبردار! تمہارا کردار و ایمان نہ ہو جائے جیسا کفار و مشرکین کا کردار تھا۔ کفر کی دنیا الگ ہے، اسلام و ایمان کی دنیا الگ ہے۔ دیکھو پیغمبر کا اتباع کرو۔ اگر کلہ پڑھا ہے تو اسی خط مستقیم پر چلتے رہو۔ اسی راہ مستقیم کا اتباع کرو۔ خبردار آپس میں جھگڑا نہ کرنا۔ اگر آپس میں جھگڑا کرو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ اتحاد میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ افتراق میں وہ طاقت نہیں ہوتی۔

یہ سب سمجھانے کے بعد پھر پروردگار نے ایک اور نصیحت کی۔

دیکھو ان کفار و مشرکین جیسے نہ ہو جانا جو اپنے گھروں سے نکلے اپنے غور کی بنیاد پر اپنے گھروں کا رعب جملنے کے لئے۔ تم مسلمان ہو تم میں یہ خرابی، یہ عیب نہیں ہونا

jabir.abbas@yahoo.com

چاہئے۔ یعنی اگر بھاری شخصیت ہے بھی تو خبردار اس کے مظاہرہ کی فکر نہ کرنا۔
یہ دُعا باتیں آپ نے محسوس کیں۔

پہلا الزام تھا کہ یہ شخصیت بنا نا چاہتے ہیں۔

دوسری بات خدا نے سمجھائی کہ اگر شخصیت ہے۔ مسلمان ہو گئے ہو۔ یوں ہو گیا ہو۔ اتحاد اسلامی پیدا ہو گیا ہے تو اس کے اظہار کی کوشش نہ کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ غرور اتحاد پیدا ہو جائے، غرور اسلام پیدا ہو جائے۔ تو اسلام نہ حرص کو برداشت کرنا ہے اور نہ غرور کو برداشت کرنا ہے۔

اب آئے دو باتیں اور جو میں نے گزارش کی ہیں کہ اہل دنیا جب اختیار چاہتے ہیں یا مظاہرہ اختیار چاہتے ہیں تو اس کے دُعا راستے ہوتے ہیں، یا ظلم یا فساد۔

آج دنیا میں آپ دیکھ لیجئے کہ جب انقلابات شروع ہوتے ہیں تو یہی دو راستے اپنائے جاتے ہیں۔ جن میں ذرا کچھ طاقت زیادہ ہوتی ہے وہ ظلم کو سہارا بناتے ہیں۔ جو ذرا کمزور ہوتے ہیں ان میں اتنا دم تو نہیں ہوتا ہے کہ آدمیوں کو مار سکیں، انہی طاقت تو نہیں ہوتی ہے کہ ان فوں کو فنا کر سکیں۔ ان کے لئے انقلاب کا ایک ہی راستہ ہوتا ہے کہ یہاں بس میں آگ لگا دی، یہاں ٹرین میں آگ لگا دی، یہاں فلاں عمارت جلادی، وہاں فلاں بلڈنگ کو آگ لگا دی۔ تاکہ اس کے ذریعے سے تختہ اقتدار تنک پہنچ جائیں۔ آپ ان بیچاروں سے پوچھئے کہ کرسی پر تم بیٹھو گے یا وہ بیٹھے ہیں۔ بسوں نے کیا تصور کیا ہے۔ ریل نے کیا خطا کی ہے۔ جہاز نے کیا برائی کی ہے۔ سڑکوں نے کیا عیب کیا ہے۔ مٹوں میں کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ نہیں ہوا ہو کہ کیا فساد برپا کر رہی ہیں۔ انھیں برباد کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ ان سے تو فائدہ عام کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ ان سے تو مفاد ملک کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ مگر

تختہ تنک جانا چاہتا ہے اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی ہے۔ فساد کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ ظالم نہ دیکھا جائے، مظلوم نہ دیکھا جائے۔ انسان نہ دیکھا جائے اور ملک کی معیشت کو برباد کر دیا جائے۔

جب جناب سلیمان کا خط بلقیس کے پاس پہنچا تو اس نے دربار والوں کو بلایا اور کہا کہ میرے پاس ایک خط آیا ہے۔ ایک آدمی ہے جو اپنے کو بڑا آدمی کہتا ہے اور اس سے اطاعت کا مطالبہ کر رہا ہے۔ کہتا ہے شرافت سے مسلمان ہو کے آجاؤ۔ بتاؤ تم لوگوں کی رائے کیا ہے، ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

لوگوں نے کہا ہوشیار رہئے مصلحا۔

بادشاہت کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ جس قریب میں داخل ہو جائے اسی میں فساد پکڑا کر اسی کو تباہ و برباد کر دے۔ ذرا ان شیروں کی عقل دیکھئے۔ یہ بیٹھے ہیں بلقیس کے دربار میں۔ وہ مشورہ کر رہی ہے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ بلقیس کیا الگشن لڑکے سربراہ ہوئی ہے؟ اُسے کیا لوگوں نے مل کے منتخب کر کے حکومت کا حاکم بنا دیا ہے؟

مُردے آگے ہی تو کہا تھا جناب سلیمان سے کہ میں نے دیکھا ہے کہ ایک ملک ہے۔ ایک بادشاہ ہے۔ خاقان۔ عورت۔ جو لوگوں کو اپنی ملکیت بنائے ہوئے ہے اور

ہمت و اتاعت اس کے پاس ہے۔ یہ تو خود ہی ملک ہے۔ یہ تو خود ہی بادشاہ ہے۔ یہ خود ہی ملکیت کی ماری ہوئی ہے۔ اور شیروں کی عقل دیکھئے وہ اسے سمجھا رہے ہیں کہ لوگ

سب کہیں داخل ہوتے ہیں تو فساد برپا کر دیتے ہیں۔ کوئی اتنا بھی نہیں سوچتا کہ ملک کے اُس نے اتنا پوچھ لیا کہ اتنا آدمی تم پر کیا کہہ رہے ہو۔ یہ ملکیت کا مزاج کہاں ہوتا ہے۔ مگر وہ سمجھا نا یہ چاہتے ہیں کہ آپ چونکہ ہمیں کی ہیں، لہذا آپ سے کوئی

سلطہ نہیں ہے۔ باہر والا اگر آجائے گا تو اپنے مزاج کو ہمیں استعمال کرے گا۔ یعنی اگر وہ آپ کے تخت پر قبضہ کرنا چاہے گا تو اس کا طریقہ یہی ہوگا کہ فساد برپا کرے گا۔

یعنی یہ ہیں وسائل انقلاب یا فساد یا ظلم۔ ساری دنیا کی تاریخ ان چار نقطوں میں گئی ہوئی ہے۔

اب اگر اس نکتہ کو آپ نے پہچان لیا ہے تو اب پڑھئے امام حسینؑ کا وصیت نامہ۔

میں نے یہ سب سے پہلے لکھے تو محمد حنفیہ کے نام ایک وصیت نامہ لکھا تاکہ لوگ میرے انقلاب کو پہچان لیں۔ میں لایچ میں نکلا ہوں، نہ غزوہ کی بنیاد پر نکلا ہوں، نہ فساد کرنا چاہتا ہوں

اور ظلم کرنا چاہتا ہوں۔ میں امت پیغمبریں اصلاح چاہتا ہوں۔ اب بیچا نا وہ چاروں راستے جو دنیا کے انقلاب کے تھے انھیں حسین نے بند کر دیا۔ اور فرمایا کہ نہ ہی انقلاب اصلاح کے لئے آتا ہے، تخت و تاج کے لئے نہیں آتا ہے۔ صلوات

تو جب دنیا کا انقلاب الگ ہے اور مذہب کا انقلاب الگ ہے۔ تو فرزند رسول! اگر آپ ان میں سے کچھ نہ کریں گے تو کیسے آپ اقتدار قائم کریں گے، کیسے انقلاب کریں گے؟ کہا اس کا طریقہ بھی میں جانتا ہوں۔ میں اپنے جد کی امت کی اصلاح چاہتا ہوں۔ یعنی اگر کوئی پوچھے کہ جب کوئی نہیں اٹھ رہا ہے تو آپ ہی کو کیا ضرورت ہے۔ تو امام حسین نے کہا ان سب میں اور مجھ میں فرق ہے۔ ان میں کوئی صاحب مذہب کا وارث نہیں ہے۔ اسلام نہ کسی کے باپ کا ہے نہ کسی کے دادا کا ہے۔ اسلام میرے نانا کا ہے۔ لہذا جو امت کی ذمہ داری نبی کے واسطے پر ہے وہ کلمہ کو افراد پر نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ اٹھیں یا نہ اٹھیں میں اپنی وراثت کا تحفظ بہر حال کروں گا۔ صلوات

تو عزیران محترم! امام حسین نے فرمایا کہ میرا مقصد تخت و تاج نہیں ہے۔ نہ بیت المال پر قبضہ کرنا ہے۔ نہ اپنے اقتدار کی نمائش کرنا ہے۔ نہ اپنا اقتدار قائم کرنا ہے۔ میں اپنے جد کے امت کی اصلاح چاہتا ہوں۔ تو مولا ہمیں یہ معلوم ہے کہ جو تخت تک جانا چاہتے تھے وہ ظلم کو ذریعہ بناتے ہیں۔ فساد کو ذریعہ بناتے ہیں۔ لیکن آپ اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا ذریعہ کیا ہو گا۔

فرمایا۔ میں نیکیوں کا حکم دیتا چاہتا ہوں اور بُرائیوں سے روکنا چاہتا ہوں۔ جب نیکیوں پر عمل ہو جائے گا لوگ بُرائیوں سے روک جائیں گے تو خود ہی اصلاح ہو جائے گی۔ نہ خنجر درکار ہے نہ تلوار اور نہ طاقت۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیسے آپ نیکیوں کا حکم دیں گے؟ اتنے حکم دیئے والے ہیں مگر کسی کی بات کا کوئی اثر نہیں ہے۔ کیا آپ کے پاس کوئی مخصوص طریقہ ہے امر و نہی کا، امر و نہی کے ذریعہ سے آپ امت کی اصلاح کریں گے؟

فرمایا۔ ہاں ہاں میرے پاس نہایت طریقہ ہے۔ میں امر و نہی کی راہ میں دو چیزیں

اختیار کروں گا۔ ایک میرے جد کی سیرت ہے۔ ایک میرے باپ کی سیرت ہے۔ اصلاح امت میں دو ہی سیرتیں کام آتی ہیں۔ یا سیرت پیغمبر کا سیرت علیؑ کی سیرت کوئی تیسری سیرت شامل ہوگی تو فساد برپا ہو گا۔ امت کی اصلاح نہیں ہو سکتی ہے صلوات

امام حسین نے اپنے دور میں یہ بات نہایت ہی واضح طور سے ارشاد فرمادی۔ اور یہ بھی زبانی نہیں فرمائی اور نہ کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا، بلکہ لکھ کے دیا محمد حنفیہ کو وصیت نامہ، تاکہ ہمیشہ کے واسطے یہ ایک دستاویز بن جائے انقلاب حسینی کی۔

اور شاہد امام حسین نے لکھ کے اس لئے بھی دیا جو کہ جانتے ہیں کہ جب کوئی بات نہیں لکھی جاتی ہے تو اس سے امت میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ اور دوسروں سے نہیں کہتا ہے کہ کوئی قلم دے تو لکھیں۔ میں خود لکھ کے جاؤں گا تاکہ میری وصیت کسی کی شرمندہ احسان نہ ہونے پائے۔ صلوات

تو امام حسین کا یہ کہنا کہ اصلاح کروں گا۔ نیکیوں کا حکم دوں گا۔ بُرائیوں کو روکوں گا۔ خود اس بات کی علامت ہے کہ سماج سے نیکیاں اُٹکی ہیں، بُرائیاں اُٹکی ہیں۔ ورنہ اگر نیکیاں ہیں تو نیکیوں کا حکم دینے کے معنی کیا ہیں اور اگر بُرائیاں نہیں ہیں تو بُرائیوں سے روکنے کے معنی کیا ہیں؟

امیر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ اس بات کی علامت ہے کہ نیکیاں نہیں ہیں انھیں پیدا کرنا ہے۔ بُرائیاں پیدا ہو گئی ہیں ان سے روکنا ہے۔

یہ نقشہ ہے سماج کا جو امام حسین نے بیان کیا ہے لیکن انقلاب امام حسین کو پہچاننے کے لئے میں ایک لفظ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ کون سا دنیا میں دور ایسا آیا ہے جب نیکیاں غائب نہ ہوئی ہوں۔ بُرائیاں موجود نہ رہی ہوں۔ انبیاء کا دور دیکھئے، مسلمان کا زمانہ دیکھئے۔ خود میرا دور عالم کا زمانہ دیکھئے۔ کس دور کا دور ہے کہ میرا دور ہے کفار مر گئے تھے، کفر نہیں چلا گیا تھا، شرک نہیں فنا ہوا تھا، بت پرستی نہیں ہو گئی تھی؟ شراب کے سارے کارخانے بند ہو گئے تھے؟ جوئے کے سارے کارخانے بند ہو گئے تھے؟ سود کاری کیا بند ہو گئی تھی؟ بُرائیاں تو موجود تھیں۔ بُرائیاں

ہر دور میں موجود رہی ہیں، کوئی دور زمانہ کا ایسا نہیں آیا ہے جب سماج میں بُرائیاں نہ ہوں اور کیا آج بُرائیاں نہیں ہیں۔ کیا لوگ جھوٹ نہیں بولتے ہیں؟ بے ایمانی نہیں کرتے ہیں؟ غدا ہی نہیں کرتے ہیں؟ شراب نہیں پیتے ہیں؟ کون سا کام دنیا میں ہے جو نہیں ہو رہا ہے۔

جناب آدمؑ کے دور میں ہو رہا تھا جب کل چار نفر کی آبادی تھی، جس کی کوئی اوقات نہیں، کوئی شمار نہیں۔ وہاں بھی اتنا بڑا جرم ہو گیا کہ بھائی کا قاتل بن گیا۔ تو جب جناب آدمؑ کے دور میں یہی حال رہا۔ جناب نوحؑ کے زمانے میں یہی حال رہا۔ جناب ابراہیمؑ، جناب موسیٰؑ، جناب عیسیٰؑ، سرکارِ دو عالم، ہر دور میں معرفت کا فقدان رہا ہے۔ ہر دور میں منکرات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ تو آخر امام حسینؑ نے امر و نہی کے لئے اتنی بڑی قربانی کا ارادہ کیوں کر لیا؟

اگر یہ کام اس قدر ضروری ہوتا تو سارے انبیاء و مرسلین اپنے اپنے گھر والوں کو لے کر نکل پڑتے اور سب اپنے سر کی بازی لگا دیتے۔ اپنے گھر کو لٹا دیتے۔ لیکن اگر اس کے پہلے ایسا نہیں ہوا ہے تو تنہا ایک امر و نہی کی خاطر امام حسینؑ اپنے اتنے بڑے گھرانے کو لے کر کیوں اٹھے اور سب کو واہِ حق کیوں قربان کر دیا۔ یہ امر و نہی کی کون سی قسم ہے یا کون سا دور آگیا ہے کہ امام حسینؑ کو نیکیوں کا فقدان برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ کوئی ایسی بات تو ہونی چاہئے کہ جو اس کے پہلے نہیں تھی، اب پیدا ہو گئی ہے کہ اب تک خاصانِ خدا برداشت کرتے رہے ہیں مگر اب حسینؑ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

میں پھر لفظوں کو دہراؤں گا۔ بُرائیاں ہر دور میں رہی ہیں، نیکیوں کا فقدان ہر زمانے میں رہا ہے۔ مگر ایک نئی بات جو پیدا ہو گئی تھی دورِ امام حسینؑ میں، وہ بات فقط اتنی ہے کہ امام حسینؑ کے دور میں ایک ایسا وقفہ آیا تھا جو اپنی پچھلی تاریخ سے بھی الگ تھا، اور اپنے بعد کی تاریخ سے بھی الگ ہے۔ لہٰذا جو ذمہ داری امام حسینؑ پر تھی وہ نہ اس کے پہلے کے خاصانِ خدا پر تھی اور نہ اس کے بعد کے

خاصانِ خدا پر عائد ہوئی۔

اس دور کی خصوصیت کو آپ پہچانیں کہ اچھائیاں ہمیشہ غائب رہیں اور بُرائیاں ہمیشہ رہیں۔ مگر فرق یہ رہا کہ ہر دور میں اچھائیوں کا فقدان اور بُرائیوں کا وجود اسلام سے الگ رہا۔ ایمان سے الگ رہا۔ مذہب سے الگ رہا۔ دینِ خدا سے الگ رہا۔

دینِ خدا الگ، شراب الگ۔ دینِ خدا الگ، زنا الگ۔

اچھے بندے بھی پائے جاتے تھے۔ شرابی اور سود خوار بھی پائے جاتے تھے۔ مگر دونوں الگ الگ تھے۔ جو اچھا تھا وہ شرابی نہیں تھا۔ جو شرابی تھا وہ اچھا نہیں تھا۔ دورِ آدمؑ سے لے کر دورِ خاتمِ تک کی تاریخ پڑھ لیجئے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ یہ اللہ والے ہیں، وہ بے ایمان ہیں۔ یہ اللہ والے ہیں، وہ نالائق ہیں۔ مگر کوئی ایک اللہ والا ڈھونڈھ کے نکالے جو نالائق بھی رہا ہو جو دلی بھی رہے اور بے ایمان بھی رہے۔ وصی بھی رہے اور نالائق بھی رہے۔ معاذ اللہ۔ نبی بھی رہے اور خطا کار بھی ہو۔

مگر دورِ حسینؑ میں یہ عیب پیدا ہو گیا تھا کہ خلیفۃ المسلمین بھی تھا شرابی بھی تھا۔ اسلام کا ذمہ دار بھی تھا، بدکار بھی تھا۔

یعنی مذہب کو بُرائیوں سے جوڑ دیا گیا تھا اور بُرائیاں داخلِ مذہب ہو گئی تھیں۔ شراب پی کے بڑے خلیفہ ہے۔ زنا کر کے خلیفہ ہے۔ بُرائیاں کر کے خلیفہ ہے۔ ظلم کر کے خلیفہ ہے۔ خلافتِ اسلامی کو بُرائیوں سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اب امام حسینؑ نہ بڑے ماسنے کی فکر میں ہیں اور نہ ساری بُرائیوں کو ختم کر سکتے ہیں۔ وہ بنِ دونوں کو جوڑ دیا گیا ہے انھیں الگ کرنا چاہتے ہیں۔ چاہے میرے سرِ وقت میں بھی چڑائی ہو جائے۔ مگر جس کو جوڑ دیا گیا ہے یہ جڑنے نہ پائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی متدین الگ ہوتے ہیں اور بے دین الگ ہوتے ہیں۔ یمن الگ ہوتے ہیں اور شرابی بدکار الگ ہوتے ہیں۔ نہ پہلے دونوں ایک ہو سکے نہ اس کے

بعد دونوں ایک ہو گئے۔ یہ انقلاب حسینی کا پہلا اثر تھا کہ امام حسینؑ نے جان دے کر
منکرات کو الگ کر دیا اور مذہب کو الگ کر دیا۔ تو اگر آج اسلام میں شراب نہیں ہے اگر
آج اسلام میں سود نہیں ہے۔ اگر آج اسلام میں زنا نہیں ہے۔ اگر آج اسلام میں بدکاری
نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک یہ احساس زندہ رہے گا کہ اسلام الگ ہے اور
شراب الگ۔ ہر ذرہ آواز دیتا رہے گا کہ حسینؑ زندہ باد! تم نے میدان جیت لیا۔ اب
کسی کے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ بدکاری کے نام پر حاکم ہو جائے۔
یہ حسینؑ کی کامیابی کا پہلا اثر تھا۔

سرکارِ دو عالمؐ نے جب اپنا انقلاب شروع کیا تو حضور کے سامنے جو برائیاں تھیں
ان ساری برائیوں کو حضور نے دنیا کے سامنے واضح کر دیا اور انہیں واضح کر دیا کہ اگر وہ عالم
کا پورا دور آپ دیکھیں اور اس کے بعد دیکھیں تو آپ کا اندازہ ہو جائے گا کہ اب نہیں
ہو سکتا ہے کہ انسان موحّد بھی ہو اور بت پرست بھی ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ
حاکم بھی پڑے اور عیون کی پرستش بھی کرے۔ نئی دونوں کو الگ کرنا چاہتے تھے۔
حضور کا مایاب ہو گئے کہ انھیں الگ کر دیا۔ تو اسے خلافت اسلامی کو منکرات سے الگ
کرنا چاہتا تھا۔ یہ حسینؑ کی پہلی کامیابی ہے کہ منکرات کی دنیا الگ ہو گئی اور مذہب
کی دنیا الگ ہو گئی۔ صلوات

بس عزیزانِ محترم! میں بات کو سیٹ رہا ہوں تاکہ میں انقلاب حسینی کے
اور اثرات آپ کے سامنے گزارش کر سکوں۔
تو پہلا اثر ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اس کے بعد بھی اگر کسی نے کوشش کی کہ منکرات
کو، برائیوں کو، بدکاریوں کو مذہب سے ملا دیا جائے تو اس کوشش کا آخری انجام یہ ہوا
کہ برائیاں وہ گہیں ملانے والے مٹ گئے، بلکہ وہ مذہب ہی چلا گیا۔ وہ نام ہی چلا گیا۔
بڑبڑنے برائیوں کو مذہب سے جوڑا تھا خلافت کے نام پر۔ حسینؑ دونوں کو الگ کرنا چاہتے
تھے امامت کے نام پر۔ یہ فتح حسینؑ ہے کہ ملانے والا سلسلہ ختم ہو گیا اور الگ کرنے
والے سلسلہ کا آخری وارث آج بھی قائم ہے۔ صلوات

اور مالک نے اسے اسی لئے باقی رکھا ہے کہ سرکارِ دو عالمؐ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ نے والا
دنیا کو عدل و انصاف سے دیے ہی بھر دے گا جیسے دنیا ظلم و جور سے بھری ہوئی ہوگی۔
یہ انقلاب حسینی کا پہلا اثر تھا۔ اس کے بعد سلسلہ دار آپ اثرات دیکھتے جائیں
آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔

مزید بت نے امام حسینؑ کے خلاف پہلا حربہ استعمال کیا انقلاب حسینی کو ناکام
بنانے کے لئے جو کہے رسالہ کو بھیج کر۔ اور جو کہے لشکر نے اگر امام حسینؑ کے راستہ کو
روکا تو دونوں کی گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ ایک ایسا راستہ اختیار کیا جائے جو نہ اُدھر
جاتا ہو نہ اُدھر جاتا ہو۔ یعنی نہ امام حسینؑ مدینے جائیں اور نہ محرام حسینؑ کو مدینہ
کو فٹ لے جائے۔ جب تک کہ ابن زیاد کے پاس سے جو کہے خط کا کوئی جواب نہ آجائے۔
حُسنے ابن زیاد کو خط بھیج دیا کہ حسینؑ سے ملاقات تو ہو گئی ہے اور فی الحال حسینؑ
ہمارے قبضے میں ہیں اور ہم ان کو مدینہ واپس نہ جانے دیں گے۔ لیکن اب آپ فرمائیے
کہ آپ کا کیا حکم ہے؟ اگر آپ کہتے ہیں کہ انھیں گھیر کر لایا جائے کہ فو تو ہم کو فٹ لے لیں
اور اگر آپ کہیں کہ انھیں چھوڑ دیا جائے تو ہم چھوڑ دیں یہ اپنے وطن واپس چلے جائیں۔
آپ کے حکم کا انتظار ہے۔

ابن زیاد کا جواب آیا۔ جس کے بعد حُسنے یہ طے کر دیا کہ اب یہ قافلہ آگے نہیں
بڑھے گا۔ اور بالآخر ایک منزل پر آئے امام حسینؑ نے اپنے قافلہ کو روک دیا۔
اس جواب میں سب سے پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ جیسے ہی میرا
خط ملے، دیسے ہی حسینؑ کے راستہ کو روک دو اور جب یہ اپنے قافلہ کو ٹھہرانا چاہیں
اپنے جیسے ٹھکانا چاہیں تو ایسی جگہ پر ان کے قافلہ کو ٹھہرانا جہاں پانی نہ ملے۔

یعنی انقلاب امام حسینؑ کو ناکام بنانے کے لئے پہلا حربہ تھا بندشِ آب۔ اور
یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ کے اصحاب کی طاقت تھی کہ جیسے نصیب ہو گئے، مگر اس کے
بعد جب ابنِ سعد آیا تو مصلحتِ امامت سے جیسے ہٹائے گئے۔ اور آخر میں وہ وقت
ہو گیا کہ بانیِ بند ہو گیا اور وہ وقت بھی آیا کہ قحطِ آب ہو گیا۔ مزید نے اپنی دانست

میں اور ابن زیاد نے اپنے خیال میں پانی بند کر کے میدان حیت لیا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جیتا کون ہارا کون؟۔

جب امام حسینؑ کے ساتھ اتنے فوجی، سپاہی، چلنے والے، اصحاب، انصار، جوانان، بنی ہاشم موجود تھے تب تو یہ حوصلہ تھا کہ پانی بند کر دیا جائے۔ اور جب سب مارے گئے، یوٹے میسوں اور بچوں اور بیمار کے کوئی نہ رہ گیا۔ تو اس کے بعد کر بلا سے لے کے شام تک اور شام کے قید خانہ میں۔ شام کے بعد مدینہ میں کہیں کوئی پیغام نہ سنا کہ کوئی پانی بند کر دیا جائے۔ شام میں پانی بند کر دیا جائے۔ قید خانے میں بچوں کو پانی نہ ملنے پائے۔ مدینہ میں پانی بند کر دیا جائے۔ پھر دوبارہ پانی بند کرنے کا نام نہیں آیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہاں پانی کی سیلیں نہیں لگائی گئیں۔ لیکن پھر بھی کوئی دوسرا فرمان تارخ میں آپ کو نہیں ملے گا کہ پانی بند کر دیا جائے تاکہ حین کے اہل حرم قید خانہ میں پیاسے ہی مر جائیں اور کوئی مزید ظلم نہ کرنا پڑے۔ پھر دوبارہ یہ لفظ زبان پر نہیں آیا۔ یعنی جب تک امام حسینؑ نے قربانی نہیں دی تھی ظالم میں پانی بند کرنے کا حوصلہ تھا۔ لیکن جیسے ہی امام حسینؑ نے اپنے کو قربان کر دیا پھر دوبارہ پانی بند کرنے کا نام نہیں آیا۔ اب بتاؤ کہ جیتا کون اور ہارا کون؟۔

صلوات

آپ میری بات کی طرف متوجہ رہیں، میں بڑی دقیق منزل سے گزر رہا ہوں۔ یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ یزید نے اور یزید کے لشکر والوں نے اہل حرم کے لئے پانی کی سیلیں لگا دی تھیں۔ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ لیکن پھر بھی ظالم نے اس حوجہ کو بطور حوجہ استعمال نہیں کیا اور یہ نام نہیں آیا۔ نہ یزید کی زبان پر اور نہ یزید کے بعد والوں کی زبان پر۔ یہ امام کے ایثار اور امام حسینؑ کی قربانی کا دوسرا اثر تھا۔

پہلا اثر یہ تھا کہ مذہب کے نام پر بدکاری نہ کی۔

دوسرا اثر یہ تھا کہ بندش آپ کا نام ختم ہو گیا۔

اس کے بعد یہ بھی ملاحظہ کیجئے کہ جب تک امام حسینؑ کے ساتھ اتنے مسپاہی موجود تھے بیعت کا اتفاق چل رہا تھا۔ لیکن جب اہل حرم یزید کے سامنے آکر کھڑے

ہوئے تو جہاں نہ کوئی سپاہی ہے نہ کوئی فوجی۔ نہ کوئی عہددار ہے، نہ کوئی تلوار چلانے والا۔ صرف ایک بیمار ہے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں، نگے میں طوق۔ مگر یزید میں یہ کہنے کی ہمت نہیں ہے کہ دیکھو تمہارے باپ نے بیعت نہیں کی تو ان کا اہتمام کیا ہوا۔ اب موقع غیبت ہے تم میرے ہاتھ پر بیعت کر لو، ورنہ تمہارا بھی وہی انجام ہو گا۔

اب تو نہایت ہی آسان تھا، بیسیوں سے کہہ دیا ہوتا۔ بچوں سے کہہ دیا ہوتا۔ اسے کسی ایک سے مطالبہ کر دیا ہوتا۔ لیکن دوبارہ مطالبہ بیعت کا نام۔ یزید کی زبان پر نہ آ سکا۔

یہ قربانی حسینؑ کا تیسرا اثر تھا کہ ظلم کے حوصلے اتنے پست ہو گئے کہ نہ یزید کا کاحرہ استعمال کیا اور نہ بیعت کا مطالبہ کر سکا۔

چوتھا اثر

دربار کس کا ہے اہل حرم جہاں لاکھ کھڑے کئے گئے ہیں؟ دربار تو یزید کا ہے۔ قیدی کون ہے؟ امام حسینؑ کے گھر والے ہیں۔ مگر تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جب یزید نے دربار میں لاکھ اہل حرم کو کھڑا کیا ہے تو اہل حرم نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ وہ تو ہر منزل مصیبت سے گزرنے کا عہد کر چکے تھے۔ البتہ احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پہلا احتجاج۔ یزید کی بیٹی نے کیا۔ دوسرا احتجاج۔ یزید کی بیوی نے کیا۔

یزید کی بیٹی باپ کے خلاف بول رہی ہے باپ کے دربار میں۔ یزید کی زوجہ چادر پھینک کے آگئی ہے شوہر کے دربار میں۔ یہ جذبہ کس نے پیدا کر دیا کہ جہاں نہ بیٹی کو باپ کی مرواہ ہے اور نہ زوجہ کو شوہر کی مرواہ ہے۔ سب کو حمایت اہلیت کا خیال ہے۔ درباریوں پر تلواروں سے، نیزوں سے حکومت کر لینا بہت آسان ہے۔ مگر ظالم کے گھر والوں پر ان کے دلوں پر قابو حاصل کر لینا آسان نہیں ہے۔

اگر یزید کا میاں ہو گیا ہوتا تو کم سے کم اپنا گھر تو قابو میں رہ گیا ہوتا۔ یہ جیٹا ابن علیؑ کی قربانی کا چوتھا اثر تھا کہ یزید کے قبضے میں نہ زور و جہر گئی اور نہ بیٹی۔ سب پر دوبار

احتجاج کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ صلوات
بھولے گئے انہیں ایک ایک نکتے کو یاد رکھئے گا۔ یہ حسینؑ کی کامیابی کا جو تھا اثر تھا۔
اب پانچواں اثر ملاحظہ کیجئے:

یزید دربار میں بیٹھا ہوا ہے اور اعلان کر رہا ہے۔ سب بنی ہاشم کا کھیل تھا۔
کیسی دجی، کیسی خبر کہاں کی رسالت، کیسی نبوت، کیسا قرآن۔ یہ سب کھیل تھا۔
بنی ہاشم نے اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے سب ڈھونگ دچایا ہے، اس کی کوئی
حقیقت نہیں ہے۔ مگر میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ قربانی حسینؑ نے کیا اثر دکھلایا۔
یزید کو اس اعلان کے بعد بھی تسکین نہ ہوئی تو خطیب سے کہا کہ منبر پر جا کر آں محمد
کو گالیاں دے۔

خطیب نے منبر پر جا کے گالیاں بھی مٹا دیں۔ اب تو دل کو تسکین ہو گئی؟
لیکن اس کے بعد بیمار نے کہا کہ اتنی اجازت تو دیدے کہ میں بھی کچھ کہہ دوں نظام
نے مجبوراً اجازت دے دی۔ بیمار منبر پر آئے اور آنے کے بعد کچھ نہیں کہا۔ حمد
و ثنائے الہی کے بعد جب وہ منزل الہی کو جہاں باپ کی قربانی کا ذکر کیا جائے، تو
فرمایا کہ میں اس کا بیٹا ہوں جس کو پس گردن سے ذبح کیا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں
جس کا عامر، جس کی ردا لوٹ لی گئی۔

جیسے ہی قربانی حسینؑ کا ذکر شروع ہوا۔ یزید نے دیکھا کہ دربار کا نقشہ
بدل رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ بیمار کے خطیب کو روکا کیسے جائے۔ بیمار کی تقریر کو
روکا کیسے جائے۔ یزید کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ نہ خیر، نہ تلوار، نہ نیزہ، نہ نیزہ
کیسے روکا جائے۔ موذن سے کہا اذان شروع کر دے۔ جیسے ہی اذان شروع ہوئی
بیمار خاموش ہو گئے۔ موذن نے کہا اَللّٰهُ اَكْبَرُ۔ امام نے سنا اور دہرایا۔ موذن نے کہا اَشْهَدُ
نَے کہا اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ امام نے سنا اور دہرایا۔ موذن نے کہا اَشْهَدُ
اَنْ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ ابھی تک امام صبر رہے تھے اور دہرا رہے تھے۔ لیکن اب
یزید کی طرف متوجہ ہو گئے تاکہ دربار والے بھی ہوشیار ہو جائیں کہ کون جیتنا اذو

کون ہارا۔ موذن یزید نے کہا اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ یعنی جہاں رسالت کو
اسلمتگ کہا جا رہا تھا وہاں رسالت کا کلہ پڑھا جا رہا ہے۔
اب تو اندازہ ہوا کہ جس انقلاب کو دنیا نام کام بنانا چاہتی تھی وہ اتنا کامیاب
ہوا کہ اس کے اثرات دربار حاکم میں دیکھے جا رہے ہیں۔
اور پھر یزید کے خاتمہ کے بعد جیسے ہی بیٹے کے ہاتھ میں تخت حکومت آیا بیٹے
نے منبر پر جا کر چند لمحوں کی تقریر کی اور آ کر یہ تخت اس قابل نہیں ہے کہ کوئی شریف
آدمی اس پر قدم رکھے۔ یہ غاصبوں کا تخت ہے۔ یہ ظالموں کا تخت ہے۔ میں اس پر
قدم رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

یہ ہے قربانی حسینؑ کا پھٹا اثر کہ یزید کا بیٹا بنانا یا اختدار نہیں لینا چاہتا ہے۔ اب
اٹھ جیتا کون ہے، ہارا کون ہے؟ صلوات
اور آگے بڑھے۔ خود یزید کی زندگی میں دیکھئے۔ ابھی تو بیٹے کا ذکر تھا۔ بیٹی کا تذکرہ
تھا۔ زوجہ کا تذکرہ تھا۔ دربار کے موذن کا ذکر تھا۔ اب آئیے خود یزید کو دیکھیں کہ قربانی حسینؑ
نے یزید کو کہاں تک پہنچا دیا۔

ایک طرف اہل حرم ہیں جو قید خانے میں ہیں۔ مشقتوں کا عالم ہے۔ مصیبتوں
کا ماحول ہے۔ دوسری طرف تخت حکومت ہے۔ راحت ہے۔ آرام ہے۔ محل ہے قصر
ہے۔ بیت المال ہے۔ شراب ہے۔ دنیا کا سارا ہنگامہ ہے مگر ایک مرتبہ دیکھنے والوں
نے دیکھا کہ بستر چھوڑ کے یزید ایک گوشے میں بیٹھا ہوا ہے اور کہہ رہا ہے۔ حسینؑ نے
میرا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے حسینؑ کو کیوں قتل کر دیا؟ میں نے حسینؑ کو کیوں ذبح کر دیا؟
یہ کون کہہ رہا ہے؟ یزید ہی تو کہہ رہا ہے جس کے بعد اہل حرم کو رہا کیا ہے۔

اب دونوں منظر دیکھ لیجئے ایک کوئی چھوٹی تاریخ بھی ابھی تک نہیں بنی ہے۔
ایک روایت بھی چودہ صدیوں میں نہیں تیار ہوئی ہے کہ قید خانہ کی پریشانیوں کو دیکھ کے
مسائب سے عاجز آ کر کسی بچے نے یہ کہہ دیا ہو کہ آغا بابا کو کیا ہو گیا تھا اگر مصیبت یزید
کی ہوئی تو ہم لوگ سال بھر تک قید میں کیوں پڑے رہتے۔

حیث نے وہ حوصلہ دے دیا تھا کہ بچوں میں بھی کوئی شرمندہ نہیں ہے لیکن زید کا حوصلہ اتنا ہست ہو گیا ہے کہ زید اپنی شرمندگی کا اقرار کر رہا ہے۔

یحییٰ کی ساتویں فتح ہے جس نے زید پر کامیابی حاصل کی ہے۔ صلوات اب آٹھواں مرحلہ۔ زوجہ نے جب یہ دیکھا کہ زید بستر نہیں ہے اور ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا رو رہا ہے۔ تو اس نے دوبارہ مارے۔ کہا یہاں کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ کہا کیا کر دیند نہیں آتی ہے۔ عجب منظر دیکھتا ہوں، عجب خواب دیکھتا ہوں۔

زوجہ نے ٹوکا، اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ تو نے یہ غلط کیا ہے اور تو نے غلط حکم دیا ہے اور ان لوگوں کو بے سبب ظالمانہ انداز سے تہ تیغ کر دیا ہے تو کم سے کم ان کے گھر والوں کو بھی چھوڑ دے، انھیں کیوں قیدی بنا کر رکھا ہے؟

کہا تو نے سچ کہا ہے۔ میں کل انھیں آزاد کر دوں گا۔ بالآخر دربار میں آیا۔ عابد ہار کو بلایا۔ اہل حرم امام حسین کو قید خانہ سے نکالا اور وطن بھیجے کا حکم دے دیا اور اجازت دے دی کہ وہ اپنے گھر چلے جائیں۔ اور اس کا راز یہ تھا کہ زید ماحول سے اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ انھیں آزاد کرنے کے لئے تیار ہو گیا، ورنہ اس سے کسی شرافت کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔

یہ حسین کے انقلاب کی آٹھویں کامیابی تھی۔ صلوات بس دو چلے اور سن لیں ورنہ باتیں تو بہت ہیں جو میں گزارش کرتا۔ زید تیار ہو گیا انھیں رہا کرنے پر۔ مگر اہل حرم کے حوصلے اتنے بلند ہیں اور قربانی حسین نے ان کی ہمتوں کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ اتنے پر بھی راضی نہیں ہیں کہ ہمیں آزاد کر دیا جائے اور ہم گھر چلے جائیں بلکہ جیسے ہی رہائی کا نام سنا۔ ثانی زہر نے فرمایا بیٹا! زید سے کہو کہ کوئی گھنٹالی لائے، یہاں ماتم ہو گا۔ یہاں مجلس ہوگی۔ یہاں بھائی کا ذکر ہو گا۔ ہم اس کے بغیر نہ جائیں گے تاکہ یہ بھی تو ایک نظیر قائم ہو جائے کہ جہاں نام حسین لینا مجرم تھا وہاں بھی مجلس حسین قائم ہوتی ہے۔

ثانی زہر نے قید سے رہائی کا مطالبہ نہیں کیا ہے مگر مجلس کا تقاضہ کیا ہے فرشتہ عوا

کا مطالبہ کیا ہے۔ گویا کہ رہائی کا مطالبہ نہ کرنا ایک کامیابی تھا اور فرشتہ عوا کا قائم کر دینا یہ دوسری کامیابی ہے۔ صلوات

یہ انقلاب امام حسین کی دس کامیابی تھی۔ اور ایک آخری جملہ اور سن لیں جہاں سے میں نے بات شروع کی تھی کہ امام حسین آٹھے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے کرہیکوں کا حکم دیا جائے گا اور گزائیوں سے روکا جائے گا۔ جو بنیاد انقلاب امام حسین ہے۔ یہ بنیاد بھی اتنی کامیاب ہوئی کہ جب تک زید کا اقتدار قائم رہا مجال کسی کی جو سانس لے سکے۔ شراب کی تعریفیں ہو رہی تھیں۔ بدکاریوں کی درس سرائی ہو رہی تھی۔ ظلم کی تعریف کی جا رہی تھی۔ کس میں ہمت تھی جو کہہ دے کہ یہ حرام ہے۔ کس میں ہمت تھی جو ٹوک دے کہ یہ کام غلط ہے۔ کوئی نہیں تھا دربار میں سوائے امام حسین کے گھر والوں کے۔ سارے معروف مٹ گئے کوئی نہ بولا۔ سارے منکر رائج ہو گئے کوئی نہ بولا۔ تو جب تک زید کا اقتدار چلتا رہا معروف کا نام لینے والا کوئی نہیں تھا۔ منکر سے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ مگر جب قربانی حسین نے اپنا اثر دکھلادیا تو امر بالمعروف اتنا اونچا ہو گیا کہ اسلامی حکومتوں میں پوری پوری وزارتیں قائم ہونے لگیں۔ صلوات

یہ قربانی امام حسین کا دواں اثر تھا۔ جیسی انقلاب اصولوں پر قائم تھا۔ لہذا جب تک اصول اسلام زندہ رہیں گے اس انقلاب کی کامیابی اور فتح کا اعلان ہوتا رہے گا۔

یہ چند باتیں تھیں جو میں نے آپ کے سامنے گزارش کر دیں ورنہ ظاہر ہے کہ اگر موقع ہوتا یا پھر کبھی اگر موقع ہو گا تو مزید گزارش کروں گا کہ انقلاب حسین کی یہ کامیابی تو فقط اس دور میں تھی اس کے بعد ہر دور میں اس انقلاب کی کامیابی کے اثرات کیسے کیسے سامنے آتے رہے ہیں۔ بہا تک کہ دور حاضر میں بھی وہی ایک انقلاب ہے امام حسین کا جس کی دھک ساری دنیا میں پائی جاتی ہے۔ جس کے اثرات ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں کہ آج بھی اگر کوئی انقلاب کا نام لینا چاہتا ہے تو بغیر حسین کے نام کے نہیں لے سکتا اور قربانی حسین کا اتنا بڑا اثر صرف عالم اسلام پر نہیں ہے بلکہ پورے

عالم انسانیت پر ہے کہ شاکہ بلکہ یقیناً دنیا کے کسی انقلاب کا اتنا اثر ذہن انسانی پر نہیں ہے جتنا بڑا اثر انقلاب امام حسینؑ کا ہے اور کیوں نہ ہوتا کتنی بڑی قربانی ہے۔ میدان میں جا کے تلوار چلا کے جنگ کر کے مرجانا، قتل ہو جانا بہت آسان ہے۔ دنیا میں یہ سارے کام ہوتے ہی رہتے ہیں مگر امام حسینؑ نے اپنے انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے کتنی بڑی قربانی دی ہے اور کتنی بڑی قربانیاں پیش کی ہیں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔

اربابِ عرفا! انسانی زندگی میں کچھ ایسے حساس موضوعات اور مواقع ہوتے ہیں جو انسان کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتے ہیں۔ کس پھر مرحوم بھائی کی نشانی۔ جانِ برادر کا قربان کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اپنی گردے والوں کا قربان کرنا بہت آسان ہے مگر جانِ برادر کو بھائی کی نشانی کو مرنے کی رضا دینا بہت مشکل ہے۔ اور حسنِ مجتبیٰؑ کی نگاہ کے سامنے یہ مرحلہ تھا کہ حسینؑ کو اس منزل سے گزرنا پڑے۔ لہذا حسینؑ نے اس مرحلہ کو ذرا آسان بنا دیا۔ دنیا سے جاتے جاتے بیٹے کے بازو پر ایک نعویذ باندھ دیا اور یہ فرما دیا کہ میرے لال جب کوئی سخت مصیبت کا وقت آجائے تو اس نعویذ کو دیکھ لینا اور جو کچھ اس کا غرض ہے اس کے مطابق عمل کرنا۔

عاشور کی رات آئی۔ فرزند رسولؐ انقلین چاہنے والوں کے درمیان، کل کی صبح کا ذکر کر رہے ہیں۔ کل قربانیوں کا دن ہے۔ کل راہِ خدا میں خدا کا ربوں کا دن آئے والا ہے۔ کل سب قربان ہو جائیں گے۔ ایک ایک کا ذکر حسینؑ ابنِ علیؑ کرتے رہے۔ کل حبیبِ مذہب ہیں گے۔ مسلمِ مذہب ہیں گے۔ چاہنے والے قربان ہو جائیں گے۔ سنی ہاشم کے جوان قربان ہو جائیں گے۔ سارا تذکرہ کرنے کے بعد جیسے ہی مولانا خاموش ہوئے۔ بچے نے دیکھا کہ میرا نام کہیں نہیں آیا۔ ایک گوشہ میں بیٹھ کے زار و قطار روناشروع کر دیا۔ ہاں اولاد والو! آپ بھی اپنے دل کے جذبات کا جائزہ لیں۔ اور میں اپنے بچوں سے بھی کہوں گا کہ تم بھی اپنے جذبات کا جائزہ لو۔ اگر کہیں موت کا ذکر آ رہا ہو۔ دس، بیس، پچاس کے مرنے کا ذکر آ رہا ہو اور کسی کے ذریعے

کا ذکر آجائے تو جس کو زندگی کا پیغام سنا دیا جائے وہی خوش ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں مرنے کا ذکر نہیں آیا تو پھر بیقرار ہو کے رو رہا ہے۔ باپ نے کہا تھا جب کوئی بڑی مصیبت سامنے آئے تو میرے اس خط کو اس نعویذ کو پڑھ لینا۔ بچے کی نگاہ میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ سب قربان ہو جائیں گے، مجھے قربان ہونے کا موقع نہ ملے گا۔ جیسے ہی خیال آیا بازو سے نعویذ کو کھولا۔ دیکھا اور لے کے سیدھے مولائی خدمت میں آگیا چچائی اٹھا۔ میں خط کو پیش کر دیا۔ امام حسینؑ نے خط کو دیکھا، آنکھوں سے لگا یا اور قائم کو سر سے لٹک دیکھا۔ بیٹا یہ کیا ہے؟ کہا باا جان میرے بازو پر ایک نعویذ باندھا تھا اور امام تھا کہ جب کوئی بڑی مصیبت کا وقت آجائے تو اسے پڑھ لینا۔ اب میں نے دیکھا کہ آپ ہی کے نام ہے۔ ذرا آپ ملاحظہ فرمائیں بیٹے جو وصیت فرمائی:

بیٹا دیکھو چچا پر کوئی وقت پڑ جائے تو چچا کے کام آنا۔
حسینؑ نے بھتیجے کو سر سے پیر تک دیکھا اور کہا میرے لال یہ نعویذ لے کے آئے ہو کہ اپنی موت کا پیغام لے کے آئے ہو۔

اتنا حوصلہ ہے جان دینے کا۔ اتنا حوصلہ ہے قربان ہونے کا تو سنو کل وہ دن آئے والا ہے کہ تم بھی قربان ہو جاؤ گے اور تمہارا چھوٹا بیٹا علیؑ اصغرؑ بھی دنیا میں رہے گا۔ سنو غیرت دارو! اور میری بیٹیاں بھی سن رہی ہیں وہ بھی منوجہ رہیں۔ جیسے ہی حسینؑ نے فرمایا کہ تم بھی قربان ہو جاؤ گے اور تمہارا چھوٹا بیٹا علیؑ اصغرؑ بھی قربان ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ بچہ نے سر اٹھایا۔ چچا یہ آپ نے کیا فرمایا۔ علیؑ اصغرؑ قربان ہو جائیں گے؟ کیا

الطبیائے میں آجائیں گے؟
حسینؑ نے بچے کے دل کو سمجھا لیا۔ نہیں قائم میں اصغرؑ کو لے کے میدان میں ماؤں کا شکر شادی ہاشم کا لال یہ مذہن سکے گا کہ اشقیا درازہ نبیوں میں آجائیں گے۔

رکھو علیؑ اللہ، خدا آپ کو کسی غم میں نہ لائے سوائے غمِ آلِ محمدؐ کے۔
بس، پانچ منٹ۔ ظاہر ہے تاریکیوں آخری آگئی ہیں۔ ساتویں محرم کی رات آگئی ہے۔ دو تین دن عاشور محرم میں اور باقی رہ گئے ہیں۔ ایک پانچ منٹ۔ آپ

متوجہ رہیں انشاء اللہ بہت روئیں گے۔ چچا نے جیسے ہی یہ پیغام سنایا کہ بیٹا تم بھی قربان ہو جاؤ گے قاسم مطمئن ہو گئے۔ بالآخر وہ وقت آیا جب ظہر کے بعد سارے چچا والے کام آچکے اور بنی ہاشم کی قربانی کا وقت آگیا۔ اولاد عقیل راہ خدا میں قربان ہوئی اور اولاد حسن بختی کی باری آئی تو ایک مرتبہ قاسم چچا کے سامنے آکے کھڑے ہو گئے اور ہاتھ جوڑ کے گزارش کی۔ چچا اب تو سارے چاہنے والے بھی کام آگئے۔ اولاد عقیل بھی قربان ہو گئی۔ مسلم کے یتیم بھی کام آگئے۔ چچا آخر میری باری کب آئے گی؟ چچا نے مجھے میدان میں جانے کا موقع کب ملے گا؟ چچا اب تو اجازت دیتے تھے۔ اب تو میدان میں جانے دیجئے۔ امام حسین بھتیجے کو دیکھ رہے ہیں، کچھ جواب نہیں دے رہے ہیں۔ میں نے روایت میں جب فقرہ دیکھا ہے۔ آج ہی مقتل پر ڈھوا تھا دیکھا کہ جب امام حسینؑ نے کوئی جواب نہیں دیا اور قاسمؑ نے دیکھا کہ چچا شامہ اجازت نہیں دیں گے تو پھر کلباؤ کی خاک پر بیٹھ گیا اور سر حسینؑ کے قدموں پر رکھ دیا۔ امام حسینؑ نے کہا اسے بیٹا یہ کیا؟۔ کہا چچا جب تک سر نہ کی اجازت نہ دوں گے یہ سر نہ اٹھے گا۔ جب تک آپ اپنی زبان سے نہ کہہ دیں گے جاؤ میدان میں جاؤ۔ یہ سر نہ اٹھے گا۔ حسینؑ نے پھر کلبجور سے لگایا۔ اسے میرے لالہ ہونے پر اتنا اصرار کر رہے ہو۔ اچھا جاؤ میں نے تمہیں اجازت دے دی۔ یہ کہہ کے حسینؑ نے بھتیجے کو سمایا۔ مگر حملے کا نیا انداز دیکھا۔ پہلے قاسمؑ کے سوار عامر ہاندھا۔ اور روایت کہتی ہے کہ ایسا عامر ہاندھا کہ اس کے دو زلے میرے سینے پر لگا دیئے۔ دیکھا ہوگا آپ نے اور یقیناً دیکھا ہوگا جب کسی مرنے والے کو کفن دیا جاتا ہے تو کفن کے استحباب میں ایک عامر بھی شامل ہے اور عامر کو ہاشم کی ترکیب یہ ہوتی ہے کہ اس کے دونوں سرے سینے پر لگا دیئے جاتے ہیں۔ بیٹا امام حسینؑ اشارہ کر رہے تھے کہ میرے لالہ! میں تجھے کفن تو نہ دے سکوں گا بیٹا۔ سمایا، تیار کیا اور اس کے بعد چلتے ہیں کہ گھوڑے پر بٹھائے بھتیجے کو میدان میں بھیج دیں۔ مگر نہ جانے کیا خیال آگیا کہ اک مرتبہ کہا بیٹا آؤ تم کو گلے سے لگا لوں۔ روایت کا فقرہ یہ کہ حسینؑ نے ایک مرتبہ قاسمؑ کو کلبجور سے لگایا اور چچا بھتیجے اتنا روئے کوشش لگائے گا کہ

لالہ زہراؑ نے دیکھا ادھر بھائی ادھر بھتیجے۔ دونوں غش کے عالم میں ہیں۔ مگر پانی کا کوئی لہر ہوتا تو چھڑک کر ہوش میں لے آتیں۔ بالآخر زینبؑ نے آنسوؤں کا چھڑکاؤ کیا۔ دونوں کوشش سے چڑکایا۔ بھتیجا دل سنبھالو۔ اب بیٹے کو جانے دو۔ حسینؑ نے کہا اچھا چلو انیس سوار کرادوں۔ گھوڑے پر سوار کرتے کرتے ایک مرتبہ حسینؑ نے قاسمؑ کا گرہان ہانک کر دیا۔ اسے چچا یہ کیا؟ فرمایا بیٹا یہ یتیموں کی نشانی ہے۔ تم جا رہے ہو مجھے میرا بھائی یاد آ رہا ہے۔ گھوڑے پر بٹھایا۔ قاسمؑ میدان میں آئے۔ چچا کی منزلیں تمام ہوئیں۔ جب زخموں سے چڑھ کر ہوئے گھوڑے سے گرنے لگے۔ آواز دی۔ یا عہد اچھا چچا آئے۔ بھتیجے کی خبر لیجئے۔ بس آخری جملہ حسینؑ کے کانوں میں آواز آئی۔ تیار ہوئے میدان میں جانے کے لئے۔ روایت کا فقرہ ہے کہ اس تیزی سے حسینؑ آگے بڑھے کہ میدان میں ان تک اتنی تیزی سے نہیں گئے تھے۔ کیوں؟ اس لئے کہ حسینؑ نے دیکھا کہ قاتل سرھانے بیٹھا ہوا ہے اور بیٹے کا گلہ کاٹنا چاہتا ہے اور قاسمؑ چچا کا انتظار کرتے ہیں۔ حسینؑ دوڑے خبردار! اب میں آگیا۔ مگر جب تک میں حسینؑ پہنچوں، فوج دشمن آگے بڑھی۔ درمیان میں قاسمؑ ہیں۔ چچا کے پہنچنے پہنچنے ایک ہی آواز کان میں آرہی ہے۔ چچا اچھا چچا۔ جلدی آؤ چچا۔ حسینؑ پہنچے تو بھتیجے کو عجب عالم میں دیکھا۔ اسے میرے لالہ اب چچا آیا جب تمہارے کام نہ آسکا۔ بیٹا اب حسینؑ مقتل میں آیا جب تمہاری مدد نہ کر سکا۔ اسے میرے لالہ حسینؑ تم سے شرمندہ ہے کہ تم نے پکارا مگر میں نہیں ظالموں سے نہ بچا سکا۔ جاؤ جان۔ برادر جاؤ خدا حافظ!۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

آٹھویں مجلس دعائے امام حسین علیہ السلام

”حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ اس سے محبت کرے جو میرے حسینؑ سے محبت کرے۔“
سرکارِ دو عالم کے اس ارشادِ گرامی کی روشنی میں جو سلسلہٴ کلام عرفانِ حین کے عنوان سے آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا اس کے آٹھویں مرحلے پر ایک انتہائی اہم اور سنجیدہ موضوع سے متعلق کچھ باتیں گزارش کرنا ہیں۔ اور وہ ہے مسئلہٴ دعائے امام حسین علیہ السلام۔
یوں تو انسانی زندگی کا کوئی لمحہ بھی دعاؤں سے نہ خالی ہو سکتا ہے اور نہ خالی ہونا چاہیے۔ لیکن چونکہ آنے والی شب، شبِ جمعہ ہے اور شبِ جمعہ بالخصوص شبِ عطا کہی جاتی ہے، اس لئے میں نے اس موضوع کو آج آپ کے سامنے پیش کرنا مناسب سمجھا ہے تاکہ آپ ذہنی طور پر کل کے لئے تیار ہو جائیں۔

اس ذیل میں بے شمار مسائل اور مطالب ہیں جن کی طرف انسان کو متوجہ رہنا چاہئے۔ مگر ساری باتیں نہ گزارش کی جاسکتی ہیں اور نہ ان کی گنجائش ہے۔ میں نے اپنی کتاب ”نفوسِ عصمت“ میں اس موضوع پر بہت کچھ تفصیل سے لکھ دیا ہے۔ جن اعتراضات نے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں اور جنہوں نے مطالعہ نہیں کیا ہے وہ مطالعہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت تہمدی طور پر چند جملے گزارش کرنا ہیں اور اس کے بعد

مولا علیؑ کے فیصلے

مؤلف

الحاج سید محمد تقی نقوی، ضلع آبائی

عصمت پبلیکیشنز

بنی۔ او بکس نمبر:- 18168 کراچی 74700 پاکستان

jabir.abbas@yahoo.com

اصل موضوع "دعا" امام حسین علیہ السلام سے متعلق کچھ باتیں عرض کرنا ہیں۔

تمہید کے طور پر پہلے آپ یہ سمجھ لیں کہ دعا کا واقعی تصور اسلام میں وہ ہے جو ہمارے معاشرہ میں پایا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں دعا کا ایک ہی تصور ہے کہ غرض مند آدمی بے نیاز سے کچھ مانگنا چاہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب غرض کا احساس پیدا ہوتا ہے تو دعا کا خیال آتا ہے۔ اور جب انسان کو اپنی طاقت اور بے نیازی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے تو دعاؤں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے یہاں روایات میں یہ فقرہ ملتا ہے کہ اگر کوئی انسان نماز تمام کرنے کے بعد **اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُہٗ** کہہ کر مصلیٰ سیٹ کے اٹھ جائے تو ہر روز دعا کا عالم اس نمازی سے خوش نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے مجھے قابلِ سجدہ تو سمجھا ہے لیکن اسے اپنی حیثیت اور میری عظمت کا احساس نہیں ہے۔ اسے چاہئے تھا کہ نماز تمام کرنے کے بعد بھی کچھ مجھ سے مانگتا، میری بارگاہ میں دعا کرتا، تاکہ اسے یاد رہتا کہ دنیا کے سارے کربانوں میں اور مجھ میں ایک بنیادی فرق ہے کہ ہر کربیم مانگنے والوں سے گھبراتا ہے، ہاتھ پھیلانے والوں سے ناراض ہوتا ہے، لیکن میں ان سے ناراض ہونہا ہوں جو ہاتھ نہیں پھیلاتے، میں اس لئے کہ مانگنے والوں سے وہ گھبراتے ہیں جنہیں اپنے خزانوں میں کمی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جو اپنی ذات ہی کو کفرِ مخفی کہہ کر پیش کرتا ہے اس کے خزانے میں کبھی کمی نہیں آسکتی ہے۔ نہ اس کی ذات محدود کی جاسکتی ہے اور نہ اس کا خزانہ محدود بنایا جاسکتا ہے۔ صلوات

اس کا ایک بہترین اشارہ اگر آپ چاہیں تو قرآن مجید میں بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ بندہ نے نماز میں خود ہی پروردگار سے کہا تھا **اِنَّا لَکَ نَعْبُدُکَ وَ اِنَّا لَکَ نَسْتَعِیْذُ** پروردگار! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں تو عبادت کرتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہو گیا لیکن اس کے بعد جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے گا تو بندے کا اعلان مکمل ہو گا۔ **اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُہٗ** کامنظاہرہ ہو رہا تھا اب جو ہاتھ اٹھے گا تو **اِنَّا لَکَ نَسْتَعِیْذُ** سامنے آئے گا۔

اور ہمیں سے آپ اس حقیقت کو پہچانیں گے کہ دعا کی حقیقت واقعی اسلام کی نگاہ میں کیا ہے۔

پروردگار عالم نے ہر بندہ کے لئے ایک ہی دعا واجب قرار دی ہے۔ ہر دعا میں ہم آزاد ہیں مانگیں یا نہ مانگیں۔ مانگیں گے وہ دیدے گا۔ نہ مانگیں گے نہ دے گا۔ لیکن ایک دعا ایسی ہے جو ہر بندہ مسلمان پر واجب ہے۔ اس میں کسی آدمی کو آزاد نہیں چھوڑا گیا ہے۔ حد یہ ہے کہ کتنا اغفر فی میں بھی آپ آزاد ہیں۔ ہو سکتا ہے دعا نے مغفرت کریں، ہو سکتا ہے نہ کریں۔ لیکن ایک دعا ایسی ہے جس میں کسی بندہ مسلمان کو آزاد نہیں رکھا گیا ہے۔ ہر مسلمان پر واجب ہے اس ایک دعا کا پروردگار عالم کی بارگاہ میں پیش کرنا۔

وہ کون سی دعا ہے؟ اس مسئلہ کو سلسلہ وار پہچانئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ کون سی دعا ہے جو پروردگار عالم نے ہر مسلمان پر واجب قرار دی ہے۔ اسلام کے فرائض اور واجبات میں سب سے اہم واجب کا نام ہے نماز۔ عقائد کے بعد جب اعمال کی دنیا آتی ہے تو سارے اعمال میں سب سے اہم عمل کا نام ہے نماز۔

فروع دین دس ہیں۔ اول نماز۔ تو سب سے اہم واجب کا نام ہے نماز اور قرآن مجید کے ایک سو چودہ سورتوں میں ایک سورتیہ سورہ چھوڑ دیئے جائیں تو نماز ہو جائے گی۔ لیکن ایک سورہ ایسا ہے کہ اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو نماز نہیں ہو سکتی ہے۔ واجب نمازوں کا قانون یہ ہے کہ سورہ حمد کے علاوہ بھی ایک سورہ پڑھا جائے۔ نماز سنتی آپ پڑھ لےئے ہیں تو خالی ایک سورہ حمد پڑھنے کے بعد بھی کو روع میں جاسکتے ہیں نماز صحیح ہو جائے گی۔ چاہے دن کی نماز ہو یا نماز شب ہو۔ کوئی نماز کتنی ہی باعظمت ہو کتنی ہی عظیم اور کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو، اگر آپ چاہیں تو پہلی دو رکعت میں صرف سورہ حمد پڑھ کر روع میں جاسکتے ہیں، آپ کی نماز مکمل ہو جائے گی۔ لیکن اگر آپ چاہیں کہ سورہ حمد نہ پڑھیں اور نماز ہو جائے تو نہ کوئی واجب نماز ہو سکتی ہے اور نہ کوئی سنتی نماز ہو سکتی ہے۔

تو مسلمان کے لئے نماز واجب اور نماز کے لئے سورہ حمد واجب۔ اب جو بندہ نے سورہ حمد شروع کیا تو بسم اللہ الرحمن الرحیم ذکر خدا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ذکر خدا ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ توصیف خدا ہے۔ بِسْمِ اللّٰہِ یَوْمَ الدِّیْنِ ذکر خدا ہے۔ اِنَّا کَ تَعْبُدُوْا اَیَّ اَیَّاتِکُمْ نَسْتَعِیْنُ اس میں دو باتیں جمع ہو گئی ہیں خدا کی عظمت کا اعلان بھی ہے کہ تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور اپنی کمزوری کا احساس بھی ہے کہ تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ جب یہ سارے مرحلے ختم ہو گئے تو اب شروع ہوتی ہے دعا۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ پروردگار ہمیں صراط مستقیم چاہئے، سیدھا راستہ چاہئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک مسلمان، مسلمان رہے گا اس دعا سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ مسلمان ہے تو نماز نہیں چھوڑ سکتا ہے اور نماز پڑھے گا تو سورہ حمد نہیں چھوڑ سکتا ہے۔ اور سورہ حمد پڑھے گا تو یہ آیت نہیں چھوڑ سکتا ہے۔ لہذا ہر دلع مسلمان بے نیاز ہو سکتا ہے مگر صراط مستقیم سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے۔

اب بات آگئی ہے تو ایک جملہ اور یاد رکھئے گا۔ صراط مستقیم کی دعا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد بھی صراط مستقیم سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے۔ تو صراط مستقیم ان کا راستہ ہے جن پر نعمتیں نازل ہوتی ہیں۔ یعنی جس طرح مسلمان سیدھے راستے سے بے نیاز نہیں ہے اسی طرح ان بندوں سے بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے جن پر نعمتیں نازل ہوتی ہیں اور ان بندوں کی نفرت سے بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے جو بہک گئے ہیں یا غضب خدا کے حق دار ہو گئے ہیں۔ صلوات

تو عزیزان محرم! مسلمان کی زندگی میں ایک دعا واجب ہے۔ اس کا جو بھی ترجمہ ہو صراط مستقیم دکھا دے یا ثابت قدم رکھ۔ ہر حال صراط مستقیم کی دعا واجب ہے اور اس کے بغیر مسلمان، مسلمان واقعی نہیں ہو سکتا ہے۔ تو جس دعا کو پروردگار نے واجب قرار دیا ہے اس سے پہلے دعا کے آداب بھی بتا دیئے ہیں اور دعا کی حقیقت بھی سمجھا دی ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ سے پہلے بندے نے دو جملے استعمال کئے ہیں۔ اِنَّا کَ تَعْبُدُوْا اَیَّ اَیَّاتِکُمْ نَسْتَعِیْنُ پروردگار ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں یعنی سجدے

کے قابل تھا تو ہے، عبادت کے لائق تھا تو ہے۔ و اِیَّاتِکُمْ نَسْتَعِیْنُ اور تجھ سے بھیک مانگنا ہمارا کام ہے۔ ہاتھ پھیلا نا ہمارا کام ہے۔ مدد مانگنا ہمارا کام ہے۔ اور جب یہ دو باتیں کہہ دیں تب دعا کی، تاکہ حقیقت دعا معلوم ہو جائے کہ دعا کی جاتی ہے دو حقیقتوں کے اظہار کے لئے۔ مالک کی عظمت کا اقرار ہو جائے اور اپنی ذلت کا احساس ہو جائے۔

مالک کی عظمت کا اقرار اور اپنی ذلت و کمزوری کا احساس انھیں دونوں کے مجموعہ کا نام ہے دعا۔ اس کے بغیر کوئی دعا نہیں ہے۔ جو خدا کی عظمتوں کا قائل نہ ہو اس کی دعا مہمل ہے دعا نہیں ہے اور جو اپنی ذلت کا قائل نہ ہو اس کی دعا خالی ایک لفظ مسلمان ہے اور کچھ نہیں ہے۔ دعا کی حقیقت ہے مالک کی عظمت کا اقرار اور بندے کی اپنی کمزوری کا احساس۔ یہی وجہ ہے کہ جو خدا صاف خدا اس نکتہ کو جانتے تھے وہ اس کی عظمت کو بھی جانتے تھے اور اپنی کمزوری کو بھی جانتے تھے۔ ان کو کوئی ضرورت ہو یا نہ ہو مگر دعا کے لئے ہمیشہ ہاتھ اٹھائے رہتے تھے۔ کوئی پوچھے کہ آپ کیا مانگ رہے ہیں، سارے قرآن لے کر آپ کے قبضہ میں ہیں۔ آپ کے قبضہ میں عرش اعظم ہے، جہاں تک آپ میں لعین کے ملے جلتے ہیں۔ آپ جنت کے بانٹنے والے ہیں۔ آپ جہنم سے پکڑنے والے ہیں۔ آپ کو خدا نے کائنات کا علم دیا ہے۔ اس نے آپ کو بالکل بنا کر بھیجا ہے تو پھر آپ کیا مانگ رہے ہیں۔ کہا کوئی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم یہ محسوس کرو کہ کوئی ایسے ہونے کے بعد بھی ہمیں اس کی عظمت کا بھی احساس ہے اور اپنی کمزوری کا بھی احساس ہے۔ رَبِّیْ زِدْنِیْ عِلْمًا۔ صلوات

بس عزیزان محرم! ان دو لفظوں کو یاد رکھئے گا کہ دعا درحقیقت نام ہے اس کی عظمت پروردگار اور احساس ذلت بندگان خدا کا۔ ہر انسان کو احساس رہے کہ ہم کمزور ہیں اور ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ زبان جس سے ہم بولتے ہیں چاہے دعا کریں یا نہ کریں ہر حال یہ زبان بھی اُسی کی دی ہوئی ہے۔ یہ طاقتیں جن کے غور کرنے دعاؤں سے بے نیاز بنا دیا ہے یہ طاقتیں بھی اُسی کی دی ہوئی ہیں، اپنا کچھ نہیں ہے۔ لہذا یہ احساس ہر انسان میں ہونا چاہئے کہ ہم ذاتی طور پر کمزور ہیں۔ صاحب مسلمان

jabir.abbas@yahoo.com

صاحب طاقت، صاحب کبریائی، صاحب عظمت صرف پروردگار ہے۔ وہ تنہا جی ہے وہ تنہا قیوم ہے۔ باقی سب اسی کے کرم سے قائم ہیں۔ سب اسی کی مہربانیوں سے زندہ ہیں۔ کسی کی حیات اپنی نہیں ہے۔ کسی کا قیام اپنا نہیں ہے۔

یہ مختصر بھی تنہید حقیقت دعا کے بارے میں اب اس کے بعد ایک جملہ اور گزارش کرنا ہے۔

فقر کی ہر کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ نمازی اگر حالت نمازیں کسی سے بات کرے تو اس کی نماز کلام کرنے سے باطل ہو جاتی ہے۔ سب جانتے ہیں اور اتنا مسلّم تو ماشاء اللہ بچوں کو بھی معلوم ہے کہ ایک لفظ بھی اگر آپ نے کسی بندے سے بات کر لی تو آپ کی نماز گئی۔ یہ اجازت آپ کو نہیں دی گئی کہ حالت نمازیں کوئی ایک لفظ استعمال کریں جس کے کوئی معنی ہوں۔ لیکن اگر بندہ بندوں کے بارے میں بات کرے تو کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ بات خدا سے ہو رہی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی نماز کا کمال یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بندے کے بارے میں خدا سے کہے۔

یہ صلوات کیا ہے۔ کیا بندے سے خدا کے بارے میں کچھ کہا گیا ہے۔ نہیں۔ خدا سے کہتے ہیں بندوں کے بارے میں۔ خدا یا ارحم الراحمین بر رحمت نازل فرما۔ تو بات بندوں کے بارے میں ہو رہی ہے مگر چونکہ خدا سے ہو رہی ہے لہذا یہی صلوات معراج نمازیں جاتی ہے۔

بعض پیارے مسلمان نہیں جانتے ہیں تو کہتے ہیں کہ نمازیں ہر جگہ لکھا ہوا ہے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ وَبِحَمْدِهِ۔ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ وَبِحَمْدِهِ۔ صلوات کہیں نہیں لکھی ہے دنیات کی کتاب میں۔ یعنی اگر آپ نے دنیات پڑھ لی ہے تو گو یا آپ قابل ہو گئے ہیں اور صلوات پڑھ لی تو آپ کی نماز چلی گئی۔ نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ صلوات دعا ہے اور جب تک بندہ خدا سے باتیں کرتا رہے گا کوئی حرج نہیں ہے۔ مثال کے طور پر میں نماز پڑھ رہا ہوں، مجھے آپ سے کوئی کام ہے اور آپ کہیں جانا چاہتے ہیں۔ تو میں اگر حالت نمازیں آدھا لفظ بھی کہہ دوں کہ ذرا ٹھہر جائیے۔ یا لفظ "ذرا" بھی کہ کر دیا

صوت ٹھہر جائیے۔ یا لفظ "جائے" بھی نکال دیا جس سے وہ سمجھ کر ہمیں روکنا چاہتے ہیں تو نماز گئی کہ اگر پوسنے چار رکعت پڑھنے کے بعد بھی تشہد میں یہ حادثہ پیش آگیا تو بھی اتنی دیر کی ساری محنت برباد ہو گئی اور نماز باطل ہو گئی۔ لیکن اگر بندہ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دئے اور کہا خدا یا! اس بندے کے دل میں ڈال دے کہ اتنی دیر تک ٹھہرا رہے جب تک میری نماز ختم ہو جائے۔ تو اتنی لمبی عبارت ہو گئی لیکن نماز کہیں نہیں گئی۔ اس لئے کہ نماز خدا کی بارگاہ میں حاضری ہے۔ خدا کے سامنے کھڑے ہو کر جب تک خدا سے باتیں کرتا رہے گا نماز اُدھر جاتی رہے گی اور جب ٹکڑے بندوں کے ہاتھ شروع کر دے گا تو نماز غارت ہو کر رہ جائے گی۔ صلوات

تو کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حقائق کے اظہار کے لئے زبان دعا استعمال کی جاتی ہے کہ مجھے آپ کو روکنا ہے لیکن میں آپ سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں خدا سے کہہ رہا ہوں۔ آپ نے سُن لیا کام ہو گیا۔ آپ نے میری دعا کو سُن لیا آپ ٹھہر گئے میں سمجھا کہ الحمد للہ میری دعا قبول ہو گئی کہ آپ ٹھہر گئے۔ تو ہجو ہے دعا کا لیکن مقصد ہے کچھ اور بلند تر۔

آل محمد کی دعائیں ہماری جیسی دعائیں نہیں ہیں کہ جب کوئی غرض ہوئی خدا کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔ اُن کی دعاؤں کی بے شمار صلیتیں ہیں۔ وہ بندوں کو عقائد و حقائق سے باخبر کرنا چاہتے ہیں مگر حالات کا تقاضہ نہیں ہے کہ براہ راست کہہ سکیں۔ تو ہجو کو بدل دیتے ہیں تاکہ کوئی بُرا نہ مانے اور ہر ایک سُن لے۔ کبھی تو ہوش آئے گا تو ان دعاؤں سے فائدہ اٹھائے گا۔

اگر آپ نے اس نکتہ کو پہچان لیا ہے تو اب ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں جو انشاء اللہ یاد رہ جائے گا۔

ہماری تاریخ میں ایک دور میں دُعا دیکھنے میں آئے۔

ایک دادا، ایک پوتا۔

اور جب دونوں کی تاریخ پڑھی تو دادا کو پہچان گیا ان کے خطبوں سے اور پوتے

کو پہچانا گیا ان کی دعاؤں سے۔

ہنچ البلاغہ پڑھے تو مولائے کائنات کے خطبے میں اور صحیفہ سجادہ پر پڑھے تو امام سجادؑ کی دعائیں ہیں۔ اُن کی عظمتوں کو خطبوں سے پہچانا۔ ان کی جلالوں کو دعاؤں سے پہچانا۔

آخر ایسا کیوں ہوا؟

شاید راز یہ ہے کہ خطبہ اور دعاؤں میں ایک بنیادی فرق ہوتا ہے کہ خطبہ بندوں کے سامنے ہوتا ہے اور دعا خدا کے سامنے ہوتی ہے۔ تو جب تک حالات سازگار رہتے ہیں اور سُننے والے مل جاتے ہیں حقیقتوں کو سمجھانے کے لئے خطبہ کا سہارا لیا جاتا ہے اور جب دنیا الگ ہو جاتی ہے تو حقیقت کو پہچاننے کے لئے دعاؤں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ صلوٰات

یوں تو ہماری تاریخ امامت میں چار علی ہیں، مگر میں نے دو ہی کا حوالہ دیا ہے جہاں درمیان میں صرف ایک پشت کا فاصلہ ہے کہ وہ دادا ہیں اور یہ پوتے، اور دونوں کی تاریخ حیات اس انداز سے ہمارے سامنے آئی ہے کہ حقائق وہی ہیں مولائے کائنات کے خطبے پڑھیں اور معرفت پروردگار کے مضامین دیکھیں اور امام سجادؑ کی دعائیں پڑھیں اور وہی معرفت کے مضامین دیکھیں۔ مولائے کائنات کے خطبوں میں وہی نصیحتیں ہیں اور امام سجادؑ کی دعاؤں میں بھی وہی نصیحتیں ہیں۔

مکارم الاخلاق کوئی خطبہ تو نہیں ہے۔ میں اشارہ کر رہا ہوں تاکہ آپ محاکمہ پڑھیں۔ الحمد للہ اب تو مفتاح الجنان اردو میں بھی موجود ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مکارم الاخلاق امام سجادؑ کی دعا ہے لیکن ہے کیا؟ مکارم الاخلاق، اول سے آخر تک خالی اخلاقیات کی تعلیم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ بات اگر خطبہ میں کہی جاتی تو یہ کہا جاتا کہ یہ کام کرو اور وہ کام نہ کرو۔ اس سے بچو اور اس سے مت بچو اسے چھوڑو اور اُسے مت چھوڑو۔ لیکن جب یہ بات دعا کی شکل میں آئی کہ خدا یا! اس سے بچانا۔ اُس سے بچانا۔ اس سے محفوظ رکھنا۔ یہ کام نہ ہونے پائے۔ وہ کام

نہ ہونے پائے تو قصہ یہ ہے کہ بندے اچھائیاں اور بُرائیاں پہچان لیں۔ اب اگر حالات سازگار نہیں ہیں اور لوگ بعنوان ناصح مجھ سے نہیں سننا چاہتے ہیں تو میں اپنے خدا سے کہوں گا تاکہ بات بندوں کے لئے محفوظ رہ جائے۔ صلوٰات

جلدی جلدی ایک جملہ اور سن لیں تاکہ میں اس منزل تہید سے گزر جاؤں اور جو باتیں گزارش کرنا ہیں امام حسین علیہ السلام کی دعاؤں سے متعلق، انھیں کچھ گزارش کر سکوں اور آپ اُن دعاؤں کی عظمتوں کا احساس کر سکیں۔

ایک منزل درمیان میں جو روزِ صبح و شام ہماری زندگی میں آتی رہتی ہے کہ بندوں کو ایک یہی شکایت رہ جاتی ہے کہ ہم دعا کرتے ہیں اور خدا قبول نہیں کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر میں دعاؤں کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم مانگیں اور وہ دیدے۔ اب اگر ہم مانگیں اور وہ دیدے تو کیا سارا کام مکمل ہو گیا۔ حالانکہ دعا کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ انسان کو عظمت خدا کا احساس پیدا ہو۔ اور دوسری بنیاد یہ ہے کہ اسے اپنی کمزوری کا احساس پیدا ہو۔ اور سب سے بڑا شرف دعا کا یہ ہے کہ دعا اس منزل کا نام ہے، جہاں بندہ خدا سے بات کر رہا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہم کو تو بڑے آدمی سے بات کرنا بھی نصیب نہیں ہوتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ فلاں سفیر سے ایک منٹ بات کرنے کا موقع مل جائے مگر زندگی ختم ہو جاتی ہے اور موقع نہیں ملتا ہے۔ فلاں بیٹھ صاحب سے ایک لمحہ بات کرنے کا موقع مل جائے۔ وہ قائم نہیں دیتے ہیں۔ ہم حسرتیں لے کے چلے جاتے ہیں یعنی بڑے آدمی یا بڑی شخصیت یا بڑی ہستی سے بات کرنے کا موقع مل جانا، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اگر آدمی اُسے ڈاکھتا ہے اور ہرگز دریں ہر چھوٹے میں یہ منتا رہتی ہے کہ اپنے بڑے سے دوستی بات کرنے کا موقع مل جائے اور بڑوں کی مجبوریاں ہوتی ہیں کہ وہ ایک لمحہ کا وقت بھی نہیں دے سکتے ہیں۔ میں نے کہیں یہ بات گزارش کی تھی اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بات کی وضاحت کے لئے عرض کر رہا ہوں کہ ہر جگہ عوام کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ہم براہ سے، وزرا سے، سفراء سے ملاقات کا موقع نہیں ملتا ہے۔ حالانکہ یہ بیچارے

jabir.abbas@yahoo.com

یہ نہیں سوچتے ہیں کہ جس ملک میں مثلاً ایک کروڑ کی آبادی ہے۔ اگر سربراہ مملکت اپنے عوام میں سب سے ایک ایک منٹ بات کرنا چاہے اور ہر ایک کو ایک منٹ کا وقت دے تو کل کتنے منٹ چاہئیں۔ ایک کروڑ منٹ۔ اب گھر جا کے جوڑیے کا اور صاب لگاکے بتائیے گا کہ ایک کروڑ منٹ میں کتنے گھنٹے ہوں گے، کتنے ہفتے ہوں گے کتنے مہینے ہوں گے اور پھر بھی سب نکلیں گے شکایت کرتے ہوئے کہ ہم ابھی کتنے ہی نہیں پائے تھے کہ نکال دے گئے۔ یہ تو ایک ایک منٹ کا حال ہے پھر اگر پانچ پانچ منٹ کا وقت دے دیا جائے تو قیامت ہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر بڑے انسان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ لوگوں کو بات کرنے کا ٹائم نہیں دے سکتا ہے کہ مجبوراً وہ ہے۔ اسکا نات محدود ہیں۔ وہ لاکھ کوشش کرے مگر نہیں کر سکتا ہے۔ اور چھوٹوں میں یہ حسرت بہر حال رہ جائے گی کہ کسی بڑے سے ایک منٹ بات کرنے کا موقع مل جاتا۔ تو عزیزو! اگر سب میں یہ حسرت ہے اور ہر بڑے کی یہ مجبوری ہے کہ ٹائم نہیں دے سکتا ہے تو اسلام متوجہ کر رہا ہے کہ تم نے کس کو بڑا سمجھ لیا؟ سرمایہ دار کو بڑا سمجھ لیا؟ میں کو بڑا سمجھ لیا؟ پھر اللہ اکبر کیوں کہا تھا؟ اگر یہی سب بڑے تھے تو نعم اللہ اکبر کی کیا ضرورت تھی؟ اب اگر اللہ اکبر کہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سب سے بڑا وہ ہے اور ایسا بڑا ہے جو کسی کو حسرت سے مرنے نہیں دے گا۔ اسے منٹوں اور گھنٹوں کا کیا ذکر ہے۔ تم دن بھر کھڑے رہو۔ رات بھر اواز دیتے رہو وہ کبھی نہ منع کرے گا کہ بس اب تھک گئے اب نہ سنیں گے۔

دعا اس شرف کا نام ہے جہاں بندوں کو مالک سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے اور اس سے برا شرف انسان کی زندگی میں کوئی نہیں ہے، اگر انسان واقف خدا کی بڑائی اور اس کی عظمت کو پہچانتا ہے۔

اب یہاں تک آنے کے بعد ایک جملہ اور گزارش کر دوں۔ آج کے دور میں بچوں کا سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ سائنس کی ترقی نے لوگوں کو لاد مذہب بنا دیا ہے، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ان ترقیات نے کتنے حقائق

کو پہنچانے کے لئے بہترین وسیلہ فراہم کر دیا ہے کہ ہمارے بچے اگر نہیں سمجھتے ہیں تو سمجھ سکے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمیں کسی بڑے سے بات کرنا ہے تو کیسے بات کریں۔ وہ یہاں رہتے نہیں اور ہم ان کے یہاں جا نہیں سکتے ہیں۔ تو کہا کوئی بات نہیں ہے، ہمارا بارہ سو دو سو ہم خرچ کر کے چھوٹا سا آکر خرید لیجئے، وہ بھی منتر کہ جلتا پھرتا۔ یہی نہیں کہ کہیں میں پر رکھا ہوا ہے یا کسی کسی پر رکھا ہوا ہے۔ بلکہ آپ کی جیب میں ہے آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ امریکہ میں کسی آدمی سے بات کریں۔ انڈیا میں انسان میں۔ چین میں۔ جاپان میں۔ کہیں بھی کسی سے بات کرنا چاہتے ہیں یہ آکر آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بس جیسے ہی آپ نے نمبر ڈائل کیا وہاں گھنٹی بجی اور باتیں شروع ہو گئیں کہاں لسنے والا۔ کہاں سننے والا؟ مگر باتیں ہو رہی ہیں۔ وہ کہہ رہا ہے، یہ سن رہے ہیں۔ یہ کہہ رہے ہیں وہ سن رہا ہے۔ دیکھئے سائنس نے ہم کو کہاں پہنچا دیا کہ یہاں والے کا رابطہ وہاں والے سے ہو گیا۔ اس نے اپنی بات سنا دی، اس نے اپنا جواب دیا۔ اسارا کارو بار چل رہا ہے یا نہیں؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں والے کا رابطہ وہاں والے سے ہو سکتا ہے۔ درمیان میں کوئی آکر چاہئے، درمیان میں کوئی وسیلہ چاہئے۔ دنیا داری میں اس وسیلہ کا نام ہے موبائل۔ مذہب میں اس وسیلہ کا نام ہے دعا۔ جیسے ہی تم نے ہاتھ پھیلا یا مالک سے باتیں شروع ہو گئیں۔ مگر شرط یہی ہے کہ اس سے بات کرنا ہے اسی نمبر ڈائل کیجئے گا۔ ورنہ بات کرنا چاہتے ہیں کسی اور سے، مگر کسی اور کا ڈائل کر دیا ہے تو باتیں برباد ہو جائیں گی۔ اور اگر کسی اور نے فون اٹھا لیا تو دو چار باتیں بھی سننے میں آجائیں گی کہ دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اور وہ شبے رات کو تم نے کیوں ٹیلی فون کیا، ابھی پولیس کو اطلاع کرتے ہیں۔

انٹرا ایننگا مہ کھڑا ہو گیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ نمبر غلط ڈائل ہو گیا ہے۔ بات کرنا ہے کسی اور سے، نمبر ڈائل کر دیا کسی اور کا۔

اسلام بھی یہی سمجھتا ہے کہ اگر خدا سے مانگنا ہے تو پھر خدا جی سے کہنا ہے، نہیں کہ نگاہ کسی اور کی جیب پر ہے، کسی اور کی سفارش پر ہے اور کہہ رہے ہیں

خدا سے۔ یہ سب وہ رنگ نمبر والے ہیں کہ جن کی دعا کبھی قبول ہونے والی نہیں ہے اور یہ درکار پلٹ کے پوچھ سکتا ہے کہ ہم سے مانگا کس دن تھا۔ ہمارا خیال ایکس دن تھا۔ تم تو کسی اور سے مانگنا چاہتے تھے، ہم کو صرف ذریعہ بنایا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ یہ کائنات ہمارے لئے ذریعہ بنے۔ تم نے کائنات کے لئے ہم کو ذریعہ بنادیا۔ اتنی بڑی ذلت تو ہم برداشت بھی نہیں کر سکتے ہیں، لہذا پہلے بات صریح کرو پھر دیکھو ہم سنتے ہیں یا نہیں، ہم قبول کرتے ہیں یا نہیں۔

اور جس طرح سے ہمیں اپنی آواز پہنچانے کے لئے کوئی ذریعہ چاہئے، بڑی سے بڑی شخصیت بھی اگر عوام تک اپنی آواز پہنچانا چاہے تو ریڈیو کا ذریعہ چاہئے، ٹی وی کا ذریعہ چاہئے، کوئی شخص بھی اگر اپنی آواز دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے تو ٹیلی فون چاہئے، موبائل چاہئے۔ بغیر وسیلہ کے کسی کی بات کسی تک نہیں پہنچ سکتی ہے۔ آپ کھڑے ہو گئے ریڈیو اسٹیشن پر تقریر کرنے کے واسطے تاکہ عوام آپ کا پیغام سنیں۔ اس غریب کے گھر میں ریڈیو ہے ہی نہیں تو فائدہ کیا ہو گا۔ آپ نے موبائل خرید لیا ہے اور جس سے بات کرنا چاہتے ہیں اس کے گھر میں ٹیلی فون ہے ہی نہیں، تو آپ کی محنت برباد ہو جائے گی۔ یعنی جس کے ذریعہ سے بات کرنا چاہتے ہیں اس کا ایک کنکشن اگر ادھر ہو تو ایک کنکشن ادھر بھی ہونا چاہئے، ورنہ بات وہاں تک نہ پہنچ سکے گی۔

اب اگر خدا سے بات کرنا چاہتے ہو تو وہاں بھی ایسے وسائل تلاش کرو جن کا تعلق ادھر بھی ہو، ادھر بھی ہوتا کہ سے کم بات پہنچ تو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم نے انھیں وسیلہ بنایا ہے جو ادھر والے تھے اور ادھر کی لئے بھیجے گئے تھے کہ ادھر کی باتوں کو ادھر پہنچادیں، جیسے ادھر کا پیغام یہاں لائے تھے۔ صلوات

غیر عزیزان محترم! اس سے زیادہ وقت نہیں صرف کر سکتا، ورنہ بات نامکمل رہ جائے گی۔ دعاؤں کی دنیا میں ڈکو دعائیں ہیں۔ انتہائی مفصل اور انتہائی عظیم

ظاہر ہے کہ میں کسی دعا کے بارے میں کیا عرض کر سکتا ہوں میں کیا اور میری تعریف کیا؟ وہ بھی کلام معصوم کے بارے میں میرے آپ کے بیان کی کیا حقیقت ہے۔ کلام معصوم کو غالی سمجھ لیں یہی ہماری عظمت کے لئے بہت کافی ہے ہم اس پر کیا تبصرہ کریں گے اور کیا اس کی تعریف کریں گے۔ لیکن بہر حال علماء کے بیانات کی روشنی میں اور مطالعات کی روشنی میں ڈکو دعائیں ہیں، جو دعاؤں کی دنیا میں عظیم ترین دعائیں ہیں اور مفصل دعائیں ہیں جن میں دنیا کے سارے مضامین جو انسانی زندگی کے تعلق رکھتے ہیں وہ سب سمجھ دئے گئے ہیں جمع کر دئے گئے ہیں۔ ایک دعا ہے باپ کی اور ایک دعا ہے بیٹے کی۔ آپ "نقوش عصمت" پڑھ لیجئے الحمد للہ کہ اس میں دونوں دعاؤں کا ترجمہ موجود ہے۔ ترجمہ سمجھ تو مضمون دعا کا اندازہ آپ کو ہو جائے گا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ترجمہ کسی حقیقت کو سمجھا نہیں سکتا ہے۔ ترجمہ میری اوقات کے مطابق ہے اور دعا معصوم کی حیثیت کے مطابق ہے۔ لیکن بہر حال کچھ نہ کچھ تو اندازہ ہو ہی جاتا ہے۔

ایک دعا ہے باپ کی اور ایک دعا ہے بیٹے کی۔ ایک دعا ہے ٹھیک دوپہر میں ایک دعا ہے ادھی رات میں۔ یہ زوال آفتاب کے بعد وہ نصف شب کے بعد۔ جو دعا باپ نے کی ہے وہ میدانِ عرفات میں دعائے عرفہ ہے اور جو دعا بیٹے نے ادھی رات کے بعد کی ہے وہ دعائے ابو حمزہ ہے سحر کے ہنگام میں۔ اور جب دونوں دعاؤں کو آپ پڑھیں گے اور دونوں کے لہجے کو آپ دیکھیں گے تو اندازہ ہو گا کہ معصوم کے لہجے میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا ہے، چاہے وہ ادھی رات میں ہو چاہے دوپہر کا وقت ہو۔ وہ ہمارے لہجے ہیں جو وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے بیانات ہیں جو وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں مگر معصوم کے بیانات اور ان کے ارشادات میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا ہے۔ وہ سحر کے ہنگام بھی اپنے خدا سے ویسے ہی باتیں کر رہے ہیں جیسے کہ دوپہر کے وقت اپنے پروردگار کی بارگاہ میں گزارشات پیش کرتے ہیں۔

اما آئینہ کی دعائے عرفہ اور امام سجاد کی دعائے سحر جس کو دعائے ابو حمزہ

کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل ابو حمزہ کی دعا نہیں ہے یہ تو ابو حمزہ کا شرف ہے کہ امام نے ان کو یہ دعا بتادی اور فقط بتا نہیں دی بلکہ دے دی اور یہ شرف بھی صرف ان بندوں کو حاصل ہوا ہے۔ ایک جناب کیل کو اور ایک جناب ابو حمزہ کو کہہ دیا کہ کیل کو جو پڑھا دیا وہ دعا کیل سے اور امام سجاد نے جو ابو حمزہ کو سکھا دیا وہ دعا ابو حمزہ سے۔ نہ اس کا کیل سے کوئی تعلق ہے اور نہ اس کا ابو حمزہ سے کوئی تعلق ہے۔

یہ تو آل محمد کا کرم ہے جو دولت دنیا تک محدود نہیں ہے۔ جو لینا چاہو دولت لے جاؤ، دولت عقبیٰ لے جاؤ۔

اب آئیے اسی دعا کے عرف کے چند فقرے سن لیجیے۔ تین طرح کی باتیں ہیں تین حصے ہیں جو اس دعا کے عرف کے اندر پائے جاتے ہیں۔

ایک حصے کا تعلق معرفت پروردگار سے ہے۔ ہم نے خدا کو کیسے پہچانا۔ ہر کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ زمین کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کا کوئی خالق ہے۔ آسمان کو دیکھا تو معلوم ہوا اس کا کوئی مالک ہے۔ یہی مخلوقات ہیں جن کے ذریعہ خالق کو پہچانا جاتا ہے۔ کہ جب یہ کائنات ہے تو کوئی بنانے والا ضرور ہو گا۔ جب یہ دنیا ہے تو کوئی پیدا کرنے والا ضرور ہو گا۔ لیکن امام حسینؑ بارگاہ الہی میں عرض کرتے ہیں کہ پروردگار اگرچہ بندوں کے واسطے اور ان کی اذیت کے لئے یہی ایک ذریعہ ہے کہ مخلوقات کے ذریعہ خالق کو پہچانیں مگر مشکل یہ ہے کہ بندہ جتنا مخلوقات میں غور کرتا چلا جاتا ہے، اتنا ہی تجھ سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ آپ محسوس کر سکیں تو عجیب بات فرمائی ہے، اس کو ایک چھوٹی سی مثال سے واضح کر دوں تو بات جلدی واضح ہو جائے گی۔

سڑک پر کھڑے ہوئے تھے، ہائی وے پر اور دیکھا کہ ایک گاڑی گزر گئی سانس سے دو سو میل کی اسپید سے۔ جیسے ہی ہم نے تیز رفتار گاڑی کو دیکھا۔ پوچھا کہ کس کمپنی کی جی ہوئی ہے یعنی پہلا خیال آیا بنانے والے کا، اور جب اس کے بعد

گاڑی رگ گئی اور گئے اسے دیکھنے کے واسطے کہ یہ کیسی گاڑی بنائی گئی ہے جو دو سو میل کی اسپید سے چلتی ہے۔ تو کبھی گیر دیکھ رہے ہیں، کبھی اسپرنگ دیکھ رہے ہیں، کبھی پیسٹ دیکھ رہے ہیں، کبھی ٹائر دیکھ رہے ہیں، کبھی باڈی دیکھ رہے ہیں۔ یہ سب دیکھتے چلے جا رہے ہیں اور جو بنانے والا ہے وہ ذہن سے نکلتا جا رہا ہے۔

خدا یا! تو نے کہا ان کے ذریعہ ہم کو پہچانو۔ ہم تو اگر انھیں میں گم ہو گئے تو ہم سے غافل ہو جائیں گے۔ لہذا اگر ادھر بھیجے تو اتنا کرم اور کر دے کہ ہم کائنات کو دیکھیں مگر تو بھیج کے اپنی بارگاہ تک پہنچا دے۔ صلوات

در نہ ہم سب اگر ادھر چلے آئے تو ادھر ہی کے ہو گے رہ جائیں گے اور ہم سے غافل ہو جائیں گے۔ لہذا مالک تو ہی ہم کو پھر اپنی بارگاہ میں بلالینا کہ اس کائنات کو فقط ذریعہ سمجھیں۔ یہ مقصد نہ بننے پائے کہ ہمیں گم ہو گے وہ جائیں۔ کتنی سچی بات کہی ہے کہنے والے نے اور سمجھا دے آدمی نے کہی ہے، یہی مومن اور کافر میں ہوتا ہے:

کافر کی نظر وہ ہے جو آفاق میں گم ہو
مومن کی نظر وہ ہے کہ گم جس میں ہوں آفاق

مومن میں کھو کر نہیں رہ جاتا ہے۔ مومن پر وہ کے پیچھے اس کائنات کے مالک کو نہیں دیکھتا ہے اور جو یہیں گم ہو کے رہ جاتا ہے وہ کفر کی نگاہ رکھتا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ پہچاننے والے کی شان یہ ہے کہ وہ اس سے زیادہ واضح ہو جس کے پہچاننے کا ذریعہ بنایا گیا ہے ورنہ تعارف کا کام نامکمل رہ جائے گا۔ مثال کے طور پر ہمارے تعلقات ایک صاحب سے ہیں۔ ہم ان کے باپ کو نہیں جانتے ہیں اگرچہ باپ بزرگ ہیں مگر جیسے ہی سامنے آئے کسی نے کہا یہ فلاں کے والد ہیں۔ تو کیا پڑے ہیں اور وہ چھوٹے ہیں؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ پھر یہ کیوں کہا کہ یہ لکے والد ہیں۔ اس لئے کہ ہم بچے کو جانتے ہیں باپ کو نہیں پہچانتے ہیں۔ تو جو زیادہ نمایاں تھا اس کے ذریعہ اس کو پہچانا جاتا ہے جو نمایاں نہیں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک لکھی

jabir.abbas@yaho

کہ ہم جانتے ہیں اور ان کیسے کو ہم نہیں جانتے ہیں۔ تو جب صاحبزادے کا تعارف ہوا تو کہا گیا یہ فلاں کے بیٹے ہیں۔ اس لئے کہ ہم پر وہ نمایاں ہیں یہ نمایاں نہیں ہیں۔ تو گویا پہچانے کا مزاج یہ ہے کہ جو زیادہ نمایاں ہوتا ہے اُسے ذریعہ بنایا جاتا ہے اس کو پہچاننے کے لئے جو واضح نہ ہو۔

خدا یا کیا تجھ سے زیادہ بھی کوئی واضح ہے؟ کیا تجھ سے زیادہ کسی کا وجود نمایاں ہے کہ اس کو تیرے واسطے ذریعہ بنایا جائے؟ ہر شے میں تو تیرا ہی جلوہ ہے۔ تیرے علاوہ کون ہے جو پہچنوائے گا ہر صلوٰۃ

یہ حقیقتیں وہ ہیں جن کو معصوم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے۔ لہذا امام حسینؑ نے فیصلہ سنایا کہ جو آنکھ تجھے اپنا تنکھا نہ دیکھے وہ آنکھ اندھی ہے اور جس کو مخلوقات دکھائی دے اور تو نہ دکھائی دے وہ آنکھ اندھی ہے اور اس انسان کو زندگی میں سوا گھٹائے کے کچھ نہیں ملے جس کو تو نے اپنی محبت کا کوئی حصہ نہیں دیا ہے۔ دولت بے کے کیا کرے گا۔ کرے گی کے کیا کرے گا۔ اختیار بے کے کیا کرے گا اگر دولت جنت پروردگار نہ ملے۔

یہ ایک حصہ ہے جو حصہ معرفت ہے اب اس کا ایک آخری فقرہ سن لیجئے اور شائد بات یہیں تمام بھی ہو جائے۔

خدا یا! میں تو ایک بات جانتا ہوں کہ جس نے تجھے کھودیا اس نے پایا کیا، اور جس نے تجھے پایا اس نے کھویا کیا؟

شاعری کی دنیا میں ایک لفظ کہا جاتا ہے کہ شعر کا کمال یہ ہے کہ ایک مصرع پڑھا جائے تو دوسرا مصرع خود سمجھ میں آجائے لیکن یہ حقائق کی دنیا ہے جملہ خود دل رہا ہے پروردگار! جس نے تجھے کھودیا اس نے پایا کیا۔ اور جس نے تجھے پایا اس نے کھویا کیا۔ صلوٰۃ

یہ درس معرفت ہے جو امام حسینؑ نے دیا ہے مگر یہ شکل درس نہیں ہے اور نہ کوئی خطبہ ہے۔ یہ دعا ہے جو خدا کی بارگاہ میں ہو رہی ہے، درس معرفت بھی ہے

اور زندگی کا اظہار بھی ہے۔

اب اس کے بعد پروردگار عالم سے مانگے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایک طریقہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب خدا سے مانگو تو پہلے خدا کے کرم کا حوالہ دو کہ کسی سے کچھ لینے کے واسطے ان احسانات کا حوالہ دو جو اس سے پہلے وہ کر چکا ہے مثال کے طور پر آپ کو کسی کا رخیہ کے لئے چندہ لینا ہے، تو آپ کہیں گے کہ دیکھئے آپ کے پاس اس لئے آئے ہیں کہ ہم نے سنا ہے کہ فلاں مسجد میں آپ نے ایک ہزار دیا تھا۔ فلاں مدرسہ میں آپ نے دو ہزار دے دیا تھا۔ فلاں امام بارگاہ میں چار ہزار دے دیا تھا۔ تو ہم بھی غریب ایک مسجد بنانا چاہتے ہیں۔ پانچ سو روپے دیدیجئے۔ نتیجہ کیا ہوگا وہ سمجھ گاہ کہ انھیں ہمارے کرم پر بھروسہ ہے۔ اگر نہیں بھی دینے کا ارادہ ہے تو اتنے خالوں کے بعد کچھ نہ کچھ ضرور دیجئے گا۔

آئیے اب امام حسینؑ کی دعا سنئے:

"اے وہ پروردگار، جس نے قافلہ کو یوسفؑ کے لئے روک دیا۔ یوسفؑ کنوئیں میں پڑے ہوئے تھے، قافلہ کا گزر ہو گیا۔ قافلہ گزر گیا ہوتا تو یوسفؑ کنوئیں میں پڑے رہ جاتے۔ لیکن قافلہ کو پانی کا خیال آیا اور وہ ٹھہر گیا۔ آدمیوں نے ڈول کو ڈالا تو پانی کے ساتھ دیکھا کہ ایک بچہ بھی باہر آگیا۔"

یہ کرم پروردگار ہی تو تھا کہ قافلہ والوں کے دل میں پانی کا احساس پیدا کر دیا۔ "اے وہ پروردگار، جس نے قافلہ کو صحرائیں روک دیا تاکہ تیرا یوسفؑ کنوئیں سے باہر نکل آئے۔ اور اتنا ہی نہیں کیا بلکہ اس کے بعد جب یوسفؑ بازاریں بک گئے تو پھر ایک نیا وسیلہ پیدا کیا۔ کہ یا تو غلاموں کی طرح بک رہے تھے یا عزم نہ مہر ہو گئے۔ مگر کرم کو کیا کہا جائے جو موت کے کنوئیں سے نکال کر تخت اقتدار تک پہنچا دیتا ہے۔" اس کے بعد دوسرا فقرہ:

"اے یوسفؑ کو یعقوبؑ تک پہنچانے والے!۔ تو تو وہ ہے جو بائیسوں کے لئے موتوں کا انتظام کرتا ہے۔ تیری تاریخ کرم کتنی قدیم تاریخ ہے۔ کون ایسا ہے جو تیرا

منزل کم نہیں ہے۔

اسے وہ پروردگار کہ جس نے ابراہیمؑ کا امتحان لیا۔ لیکن جیسے ہی گئے پچھری رکھی تو نے ہی ہاتھ پکڑ لیا کہ بیٹے کو ذبح نہ کرنے پائیں۔ خود ہی امتحان بھی لیا، خود ہی روک بھی لیا۔ یہ تیرا کم ہی تو ہے ورنہ اگر پچھری چل گئی ہوتی تو اسماعیلؑ کی زندگی کا کوئی امکان نہیں تھا۔

ان تمام نعمتوں کا حوالہ دینے کے بعد اب امام حسینؑ عرض دعا کرتے ہیں۔ یعنی دعا کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ عظمتِ خدا کو پہچان لو، اس کا اقرار کرو۔ اور پھر دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس کے برائے کم کا حوالہ دو، اس کے بعد اس کی بارگاہ میں دعا کرو تاکہ تمہاری دعائیں دعا کے جانے کے قابل ہو جائیں اور پھر قبول کے جانے کے لائق ہو جائیں ورنہ خالی غرض پڑی اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اس کا نام دعا ہے اور نہ طلب ہے۔ یہ صرف زبان کی ایک حرکت ہے جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اور نہ دنیا میں ہے۔

یہ ایک مختصر سا خلاصہ تھا جو میں نے دعائے امام حسین علیہ السلام کے بارے میں عرض کر دیا ہے اور باقی کچھ باتیں ہیں جو انشاء اللہ کے موضوع کے ذیل میں گزارش کروں گا کہ جو ادب دعا جانتے ہیں وہی دعا بھی کرنا جانتے ہیں اور انہیں کی دعا اس قابل ہوتی ہے کہ پروردگار اس دعا کو قبول کر لے۔ یہ امام حسینؑ کی دعا کا صرف ایک خاکہ تھا جو میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیا ہے اور اس گزارش کے ساتھ کہ جائے پوری دعا پڑھئے تاکہ وہ سلیقہ ہمارے آپ کے ہاتھ میں آجائے جو دعاؤں کا ہوا کرتا ہے۔ اور اب میں بیان کو آخری منزل تک لے جا رہا ہوں یہ کہہ کر کہ جو بندہ ایسا مستجاب الدعوات ہو، اور ایسا سلیقہ دعا جانتا ہو جس کی دعا خدا بھی رد نہ کرتا ہو۔ وہ اگر دعا کر دیتا کہ فرات کا پانی بے شیر کے بھولے کے پاس آجائے تو کیا پانی نہ آجاتا؟۔ یقیناً آجاتا۔ تو پھر جن کے پاس دعاؤں کا ایسا حربہ اور ایسا وسیلہ موجود ہو انہیں اتنی

دعائیں برداشت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنی مشقتیں برداشت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر نہیں امام حسینؑ نے فرمایا کہ میں سلیقہ دعا جانتا ہوں۔ لہذا یہ جانتا ہوں کہ کوئی منزل دعا ہے اور نہ اس موقع منزل امتحان ہے۔ ہم جب منزل امتحان میں آتے ہیں تو قربانیاں دیتے ہیں، جانیں دیتے ہیں، اولاد قربان کرتے ہیں، مصیبتیں برداشت کرتے ہیں اور درمیان میں دعا کو نہیں لاتے ہیں اور اگر دعا کرتے ہیں تو ایک ہی دعا کرتے ہیں کہ خدا یا! ہمارے قدموں میں لغزش نہ ہونے پائے۔ پروردگار صبر کے ساتھ یہ منزل امتحان بھی طے ہو جائے اور واقعا اللہ کے وہ بندے کہ جن کی ہر دعا قابل قبول تھی انہوں نے یہ بھی اس منزل امتحان کو سر کیا ہے اور اگر کوئی دعا کی ہے تو خدا ایک ہی دعا کی ہے کہ خدا یا! صبر و شہادت عطا فرما۔ ہم نہیں چاہتے ہیں کہ تلواریں کندہ ہو جائیں، نہیں چاہتے ہیں کہ نیزوں کا رخ مٹ جائے، یہ چاہتے ہیں کہ سب کا رخ ہماری طرف رہے لیکن تیری نگاہ ہر بانی بھی رہے اور اتنی قوت صبر دے کہ ہر مصیبت کا تنہا مقابلہ کر سکیں۔ اتنی قوت برداشت دے کہ ساری مصیبتوں کو برداشت کر لیں اور لغزش نہ پیدا ہونے پائے۔

بس یہی ایک تمنا، یہی ایک آرزو اور یہی ایک دعا ہے جو صبح سے عصر تک کر بلا کے ہر سچا ہد کی زبان پر رہی ہے یا اس کے دلی میں رہی ہے جس کے ہاتھ ثبوت ہیں مگر اب کچھ بھی عرض کرنے کا موقع نہیں رہ گیا ہے۔ آج مذکرہ علما اگر بظاہر ہے جس کے پاس بازوؤں کی طاقت بھی ہے اور دعاؤں کی طاقت بھی ہے۔ مگر اللہ سے مجبوری مثبت کہ نہ بازوؤں کی طاقت کو استعمال کر سکتا ہے اور نہ بلاؤں کے ٹٹنے کی دعا کر سکتا ہے۔ اس کا دل ایک ہی آواز دے رہا ہے پروردگار! ہر منزل امتحان میں ثابت قدم رکھنا۔

کتنی مصیبتیں برداشت کی ہیں کوئی اندازہ کر سکتا ہے جس کو حسینؑ نے سہا یا ہو وہ تین دن سے برابر یہ سن رہا ہو اور یہ دیکھ رہا ہو کہ بچے پیاس سے لپکتے ہیں اور جب سامنے سے علما را کا گزر ہوتا ہے تو جو بچہ بھی دیکھ لیتا ہے

jabir.abbas@yahoo.com

العطش۔ العطش۔ الماء۔ الماء۔ ہائے پانی۔ ہائے پانی۔ کیا گذر رہی ہے
علمدار کے دل پر۔ کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ اسی کا دل جانتا ہے جس کے دل پر
مصیبت گزرا رہی ہے۔ زخم کوئی چیز نہیں ہیں۔ وہ چوٹ جو علمدار کے دل پر لگتی ہے
جب بچوں کی زبان سے سنا ہے ہائے پانی۔ اُنچھوئے علی اللہ

یہ پہلی منزل صبر ہے علمدار کو بلا کی۔ اس کے بعد دوسری منزل صبر آتی جب
وقت آگیا قربانیوں کا۔ تو آپ جانتے ہیں کہ بروردگار عالم نے مولائے کائنات کو
جناب اتم البین کے ذریعہ چار اولاد عنایت فرمائی تھی۔ جدانشدہ جعفر عباس اور
عثمان، جن کا نام مولائے کائنات نے جناب عثمان بن مظعون کے نام پر رکھا تھا
جو پیغمبر اسلام کے جلیل القدر صحابی تھے۔

یہ تین بھائی ہیں عباس علمدار کے۔ جب وقت آگیا قربانی کا اور دیکھا کہ
بنی ہاشم کے جوان، بنی ہاشم کے بچے۔ بنی ہاشم کے شیر سب راہ خدا میں قربان
ہوئے جارہے ہیں، تو عباس علمدار نے مولائے اجازت طلب کی اور چاہا کہ پہلے
اپنے بھائیوں کو میدان میں بھیج دیا جائے تاکہ یہ بھی ایک امتحان صبر ہو جائے۔
یہ تذکرہ اس لئے دو لفظوں میں گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ بہت سے ہمارے
بچے اور ہمارے عزیز و جوان ان شخصیتوں سے باخبر نہیں ہیں، اس لئے کہ ہمارے
یہاں چند دن کے اندر تذکرہ اتنا محدود ہوتا ہے کہ نہ کوئی اصحاب کو جان سکتا
ہے، نہ کوئی بنی ہاشم کے شیروں کے نام جان سکتا ہے نہ ان کی قربانیوں کو جاننا
ہے۔ انھیں باتوں کو نگاہ میں رکھ کے میں نے وہ نقشہ تیار کیا تھا جس میں تمام
شہدائے کربلا، ان کے قبائل، ان کی قومیں اور ان سب کے نام جمع کر کے لکھے گئے

تھے اور میں نے اس کے پہلے بھی کہا تھا اور پھر کہہ رہا ہوں کہ چند درہم کی
کوئی قیمت نہیں ہے۔ اس نقشہ کو لیجائیے، مگر بندہ کر کے صندوق میں نہ رکھے گا
نگاہ کے سامنے رکھے، بڑھتے رہے تاکہ عشرہ محرم میں ان شہیدوں کے نام
تو سامنے آتے رہیں جنہوں نے راہ حق میں قربانیاں دی ہیں۔ اور اگر نقشہ ٹوٹ جائے

میں چند درہم خرچ کیجئے تو پھر اپنے بچوں کو تعلیم دیجئے اور جو بچہ یاد کر لے پختہ شہیدوں
کے نام اسے بہتر درہم انعام بھی دیجئے تاکہ آپ کے بچے کم سے کم شہیدوں کے ناموں
سے آشنا ہو جائیں۔ وہ سب جائیں قربان کر سکتے ہیں آپ اپنے بچوں کے لئے دس
ہیں درہم بھی نہیں قربان کر سکتے ہیں۔ کون سا بڑا کام ہے کہ کم اتنی معرفت تو
پیدا ہو جائے۔

بہر حال علمدار کے تین بھائی ہیں۔ آپ نے ایک ایک کو بلایا۔ پہلے چھوٹے
بھائی کو بلایا اور کہا بھیا جاؤ قربان ہو جاؤ تاکہ میں یہ امتحان صبر بھی دے دوں۔
شیر آیا۔ علی کا شیر ہے۔ میدان میں آیا۔ داد شجاعت دی۔ جب قربان ہو گیا تو شائد
یہ بھی ایک مصلحت تھی علمدار کی کہ اپنے سامنے بھائیوں کو بھیج دیا جائے تاکہ میں اپنے
صبر کا امتحان بھی دے دوں اور اگر لاشہ اٹھانے کا وقت آجائے تو مولا کو رحمت
نہ ہونے پائے۔ میں ہی جا کے ایک ایک کے جنازہ کو بھی لے آؤں۔ ایک بھائی کو
بھیجا وہ قربان ہو گیا تو اس کا لاشہ اٹھایا اور دوسرے کو بھیج دیا۔ وہ قربان ہو گیا تو
اس کا بھی جنازہ اٹھایا۔ پھر تیسرے کو بھیجا وہ بھی راہ حق میں کام آگیا تو اس کا بھی
جنازہ اٹھایا اور جب سب کام آگئے تو کہا مولا اب میں ہی رہ گیا ہوں۔ آقا اب
مجھے بھی مرنے کی اجازت دیدیجئے۔ حسین نے جب جملہ کہا جو مقتل والوں نے نقل کیا
ہے۔ کہا عباس تم کو کیسے جانے دوں، تم تو میرے علمدار ہو؟ تم میرے لشکر کے سردار
ہو؟ میں نے مقتل میں ایک عجیب فقرہ دیکھا ہے کہ مولائے فرمایا کہ تم تو جانتے ہو کہ
سردار مارا جاتا ہے تو لشکر کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔

بس رونے والو آپ متوجہ رہیں، دو چار منٹ سے زیادہ گزارش نہیں کروں گا۔
مجھے ہی مولائے کہا بھیا سردار مارا جاتا ہے تو لشکر کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔
علمدار نے کچھ نہ کہا۔ داپسے دیکھا، بائیں دیکھا، آقا جس لشکر کا حوالہ دے رہے ہیں وہ
لشکر کہاں؟ سب تو راہ خدا میں کام آچکے ہیں۔ اب مجھے اجازت دیدیجئے۔ جو
ملاقات میں میرے منہ بچھلے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شائد جب مولائے لیا جائے

jabir.abbas@yaho

دینے میں تاخیر فرمائی تو عباس نے خیمہ کا رخ کیا۔ شاید مقصد یہ رہا ہو کہ جا کے بہن سے گزارش کریں کہ جیسے شہزادی نے سب کو اجازت دلائی ہے اس غلام کو بھی دلا دیا مگر جیسے ہی طرح کے خیمہ کو دیکھا اس نے بچی اگئی۔ العطش۔ عباس کا دل تپ گیا۔ کہا مولا میرے کی اجازت نہیں دیتے۔ سن رہے ہیں کہ بچی کیا کہہ رہی ہے۔ کہا اچھا بھیا اگر جانا چاہتے ہو تو جاؤ بچوں کے لئے پانی کا انتظام کرو۔ آواز دی بچی لاؤ مشکیزہ، اے اؤ۔ حین کی لاڈلی خیمے کے اندر آئی۔ مشکیزہ کو اٹھایا۔ لے کے چلی۔ بچے پیچھے پیچھے چلے۔ بنی بی مشکیزہ کہاں لئے جا رہی ہو؟ کہا بابا نے چپ سے فرمایا ہے پانی لانے کے لئے۔ اور میرا چچا اگر دریا پر گیا تو پانی ضرور لے آئے گا۔ بچو! مطمئن ہو جاؤ۔ بس اب تمہاری پیاس کا سلسلہ ختم ہو رہا ہے۔ اب العطش کی آواز بلند نہ ہوگی۔ اب میرا چچا جا رہا ہے۔

مشکیزہ لا کے عباس کے حوالہ کیا۔ آئے مولا کو سلام کیا۔ لے کے چلے۔ چاند نزل کا پہرہ فرات پر۔ اور غازی کے سامنے جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کیسے فوجوں کو بٹایا۔ کیسے فرات تک پہنچے۔ گھوڑا فرات میں ڈالا۔ مشکیزہ کو تڑپا۔ چلوں پانی لیا۔ ظالمو! پہچانو۔ عباس بے بس نہیں ہے مگر پانی نہیں پی سکتا ہے اس لئے کہ بچی پیاسی ہے۔ مشکیزہ انتظار کر رہی ہے۔ مشکیزہ کو بھرا۔ لے کے چلے۔ عباس کی مصیبت بھی عجب مصیبت ہے۔ میں چاہتا تھا اس مصیبت کا ذکر اسی وقت کرتا مگر شاگرد اب وقت نہیں ہے، انشاء اللہ کل جمعہ کی مجلس میں گزارش کروں گا۔ دیکھئے کہ بلا کے شہیدوں کے غم میں اور دنیا کے ہر شہید کے غم میں ایک فرق پایا جاتا ہے۔ دنیا میں جب کسی شہید کا ذکر آتا ہے تو شہید کے مصائب کا ذکر آتا ہے۔ کہ بلا کے شہید وہ ہیں کہ جن میں تنہا انسان کے ایک وجود کا ذکر نہیں ہے۔ وجود کے ایک ایک ہزار رنگا ڈالے تو ایک نئی مصیبت سامنے آتی ہے۔ ہاتھوں کی مصیبت الگ۔ پیروں کی مصیبت الگ۔ سر کی مصیبت الگ۔ آنکھوں کی مصیبت الگ۔ کہ بلا میں کتنی مصیبتیں اکٹھا ہو گئی تھیں اور ایک عباس جن پر ہزارے مصائب گذر گئے۔ سنو سنو! بس یہیں چلو

تمام کروں گا۔ عجیب منزل مصیبت ہے۔ عباس چلے۔ داہنا شانہ کٹ گیا۔ کوئی پرواہ نہیں ہے۔ جذہ قدم آگے بڑھے۔ ایک ظالم نے وار کیا بایاں شانہ کٹ گیا۔ کوئی پرواہ نہیں ہے۔ گھوڑے کو اور آگے بڑھایا تاکہ جلدی جیسے تک پانی پہنچ جائے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں کہ چلتے چلتے ایک تیر آگے عباس کی آنکھوں میں لگا رہیں سکے عزیز اور شاندار اس کے آگے میں بڑھ بھی نہ سکوں گا۔ ایک تیر علیرزائی لنگھوں میں لگا۔ اب عمار کو اک نئی پریشانی پیدا ہو گئی ہے۔ اگر آنکھوں نے ساتھ چھوڑ دیا تو کیسے فوجوں کو ہٹا کے خیمہ گاہ تک پہنچوں گا۔ ابھی اور آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ ایک تیر آگے مشک سیکڑہ پر لگا۔ جیسے ہی پانی بہا، عباس کا دل ٹوٹ گیا۔ ابھی تک رخ خیمہ گاہ کی طرف تھا اب عباس نے گھوڑے کا رخ موڑ دیا۔ اب خیمہ گاہ میں جا کے کیا کروں گا۔ لیکن ابھی پشت فرس پر ہیں۔ اب کیا کریں خیمہ گاہ میں جانا نہیں ہے اس لئے کہ پانی نہیں رہ گیا ہے۔ مشک کا سارا پانی بہ گیا ہے۔ لیکن اب مصیبت یہ بھی ہے کہ یہ شانہ بھی کٹ چکا ہے اور وہ ہاتھ بھی قلم ہو چکا ہے آنکھ میں تیر لگا ہوا ہے۔ تیر کو نکالیں تو کس طرح نکالیں۔ روایت میں ایک فقرہ پایا جاتا ہے کہ علدار نے یہ چاہا کہ تیر نکل جائے تاکہ ظالموں سے مقابلہ کر سکیں۔ مگر کیسے نکالیں۔

عزیزو! آپ کے جسم میں ایک کاٹا بھی چھب جائے تو ہاتھ ہی سے تو نکالا جائے گا۔ علدار کیسے نکالے؟۔ روایت کا عجیب فقرہ ہے کہ سر کو جھکا یا تیر کو دونوں زانوؤں سے دبایا اور جیسے ہی سر جھکا یا ویسے ہی ایک ظالم نے گزرتا دیا سر زخمی ہوا۔ علدار خاک کر بلا کی طرف چلا۔ آواز دی مولا! غلام کی خبر لیجئے۔ حین گرتے پڑتے مقتل میں آئے۔ اس وقت پہنچے جب علدار کا جسم زخمی ہو چکا تھا۔ بیٹھے۔ سر اٹھا کے زانو پر رکھا۔ عباس نے ہٹا لیا۔ حین نے کہا بھیا کیا میرے دیر سے آنے انہیاں ہے؟ کہا نہیں مولا میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میرا سر تو آپ کے زانو پر ہے۔ توڑی دیر کے بعد آپ کا سر کس کے زانو پر ہو گا؟۔ پھر کہا آقا میرے لاشہ کو خیمہ

میں نہ لے جائے گا۔ لاشہ کو چھوڑا، پرچم کو سنبھالا۔ جیسے ہی پرچم درخیمہ کے قریب آیا۔ بچی نے خیر کا پردہ اٹھایا۔ بابا آئے چچا نہیں آئے۔ بابا، بابا میسے چچا کو کہاں چھوڑا۔ میں دیکھتی ہوں کہ چچا نے بڑی دیر لگائی۔ حسین نے فرمایا: سکیہ! کیا چچا کا انتظار کر رہی ہو بیٹی؟

کہا: بابا میں کیسے انتظار نہ کرتی۔ چچا نے مجھے پانی کا وعدہ کیا تھا اور میرا چچا بیوفا نہیں ہے۔

حسین نے بچی کو کلیجہ سے گلاب۔ سکیہ! اب چچا کا انتظار نہ کرنا بیٹی۔ تیرا چچا فرات کے کنارے شانے لٹا کر سو گیا۔

اب وہ آنکھیں چپیں سے سوئیں گی جو عباس کی ہیبت سے نہ سوتی تھیں اور یہ دنیاں جاگیں گی اور انہیں سونا نصیب نہ ہوگا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

نویں مجلس

”حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔ خدا اس کو دوست رکھے“

جو حسین کو دوست رکھے“

سرکارِ دو عالم کے اس ارشادِ گرامی کی روشنی میں جو سلسلہ کلامِ شب کی مجالس میں ”عرفانِ حسین“ کے عنوان سے آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔ اسی سے متعلق چند ایسے اس مختصر سے وقت میں آپ کی خدمت میں اور گزارش کرنا ہیں۔ ان باتوں کا تعلق سرکارِ دو عالم کے اس ارشادِ گرامی کے دوسرے حصہ سے ہے۔ ”حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں“ یہ حضور کے ارشاد کا پہلا حصہ ہے۔ دوسرا حصہ ہے ”اَحَبُّ اِلَیَّ“ کسی بھی اس خبر کو مقامِ دعا میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر اس جملے کے ظاہری معنی دیکھ جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اس سے محبت کرتا ہے جو حسین سے محبت کرتا ہے اور اگر اس کے دوسرے رُوح کو دیکھا جائے تو یہ سرکار کی دعا ہے مالک کی باگاہ میں، کہ دعا یا جو حسین سے محبت کرے تو اس سے محبت کرنا اور دونوں باتیں اپنے مقامِ برحق رہا۔ اس لئے کہ پیغمبر کو خدا نے یہ عظمت عنایت فرمائی ہے کہ پیغمبر دعا بھی کریں تو آپ کہیں کہ یہ کام ہو چکا ہے۔ معصوم اور غیر معصوم کی دعا میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ معصوم کی خبر تو متبر ہو سکتی ہے مگر دعا کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ دعا کا تعلق اللہ کی مصلحت سے ہے۔ ہم تو وہی مانگتے ہیں جس میں اپنی مصلحت دیکھتے ہیں۔ مگر وہی دیکھتا ہے جس میں ہماری مصلحت دیکھتا ہے۔ اگر دنیا کا بڑا انسان چھوٹے انسان کی خواہش

کا پابند نہیں ہوتا ہے تو مالک بندہ کی آرزو کا کس طرح پابند ہو سکتا ہے۔ پتھر لاکھ پلٹا دے مگر کوئی ضروری نہیں ہے کہ باپ سے جو مانگ رہا ہے وہ باپ دے ہی دے۔ وہ لاکھ روٹا رہے مگر کوئی ضروری نہیں ہے کہ ماں سے جو تقاضا کیا ہے وہ پورا ہی ہو۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ باپ کے دل سے بیٹے کی محبت نکل گئی ہے، یا ماں کے دل سے رحم کا جذبہ ختم ہو گیا ہے۔ نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ بچہ وہ مانگ رہا ہے جس میں وہ اپنی مصلحت دیکھتا ہے، وہ اپنا فائدہ سمجھتا ہے۔ ماں باپ کا علم بچے سے زیادہ ہے۔ ان کے تجربات بچے سے زیادہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ بچہ جو کچھ مانگ رہا ہے اس کی خواہش کے مطابق تو ہے مگر مصلحت کے مطابق نہیں ہے۔ اس کی آرزو تو ہے مگر اس میں اس کا فائدہ نہیں ہے بلکہ نقصان ہے۔ ایسے موقع پر اگر ماں باپ اپنی رحمدلی کا مظاہرہ کرنے کے واسطے بچہ کی خواہش کو پورا کر دیں اور بعد میں نقصان ہو جائے تو ہر آدمی یہی کہہ سکا کہ وہ بچہ تھا آپ تو بچہ نہیں تھے۔ وہ نادان تھا آپ تو نادان نہیں تھے۔ سر دی کے زمانے میں اگر ٹھنڈا شربت دیکھ کر بچہ چل جائے تو وہ یہی سمجھ رہا ہے کہ شربت، شربت ہو جائے، چاہے سردی کا زمانہ ہو چاہے گرمی کا زمانہ ہو۔ لیکن ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ سمجھیں کہ شربت کا موسم کون سا ہوتا ہے۔ کب شربت پلا دینا بچے کے لئے مصلحت ہے اور کب شربت دے دینا بچے کے لئے ذمہ ہے۔ اگر ماں باپ بچہ کی آرزو دیکھ کے اسے خدیہ سردی کے ماحول پر شربت دے دیں اور اسے زلہ ہو جائے، زکام ہو جائے، سر سام ہو جائے، مرنے لگے تو بچہ کہنے والا کوئی نہ ہوگا۔ ہر شخص ماں باپ سے مطالبہ کرے گا کہ وہ نادان تھا، نا تجربہ کار تھا آپ تو سمجھ دار تھے۔ ہر ماں اور باپ کا یہ حق ہے کہ بچہ کی آرزو کو ٹھکرائے۔ اس کی تمنا کو پورا نہ کرے کہ وہ نادان ہے۔ یہ نادان نہیں ہیں۔ اور کسی کو حق نہیں ہے کہ باپ کو بے رحم کہے یا ماں کو جلاد قرار دے۔ تو اگر مالک کائنات اپنے بندوں کی دعا قبول نہیں کرتا ہے تو کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ یہ کیسا رحمن ہے۔ یہ کیسا رحیم ہے۔ بلکہ تقاضائے رحمت یہی ہے کہ اگر نادان نادانی کر رہا ہے تو جاننے والا اس کی نادانی

کو قبول نہ کرے۔ اگر انسان جاہل ہو کر کوئی مطالبہ کر رہا ہے تو مالک اس کی دعا کو قبول نہ کرے اور یہی مہربانی ہے اس لئے کہ بندہ کی کمزوری یہ ہے کہ وہ وہی مانگ سکتا ہے جس میں نقصان ہو۔ لیکن مالک میں ایسی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ یہیں سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کے نیک بندے اور معصومین کی دعا خدا کیوں رد نہیں کرتا ہے، ان کی ہر دعا کیوں قبول ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ ہم مانگتے ہیں اپنے علم کے مطابق۔ ہم سمجھتے ہیں فائدہ اسی میں ہوگا۔ ہمیں کیا معلوم کل کیا ہونے والا ہے۔ کیا معلوم ایک ہفتہ کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ ہمیں کیا خبر کہ ایک سال بعد کیا ہونے والا ہے یا دس سال بعد کیا ہونے والا ہے۔ لہذا وہ مانگا جس کو آج فائدہ مند دیکھا ممکن ہے وہی چیز ایک مہینہ کے بعد نقصان دہ ہو جائے، ایک سال بعد نقصان دہ ہو جائے۔ لیکن اگر خدا نے کسی کو اتنا علم دے دیا ہو کہ اب سے لے کر قیامت تک کے حالات کو دیکھ رہا ہو تو وہ جب تک قیامت تک کے مصالح کو دیکھ نہ لے گا اس وقت تک دعا کے لئے ہاتھ ہی نہ اٹھائے گا، یعنی مسئلہ قبولیت کا نہیں ہے، مسئلہ سلیقہ دعا کا ہے۔ صلوات

اللہ کے مخلص بندے مانگتے ہی وہ ہیں جو قابل قبول ہو۔ مانگتے ہی وہ ہیں جس میں مصلحت و منفعت ہو، لہذا ان کی دعا کے رد ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا ہے۔ اور یہ بات وہ ہے جس کو تنہا آپ نے اور ہم نے نہیں پہچانا، بلکہ اس حقیقت کو دشمن بھی جانتے تھے۔ بس یہ پہچان لینے کی دیر تھی کہ یہ بندہ اللہ کا مقرب بندہ ہے اور اللہ اپنے مقرب بندوں کی دعا رد نہیں کر سکتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو مہابہا میں مومنین تو نہیں آئے تھے، مخلصین تو نہیں آئے تھے، نہ پیغمبر کے ماننے والے آئے تھے، نہ اہلبیت کے ماننے والے مومنین آئے تھے۔ یہ مدھیہ سیدھے عیسائی، مسیحی، نصاریٰ اللہ کے دشمن، توحید کے دشمن۔ مگر وہ بھی ہی آواز دے رہے تھے کہ اگر یہ خدا سے کہہ دیں تو پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے۔ یعنی دشمن کو بھی یہ اعتبار تھا کہ غنیمت اسی وقت تک ہے جب تک یہ دعا نہ کریں۔ ورنہ اگر انھوں نے

منزل دعائیں قدم رکھ دیا تو ان کی دعا کے رد ہونے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اب یہ اندازہ ہوا کہ ہمارے یہاں سچے آدمی کی خبر کا اعتبار ہوتا ہے مگر دعا کا اعتبار نہیں ہوتا ہے۔ مگر جو معصومین ہیں ان کی دعا بھی معتبر ہے۔ ان کی خبر بھی معتبر ہے۔ اگر وہ ماضی کے بارے میں خبر دیں تو آپ سمجھیں یہ واقعہ صحیح ہے اور اگر مستقبل کے بارے میں دعا کریں تو آپ سمجھیں کہ ایسا ہی ہونے والا ہے۔ اس لئے کہ ان کی دعا رد نہیں ہوتی ہے۔ تو معصومین کی زندگی میں خبر اور دعا میں فرق نہیں ہے۔ اگر یہاں تک آپ کے ذہن میرے ساتھ چلے ہیں تو ایک جملہ ضنا گذاروں کے اپنے موضوع کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ سرکارِ دو عالم کی عظمت کا بہترین موقع یہ ہے کہ جو پیغمبر کے مقابلہ میں آئے۔ اگر تلواروں کا مقابلہ ہوا تو پیغمبر نے تلوار نہیں چلائی، جنگ نہیں کی، لیکن اگر مقابلہ حرفوں کا ہوا، زبان سے ہوا تو مقابلہ خود پیغمبر نے کیا ہے اس لئے کہ پیغمبر تلوار نہیں چلا سکتا ہے بات تو کہی سکتا ہے پیغمبر اختیار نہیں اٹھا سکتا ہے گفتگو تو کہی سکتا ہے۔ پیغمبر نے جو سر کے الفاظ کے ذریعہ سر کے ہیں ان کے دو مواقع تھے۔ ایک مقابلہ مکہ میں ہوا کفار و مشرکین سے جہاں پیغمبر وہ سب کچھ کہہ رہے تھے جو کفار کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ کہ ان پیچاروں کی اوقات یہ ہے کہ ٹھوکر بین پیچہ کر یا خدا ہو گیا۔ سامنے درخت کو دیکھا خدا بنا دیا۔ چاند تارے کو دیکھا خدا کہہ دیا۔ بپتے ہوئے دیا کو خدا بنا دیا۔ سر بہ فلک پہاڑ کو خدا بنا دیا۔ جو ایسے خداؤں کا تصور رکھتے ہیں وہ اس سے بالاتر خدا کے بارے میں سوچنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ مگر پیغمبر لیکر آئے ہیں اس خدا کے بارے میں جو ان کے تصورات سے بالاتر ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے ہیں کہ کوئی خدا ایسا بھی ہو گا جو ہماری نظروں سے اوجھل ہو گا۔ کوئی خدا ایسا بھی ہو گا جو ہمارے دماغوں میں نہیں آئے گا۔ کوئی خدا ایسا بھی ہو گا جہاں تک ہماری رسائی نہ ہوگی۔ مگر پیغمبر نے جو پہلا پیغام سنایا وہ اس خدا کے وعدہ لاشریک کے بارے میں تھا جو نہ نگاہ میں آیا ہے نہ آنے والا ہے، اور نہ اس کی ذات تک کسی کی فکر کی رسائی ہے۔ یہ بچا ہے کفار و مشرکین کیا سمجھیں گے کہ اس کی عظمت کیا ہے۔ یہ پہلا مقابلہ پیغمبر کا الفاظ کا مقابلہ تھا کہ وہ اپنے خدا کو خدا کہہ رہے تھے اور پیغمبر اپنے خدا کو خدا کہہ رہے تھے۔ وہ اپنے پیغام

کا نظام کہہ رہے تھے اور پیغمبر اپنے قانون کو قانون کہہ رہے تھے۔ تیرہ سال تک یہ سر کر رہے تھے مگر تلوار و ہتھیار کا استعمال نہیں ہوا۔ اور کوئی جھوٹا کہنے والا بھی نہیں پیدا ہوا اسے کہتے ہیں کہ پیغمبر نظامِ خبر میں اتنا اعتبار رکھتا تھا کہ جو دشمن خون کے پیاسے اور جان کے دشمن تھے وہ بھی پیغمبر کو ہر خبر میں صادق اور سچا کہہ رہے تھے اس کے بعد مدینہ میں آ کے ان کے الفاظ سے دوسرا مقابلہ مبارک کے میدان میں کیا۔ مگر یہاں مقابلہ خبروں کا نہیں تھا۔ یہاں مقابلہ دعاؤں کا تھا۔ یہاں مسئلہ بد دعا کرنے کا تھا لیکن یہاں مقابلہ میں جو دشمن آیا وہ بھی کہہ رہا تھا کہ یہ ایسے بندے ہیں اگر بد دعا کریں تو ان کی بد دعا رد نہ ہوگی۔ یعنی پیغمبر نے تیرہ سال میں کہہ دیا کہ وہ ایسے بندے ہیں اگر بد دعا کریں تو ان کی بد دعا رد نہ ہوگی۔ اور مدینہ میں آنے کے بعد اپنے مقابلہ میں آنے والے عیسائیوں سے یہ قرار لے لیا کہ نبی دعا میں کمزور نہیں ہے۔ وہ کہتے تھے یہ جو کہے گا وہ سچ کہے گا۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ جو دعا کرے گا وہ سچ ہو جائے گی۔ جب دونوں طرح کے دشمنوں نے خبر اور دعا دونوں کا اعتبار تسلیم کر لیا تو اب پیغمبر نے ایک اعلان کیا جس اعلان میں دعا اور خبر دونوں کو جمع کر دیا "وَالْحَقُّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِيٍّ" حق کے ساتھ ہے اور حق علی کے ساتھ ہے۔ یہ ہے خبر۔ "اللَّهُمَّ آذِرِ الْخَلْقَ مَعَ خَيْبَتَا دَارٍ" خدا یا حق کو آدھرا دھرو مڑ دینا جہدِ جہدِ علی مڑ رہے ہوں۔ یہ ہے دعا۔ اب آپ بتائیے ان دونوں میں سے کس میں شک کیا جائے۔ یہ کہا جائے کہ نبی نے جو خبر دی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ نبی نے جو دعا کی ہے کہ حق آدھر جائے گا جہدِ علی جائے گا۔ تو کبھی حق الگ بھی ہو جائے گا اسلئے کہ دعا کا اعتبار نہیں ہے۔ کیا کہا جائے۔ کہاں شک کیا جائے۔ کہاں شبہ کیا جائے۔ جہاں بھی شبہ کیا جائے شک کرنے والے کو اتنا سوچنا پڑے گا کہ اگر پہلے حصہ میں شک کیا تو مشرکین مکہ سے بدتر اور اگر دوسرے حصہ میں شک کیا تو نصارائے خیران سے بدتر۔ یہ کہا مسلمان ہو گا جو نہ نصاریٰ جیسا رہ جائے گا، نہ مشرکوں جیسا رہ جائے گا۔ صلوات (نعرہ حمدری، نعرہ صلوات)۔

اگر مسلمان کو اپنے ایمان کا اعتبار بچانا ہے تو نبی کی خبر پر بھی ایمان لانا ہوگا،

تو پیغمبر کی غلط ہو سکتی ہے اور نہ پیغمبر کی غلط ہو سکتی ہے۔ اگر حضورؐ نے کہا دیا کہ حسینؑ مجھ سے تو حسینؑ پیغمبر سے ہیں۔ اور اگر حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں حسینؑ سے ہوں تو پیغمبرؐ حسینؑ سے ہیں۔ اگر حضورؐ نے فرمایا کہ وہی خدا اس سے محبت کرے جو حسینؑ سے محبت کرے۔ تو ہر حسینؑ سے محبت کرنے والے کو یقین رکھنا چاہیے کہ اگر میری محبت کچھ ہے تو ہم محبوب خدا ہیں۔ خدا ہم سے محبت کر رہا ہے۔ اور اگر اعدائے اللہ خدا ہم سے محبت نہیں کر رہا ہے تو اس کے معنی ہیں کہ ہماری محبت نہ کر رہا ہے جو ہمارے اور حسینؑ کے درمیان ہے۔ ورنہ وعدہ الہی غلط نہیں ہو سکتا ہے۔ تو جس کو بھی ایسی مجموعیت میں شک و شبہ ہو، اُسے پہلے اپنی محبت میں شک کرنا چاہیے۔ ورنہ اگر ہماری محبت مستحکم اور مضبوط ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خدا ہم سے محبت نہ کرے۔ یعنی جس انسان کو محبوبیت پروردگار کا شرف حاصل کر لے اسے حسینؑ سے قلبی محبت کرنا ہوگی۔ اور جو حسینؑ سے واقعی محبت کرے اسے یقین کرنا چاہیے کہ پروردگار عالم اس سے

تجربہ کر کے دیکھ لیجئے، جتنا ہی آپ کو پروردگار عالم کے رحم و کرم پر اعتبار ہوگا اتنی ہی آپ کی دعا قبول ہوگی۔ اور جب دعا قبول نہ ہو تو آپ سمجھ لیجئے کہ آپ کو خدا کے کرم پر اعتبار نہیں ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال عرض کر دوں اگرچہ میں یہ موضوع چھیڑنا نہیں چاہتا تھا مگر چونکہ بات آگئی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ بات بھی آپ کے ذہن میں لپے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں پیسے کی ضرورت ہے کس سے کہنے جائیں؟ ان سے کہیں تو عزت خطرہ میں ہے۔ ان سے کہیں تو خدائی آٹا میں گئے۔ ان سے کہیں تو مال دیں گے ان سے کہیں گے تو ہاتھ کر دیں گے۔ لہذا بہتر ہے کہ پروردگار سے کہیں گے۔ کم سے کم لازماً راز تو ہے گا۔ وہ کسی سے کہنے تو نہیں چاہئے گا فلاں صاحب مانگنے کے لئے آئے تھے کپڑے تو بہت اچھے بہن کے نکلتے ہیں مگر میں غریب۔ بنتے تو اپنی جگہ پر سیٹھ ہیں مگر میں فقیر مجھ سے مانگنے کے لئے آئے تھے۔ ایک خدا ہی ہے جو کسی سے کہنے نہیں جاتا ہے اس لئے کہ سب سے بڑی صفت بندوں کے حق میں اس کا شمار الیہوب ہوتا ہے۔ وہ ہر ایک کے عیب پر پردہ ڈال دیتا ہے کوئی عیب کوئی گزردہ ہی ہو۔ ہر گناہ کو دیکھتا ہے۔ اسی لئے شیخ سعدی نے کہا تھا ہمسایہ اور خدا میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ ہمسایہ دیکھتا کچھ نہیں ہے مگر پروردگار ہر جگہ گردنہا ہے۔ خالی ماہ رمضان میں دس نئے دن ہیں گھر سے اٹھتا ہوا دھواں دیکھ لے سب کو خبر کر دے گا کہ اس گھر میں کوئی روزہ نہیں رکھتا ہے یعنی کسی کو کھانا نہ نہیں دیکھا ہے خالی دھواں دیکھا ہے۔ دھوئیں کا مطلب یہ ہے کہ آگ ہے۔ آگ کے معنی یہ ہیں کہ کچھ پک رہا ہے۔ پکنے کے معنی یہ ہیں کہ کھا جائے گا۔ کھانے کے معنی یہ ہیں کہ روزہ نہیں رکھا ہے۔ یہاں یہ مقدمات طے کر لئے اور ہر ایک کے کان میں جا کے کہہ دیا کہ بنتے بہت، ٹپے مومن ہیں مگر روزہ نہیں رکھتے ہیں۔ بھائی آپ نے دیکھا ہے کھلتے ہوئے؟ کہا یہ کیا ضروری ہے کہ ہر چیز دیکھے آدمی۔ بس دھواں دیکھ لیا کافی ہے۔ یہ ہمسایہ کا حال ہے کہ گھر سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ کہ ہر ایک کو خبر کر دیتا ہے کہ یہ روزہ نہیں رکھتا ہے اور ایک پروردگار ہے کہ آپ کہیں بھی چلے جائے ماہ رمضان میں جتنا پانی چاہے پی لیجئے، جتنا دل چاہے شربت پی لیجئے خدا کے اختیار میں ہے جو چیشانی پر ہزار لکیریں بنا سکتا ہے۔ ایک لکیر دلو

بنا دیتا کہ یہ شربت پی کے کھلا ہے۔ کیا قدرت خدا سے بعید ہے؟ کیا خدا کی طاقت میں یہ نہیں ہے؟ کیا پروردگار کے اختیار میں نہیں ہے؟ اگر پروردگار اس انسان کے گھر سے نکلتے ہوئے چیشانی پر کسی زبان میں ہی، خالی ایک نشان بنا دیتا تو ریسرچ تو لوگ خود ہی کر لیتے کہ کیا لکھا ہے۔ ہر آدمی اس کی طرف اشارہ کرتا۔ بھائی کچھ ہے۔ یہ کیا کہیں ٹھوکر کھا گئے ہیں؟ اگر گئے ہیں؟ کسی سے جھگڑا کیا ہے؟ کسی نے مارا ہے؟ کیا ہے؟ اب تحقیق ہوئی تو معلوم ہوا کھا ہوا کسی زبان میں یہ بندہ کہہ میں ماہ رمضان میں شربت پی کے نکلا ہے۔ آپ ایمان سے ہٹا ہے یہ آدمی پورے سماج میں کہیں منہ دکھانے کے لائق رہ جاتا؟ پورے مسلمان معاشرہ میں کہیں منہ دکھانے کے لائق رہ جاتا؟ ایمان جو ہم کو خدا سے چیشانی پر لکھ دیا ہے۔ یہ تو ایک جرم کا حال ہے۔ ہمارے کئے جرم ہیں کہ جوتھائیوں میں ہوتے ہیں، جو بندہ کروں میں ہوتے ہیں، جو اکیلے میں ہوتے ہیں، جو صراحت میں ہوتے ہیں، جو بیا باؤں میں ہوتے ہیں، جو اپنے محلے سے باہر نکل کے ہوتے ہیں، جو اپنے گاؤں سے باہر جا کر ہوتے ہیں، کتنی خواتین ہیں جب یہاں سے پلٹ کے اپنے گاؤں پہنچ جاتی ہیں تو وہ حجاب کہ حجاب بھی شرعاً جائے اور اس کے بعد جب وہاں سے نکل چکا لانات میں آگئیں تو اب یہاں تو اپنے گاؤں کا کوئی نہیں ہے، اپنے محلے کا کوئی نہیں ہے۔ مکان بھی اس محلے میں لیا ہے جہاں کوئی جان پہچان کا نہیں ہے۔ رہتی بھی اس غلیٹ میں ہیں جہاں کوئی جانتا ہی نہیں ہے، لہذا اب پردہ کس بات کا ہے۔ اللہ سے کوئی حجاب ہے نہیں۔ لیکن اگر پروردگار عالم نے یہ طریقہ طے کر دیا ہوتا کہ یہاں سے جو پلٹ کے چلیں اور نقاب پر نقاب دو چار اوڑھ کے نکلیں تو جیسے کپڑے پر چھپائی کا کام ہوتا ہے۔ پروردگار عالم نے ان کی پشت پر کسی منکب کو بھیج دیا کہ جا کر چھاپ دے کہ یہ ابوطی کے بازار میں بے پردہ گھومتی تھیں۔ یہ سنا رہیں۔ یہ یہاں خالی گاؤں دلوں کو دکھانے کے واسطے اتنی مقدس بن کے آئی ہیں فرمائیے دوبارہ اپنے گاؤں جانے کا ارادہ کریں گی۔ ایک جرم کو بھی پروردگار اگر بے نقاب کر دیتا تو معاشرہ میں کوئی منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاتا اگر آج آپ اور ہم زندہ ہیں، آپ کے ہمارے تعلقات ہیں، ہمارا آپ کی عزت ہے، ہمارا

jabir.abbas@yaho

آپ کا احترام ہے، ہم کو آپ کو کوئی سلام کرتا ہے، ہمارا کوئی احترام کرتا ہے تو ہر سب نتیجہ نہ ہمارے کمال کا ہے نہ ہمارے علم کا ہے، نہ ہمارے ایمان کا ہے، نہ ہمارے تقویٰ کا ہے۔ یہ سب نتیجہ فقط اس بات کا کہ خدا مرائیوں پر کردہ ڈالے ہوئے ہے۔ درہ پروردگار اگر مرائیوں کو بے نقاب کر دیتا تو دنیا کا کوئی انسان کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاتا۔ ہم کیا جانیں کہ آپ کے دل میں ہماری محبت ہے یا نفرت۔ جیسے ہی آپ نے دور سے دیکھ کر سلام کر لیا ہم خوش ہو گئے۔ ما شاء اللہ سب مومنین ہمارے خلیفین ہیں۔ ہم نے بھی آپ کو دکھا۔ کہنے خیریت تو ہے۔ بچے کیسے ہیں، گھر والے کیسے ہیں؟ کہنے لگے کہ دیکھئے مولانا کو ہمارے سارے گھر والوں کی فکر ہے۔ کیا معلوم کہ سامنے پڑ گئے ہیں تو بھڑا پوچھ لیا ہے، ورنہ شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ العیاذ باللہ۔ یہ سب کیوں ہے؟ آپ ہم سے خلوص رکھتے ہیں، ہم آپ سے خلوص رکھتے ہیں اس لئے کہ نہ آپ کو معلوم ہے کہ ہماری خیریت کیسی ہے نہ ہم کو معلوم ہے کہ آپ کا سلام کیا ہے؟ یہ سب خداوند عالم کا کام ہے کہ اس نے بندوں کے سارے حالات پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ ورنہ کیسے تعلقات اور کہاں کا معاشرہ اور کیسے لوگ اور کیسی عورت کچھ نہ رہ جاتا اگر پروردگار عالم کا یہ ایک کام شامل حال نہ ہوتا تو وہ خدا بھڑا جتنا مہربان ہے اس کے بارے میں انسان یہ بولگانی کرے کہ نہیں سنتا ہے اور ہم مانگتے ہیں تو وہ نہیں دیتا ہے۔ تو پھر دینے والا کون ہے؟ ساری خرابی یہ ہے کہ ہم اس سے مانگتے ہی نہیں ہیں۔ ہم اس سے تقاضا ہی نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ جب ہر دروازہ کا تجربہ کر لیتے ہیں تو اس کی بارگاہ میں جاتے ہیں۔ پہلے لوگوں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں جب کوئی سہارا نہیں رہ جاتا ہے تب اس کی بارگاہ یاد آتی ہے لیکن روایات میں سیرت پیغمبر میں تمام مومنین نے لکھا ہے کہ مَلِكًا حَزْبًا مِّنْكُمْ يَجْعَلُ رَأْسًا لِّمَنْ يَشَاءُ مِنْكُمْ فَذَلِكُمْ هُوَ الْمَلِكُ الْقَائِمُ يَوْمَئِذٍ يَكُنُ لِرَأْسِ كُلِّ طَائِفَةٍ مِنْكُمْ رَأْسٌ فَهُوَ يُعْطِيهِمْ مِنْهُ ذَاتُ الْكُرْسِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَبْصُرُ مَا تَكْتُمُ السُّرُورُ وَمَنْ يُكَلِّمْهُ يَكُنْ لَهُ كَلِمَةً وَسِعَتْ سَدْرُ الْمُنْكَرِ يَوْمَئِذٍ يَكُنُ لِرَأْسِ كُلِّ طَائِفَةٍ مِنْكُمْ رَأْسٌ فَهُوَ يُعْطِيهِمْ مِنْهُ ذَاتُ الْكُرْسِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَبْصُرُ مَا تَكْتُمُ السُّرُورُ وَمَنْ يُكَلِّمْهُ يَكُنْ لَهُ كَلِمَةً وَسِعَتْ سَدْرُ الْمُنْكَرِ

ہم نے افراد پائے جاتے ہیں۔ بڑے طاقت والے، بڑے پیسے والے، بڑے مدرسے والے۔ لیکن مجھ سے بڑا کوئی نہیں ہے۔ تو اگر میرے لئے کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے تو اس کو دیکھوں، سب تو مجھ سے کمزور ہیں۔ سب تو خود ہی میرے فقیر ہیں۔ میں اگر دیکھوں گا تو اسی کو دیکھوں گا جو میرا بھی خالق و مالک ہے۔ اب یہ اس کی شانِ کرم ہے کہ وہ کیسے دے گا۔ ہو سکتا ہے آسمان سے پیسے کی تھیلی برس پڑے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ میرے دروازے پر جاؤ اور غصہ کر لو۔ ہو سکتا ہے کوئی اور راستہ بتائے۔ یہ تو اس کا کام ہے کہ کیا کہے گا۔ مانگنا ہمارا کام ہے دینا اس کا کام ہے۔ ہم اپنے سلیقے سے مانگتے ہیں وہ اپنے طریقے سے دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں پیسے کی ضرورت ہو وہ عقدہ سحر لاکھ دیدے۔ ہو سکتا ہے ہمیں مدد درکار ہو۔ وہ کہدے "نَادِ عِيْسَىٰ"۔ لفظ "نَادِ عِيْسَىٰ" طاقت ہے کہ نبی نے علی کو نہیں پکارا ہے۔ خدا نے کہا ہے "نَادِ عِيْسَىٰ"۔ تم علی کو پکارو۔ اگر نبی نے پکار لیا ہوتا تو برداری کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ لیکن جب خدا نے حکم دیا ہے تو اب یہ معلوم ہوا کہ خدا جب کسی کی مشکلات کو حل کرنا چاہتا ہے تو علی کو ذریعہ قرار دیتا ہے۔ صلوات

عزیزانِ محترم! میں یہ گزارش کر رہا تھا کہ پروردگار عالم اپنے بندوں کے محبت کرتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ بندہ جین سے محبت کرے۔ اگر ہمیں شک ہے کہ ہم پروردگار کی بارگاہ میں محبوب ہیں کہ نہیں ہیں؟ تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ خدا نے پیغمبر کی دعا کو رد کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں خود اپنی محبت میں براعتا نہیں ہے کہ واقعتاً ہم ویسے ہی چلنے والے ہیں جس کو محبت کرنے والا کہا جاتا ہے یا نہیں؟ اور اس کی بے شمار مثالیں ہماری تاریخ میں پائی جاتی ہیں۔ اور آج کی بات نہیں روزِ اقول ہے جب فرزندِ رسول مکہ سے نکل رہے تھے تو سب سے پہلے امام حسینؑ کی ملاقات فرزدق ہوئی۔ فرزدق مشہور شاعر جن کا قصیدہ آپؑ سنتے رہتے ہیں "امام زین العابدینؑ کی ان میں۔ امام سجادؑ کا ایسا شاعر جس کو قصیدہ پڑھنے کے مجرم میں قید میں ڈال دیا گیا سزا موت کی۔ مگر جو اعلان حق تھا وہ کر دیا۔ فرزدق سے ملاقات ہوئی۔ کہا فرزدق کہاں

جب یہ خطرہ میں پڑے گا، جب آرام خطرہ میں پڑے گا، جب تنخواہ خطرہ میں پڑے گی، جب حالات خطرہ میں پڑیں گے، تب یہ دیکھا جائے گا کہ اب کون جینے کا چاہنے والا ہے۔ کو ذوالوں نے اگر ابن زیاد کو دیکھ کر مسلم کا ساتھ چھوڑ دیا تھا تو وہ بڑے نالائق تھے۔ جب کہ ابن زیاد جیسا جلاد اپنے باپ کے زمانے سے پہچانا ہوا تھا۔ جیسا زیاد ویسا ابن زیاد۔ تو جس کو باپ دادا سے لوگ جانتے تھے کہ جلاد ہے، خوں ریز ہے، بے رحم ہے، نالائق ہے۔ اس کے آنے کے بعد اگر کو ذکے حالات بدل جائیں اور لوگ مسلم غریب کا ساتھ نہ دیں تو کون سی حیرت کی بات ہے۔ ابن زیاد تو بہت بڑا ظالم تھا۔ اگر چھوٹے سے چھوٹے ظلم کا دور سے احساس پیدا ہو جائے تو انسان کی زندگی میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ کل ہی اتفاق سے ایک مرد مومن سے کچھ عرب بچوں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی، میں نے کہا کہ میں تو سب اہلبیت کے ہیں، بھی خدا کے ہیں، بھی رسول کے ہیں۔ لیکن مقام آزمائش میں ہم آپ کے کئے کامل ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اور اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ میں منبر بردار آیا اور میں نے ایک مرد مومن سے کہا۔ آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟ کہنے لگے ایک ہزار درہم۔ میں نے کہا کیا بڑی بات ہے اگر آپ ایک سو درہم دے دیں راہ مولائیں۔ ایک ہزار میں سے تھوڑے دیا تو مر تو نہیں جائیں گے۔ قیامت تو نہیں آجائے گی، تھوڑا سا خرچ کم ہو جائے گا۔ روزانہ گوشت کھاتے تھے ایک دن نہ کھائیں گے۔ روزانہ کوئی اچھی چیز کھاتے ہیں ایک دن نہ کھائیں گے۔ فلاں کام کرتے ہیں نہ کیجیے گا، ہوتی جہلے گا جب میں نے آپ سے کہا آپ کے ذہن میں بات آگئی اور آپ بتا دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ اسی وقت ایک آدمی نے ایک لاکھ کاپیک لاکھ دیکھا۔ اسے میری بات پسند آگئی۔ میرا انداز پسند آگیا۔ ایک لاکھ کاپیک لاکھ دیکھے دیکھا تو کیا فوراً میرے ذہن میں خیال نکلتا ہے کہ دس ہزار درہم مجھے بھی دیدینا چاہیے؟ میں آپ کے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں تو ایک مثال دے رہا ہوں۔ میں تو اپنا تجربہ کر رہا ہوں۔ آپ اپنا حساب لگائیے۔ اگر راہ مولائیں کام کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے اور محبت جین بن علی علیہا السلام کا تقاضا یہ ہے کہ ہزاروں سے تلویدے جائیں تو میں کیا دشمن حسین ہوں۔ میں کیا حسین کو

نہیں پہچانتا ہوں۔ میں نے تو محبت پر آپ کو آمادہ کیا ہے تو کیوں ایک لاکھ آنے کے بعد فوراً میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ بغیر کسی کے کہے ہوئے مجھے دس ہزار دیدینا چاہیے۔ معیار تو ایک معیار ہے، اگر یہ خیال پہلے لمحہ میں، پہلے سکند میں میرے ذہن میں نہیں آیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مجھے مکاری کرنا آتی ہے، محبت کرنا نہیں آتی ہے۔ ورنہ محبت کا ایک معیار تھا۔ اس معیار پر اسے بھی پورا کرنا چاہیے تھا اور اسی معیار پر مجھے کامل ہونا چاہیے تھا۔ یہ میرے ذہن میں محبت کیوں نہیں آتی؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ مجھے محبت کرنا نہیں آتا، پیسے نکھلانا آتا ہے۔ لوگوں کو راہ خدا میں بھیبت پڑھانا آتا ہے۔ لوگوں کو قربان کرنا آتا ہے قربان ہونا نہیں آتا ہے اور محبت قربان کرانے سے نہیں پہچانی جاتی ہے، قربان ہونے سے پہچانی جاتی ہے۔ واقعتاً جو محبت کرنے والا ہے وہ خدا کا محبوب ہے بشرطیکہ محبت صادق ہو۔ اب صادق محبت کے مقابلہ میں کیا چیزیں آتی ہیں کبھی پیسے کا مسئلہ آتا ہے، کبھی قراتنداری کا مسئلہ آتا ہے۔ ایک باپ کے دو بیٹے ہیں ایک حقیقی ہے ایک سوتیلہ۔ تو جتنی محبت اپنے حقیقی بھائی سے ہے اتنی سوتیلے سے نہیں ہے، حالانکہ اسی کے باپ کا بیٹا ہے۔ تو یہ محبت میں کمزوری کیسے پیدا ہوگئی؟ نقطہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ حقیقی نہیں ہے۔ حالانکہ کوئی بڑی بات ہے۔ نہ اس کے عمل میں کوئی کمزوری ہے، نہ ایمان اور عقیدہ میں کوئی فرق ہے۔ مگر شیطان نے ایک یہ بات پیدا کرادی کہ تم اور ہوا اور یہ اور ہیں۔ لہذا انسان میں محبت کی کمی پیدا ہوگئی مختصر یہ ہے کہ اگر دنیا سے محبت میں کوئی مثال، کوئی نمونہ دیکھنا ہے تو ایک چاہنے والا حسین کا ایسا ہے جس کی محبت پر کوئی شے اثر انداز نہ ہو سکی۔ ایسی کامل محبت کہ کوئی چیز اثر انداز نہ ہو سکی۔ جہاں دنیا والے سوتیلے بھائی کو بھائی مانتے ہوئے تکلف کرتے ہیں وہاں سوتیلے بھائی کو آدمی آقا مان لے جہاں معمولی خطوہ کو دیکھ کر انسان میدان محبت سے پیچھے ہٹ جاتا ہے وہاں انسان ہر طرح کی قربانی کے لئے تیار ہو جائے۔ یہ ہے کائنات اور یہ ہے کمال قربانی کہ خود بھی قربان ہو جائے، بھائی بھی قربان ہو جائیں، دل کے ٹکڑے بھی قربان ہو جائیں۔ محبت کی منزل پر کہلایں سب کو دیکھا مگر سب سے زیادہ

محبت میں درجہ کمال پر عباس علمدار کو دیکھا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ عباس کو یہ محبت کتنے
 رُخ سے ملی تھی۔ یہ جذبہ برادر و گارسنے کیسے کیسے عنایت فرمایا تھا۔ واقعات سب آپ
 کی زکاء کے سامنے ہیں۔ سلسلہ میں ماہ شعبان کی چوتھی تاریخ کو عباس علمدار کی ولادت
 ہوئی۔ سترہ کو آپ حضرات جلتے ہیں کہ سترہ کا زمانہ کیسا ہے۔ سلسلہ میں پیغمبر
 کے انتقال کے بعد جب حالات زمانہ بدل گئے تو مولائے کائنات نے گویا نہ نشیمنی
 اختیار کرنا اور جب تک وہ وقت نہ آیا کہ حکومتوں کا سلسلہ ختم ہو جائے اس وقت تک
 مولا منظر عام پر نہ آئے اور آئے تو اس شان سے آئے کہ مسلمانوں نے سعیت کر لی،
 خلیفۃ المسلمین ہو گئے۔ مگر یہ سلسلہ میں ہوا۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ گیارہ سے ۲۵ سال
 تک ۲۵ سال کا زمانہ ہے جو ملتی کی زندگی میں انتہائی مصائب کا دور ہے۔ ہر طرح کی مشکل
 چاہنے والے مارے جارہے ہیں۔ ایک تیل عام ہو رہا ہے۔ ہر طرح کا دباؤ ہے۔ محسن کی
 شہادت، گھر کا جل جانا، پہلوئے شہزاد کا شکستہ ہو جانا۔ اور جہاں تک آپ حالات کو
 دیکھتے چلیے۔ چاہنے والے ابو ذر سے لے کر میثم تمار تک مسلسل ستائے جارہے ہیں۔
 اسی عین دور مصائب میں عباس علمدار نے اس دنیا میں قدم رکھا۔ سلسلہ سے لے کر
 سلسلہ تک کہہ سکتے ہیں کہ تو وہی حالات نگاہ کے سامنے رہے جہاں سوائے
 مصائب اور مظالم کی خبروں کے اور کسی طرف سے کوئی اچھی خبر سننے میں نہیں آتی تھی۔
 مگر بچہ کیا باشعور ہے۔ جتنے مصائب کو دیکھ رہا ہے جو ملے اور مضبوط ہوتے چلے جائے
 ہیں۔ اس لئے کہ دیکھ رہا ہے کہ باپ سارے مصائب کے مقابلہ میں تنہا کھڑا ہے
 اور ماں بھی ایسی صاحبِ معرفت خاتون ہے کہ جیسے ہی مولائے کائنات کے گھر میں
 قدم رکھا اور شہزادوں کو دیکھا۔ شہزادوں نے بڑھکے استقبال کیا کہ ہر حال جب
 مولائے کائنات کے عقد میں آئی ہیں تو امام حسن و امام حسین کے لئے ماں کا دھڑکتی ہیں۔
 شہزادوں نے بڑھکے جناب ام البنین کا استقبال کیا۔ مگر ام البنین ٹھہر گئیں۔ بس شہزاد
 یہی پہلا اور آخری مرحلہ ہے آپ کی عزت افزائی کا۔ احسان آپ کی ہر باتوں کا۔ مگر
 خبردار مجھے ماں نہ کہئے گا اور نہ ماں سمجھے گا۔ میں اس گھر میں ماں بن کر نہیں آئی ہوں۔ ماں

فاطمہ زہرا ہیں۔ یہ ڈیوٹھی فاطمہ زہرا کی ہے جہاں پیغمبر سلام کرنے آتے تھے۔ یہ
 ہو کھٹ فاطمہ زہرا کی ہے۔ جہاں ملک الموت آکے ٹھہر جاتا تھا۔ میں اس گھر کی خادمہ
 ہوں۔ میں آپ حضرات کی خدمت کرنے کے لئے آئی ہوں۔ اس سے زیادہ اس گھر
 میں میری اور کوئی حیثیت نہیں ہے۔ طاہر ہے نہ بوجہ اس گھر کا بلایا ہو۔ جس بچہ نے
 ایسی آغوش میں تربیت پائی ہو، وہ دیکھ رہا ہے کہ اگر ماں کا روادار ہے نہ نہیں قدم
 رکھے لے بعد اپنے و شہزادوں کی سیر بہت ہے۔ نہ کہ ایک ماں کہہ سکتی ہے۔ تو
 بیٹے میں کیسے یہ بہت پیدا ہو جائے گی کہ اپنے کو بھائی کہہ کے پیش کر سکے۔ اگر ماں نے
 اپنے کو عزیز کہہ کر اپنا تعارف کرایا ہے ماں کہہ کے نہیں تو بیٹا بھی اپنے کو غلام ہی کہہ کے
 تعارف کرائے گا۔ مجھے حسین کا بھائی نہ کہو، میں مولا کا غلام ہوں۔
 یہ اتنا ہے عباس علمدار کی اور اس کے بعد عباس کا امتیاز یہ ہے کہ امام حسین کی
 ولادت کے بعد سب سے پہلے اذان و اقامت پیغمبر نے کی تھی اور جب عباس پیدا
 ہوئے تو عباس کے کان میں اذان و اقامت مولائے کائنات نے ہی کیا شرف ہے
 حسین کا کہ پہلی آواز شعی تو پیغمبر کی آواز شعی، اور کیا شرف ہے عباس علمدار کا کہ پہلی
 آواز کان میں آئی تو مولائے کائنات کی آواز آئی، اُس آواز نے کہ راجحین کو نمایاں
 کر دیا تھا اور اُس آواز نے کہ در عباس علمدار کو نمایاں کر دیا۔ اور اس کے بعد جو
 علمدار نے تربیت پائی اور جس انداز سے تربیت پائی ہے اس کا مختصر خاکہ یہ ہے کہ
 جب مولائے کائنات عالم اسلام میں خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے سامنے آئے تو مولائے
 کو دو معرکوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلا معرکہ جمل کی شکل میں، اور دوسرا معرکہ صفین کی
 شکل میں۔ آپ تاریخ پڑھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جمل کے معرکہ میں نمایاں نام
 آیا ہے محمد حنفیہ کا۔ جن کو مولائے کائنات نے میدان جنگ میں بھیجا اور مختصر طریقہ سے
 فنون جنگ کی تعلیم دے کر بھیجا اور صفین کے معرکہ میں عباس کی موجودگی کا ذکر تاریخ
 میں پایا جاتا ہے مگر اتنا فرق ہے کہ جب سلسلہ ۲۵ کے زمانے میں محمد حنفیہ آئے ہیں
 تو محمد حنفیہ جوان تھے۔ محمد حنفیہ کا سن و سال لڑنے کے لائق اور محمد حنفیہ کی عمر جنگ کے

قابل تھی۔ لیکن جو جنگ صفین میں آیا ہے ۳۵ھ میں پیدا ہونے والا انسان ہے جس کی عمر کل دس یا گیارہ سال کی ہے۔ گرد و جھلے ہیں تاریخ کے انھیں یاد رکھے گا۔ محمد حنفیہ میدان میں گئے تو ایک مرتبہ پر سوال اٹھا دیا کہ مولانا بار بار ایک ہی بیٹے کو کیوں بھیجتے ہیں؟ آخر حسن و حسین بھی تو آپ کے فرزند ہیں۔ اللہ نے انھیں بھی شجاعت دی ہے، انھیں بھی طاقت دی ہے، وہ بھی آپ کے وارث ہیں، یہ کیوں نہیں جانتے ہیں؟ جس پر مولانا ایک فقرہ فرما کر کہنے والے کو سمجھا دیا۔ دیکھ حسین! میں اور محمد صفین میں فرس ہے۔ محمد حنفیہ میرے زور بازو کا وارث ہے۔ میرا فرزند ہے۔ میں سے تربیت کی ہے میرا بیٹا ہے مگر کیا کروں کہ رشتے الگ الگ ہیں، ھمما عیننا ہی "حسن و حسین یہ دونوں میری آنکھیں ہیں۔ اور یہ میرا ہاتھ ہے۔ جب کبھی آنکھوں پر وقت آتا ہے تو ہاتھ سے پچایا جاتا ہے۔ لہذا میں چاہتا ہوں کہ یہ قربان ہو جائیں اور حسین پر آج رزائے پائے۔ یعنی وہ علی کا لالہ جو مسلسل میدان میں جہاد کر رہا ہے ایک موقع وہ آگیا جب وہ بھی ٹھہر گیا۔ کب تک بار بار میدان میں جائے گا۔ کب تک اکیلا جنگ کرتا ہے گا۔ کب تک لشکروں کا مقابلہ کرے گا۔ اس موقع پر مولانا کا ایک فقرہ تاریخ میں ہے محمد حنفیہ کی شجاعت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ العیاذ باللہ تاریخ عرب میں کوئی ان کا جیسا بہادر نہیں تھا مگر ایک لمحہ کے لئے جب محمد حنفیہ ٹھہر گئے تو مولانا نے ایک جملہ کہا "اذا رکت عتق عتق ایتلاف" میں نے تمھیں بالائے تم میرے زور بازو کے وارث ہو۔ تم میرے بیٹے ہو۔ تم میرے لال ہو۔ مگر کیا کروں کہ ایک پہلو کمزور رہ گیا ہے کہ تمھیں ماں کی طرف سے یہ شجاعت نہیں ملی ہے لہذا تمھارے قدم ایک لمحہ کے لئے رک گئے ہیں یعنی حیدر کو لڑائی کی وارثت نے آگے بڑھایا لیکن ماں کی وارثت نے ایک منزل پر قدم روک لے لے اس کے معنی یہ ہیں کہ علی کے خون کی تاثیر تو کام کر رہی تھی، لیکن چونکہ ماں کی وہ شجاعت نہیں تھی لہذا ایک لمحہ کے لئے قدم رک گئے۔ اب جس کے قدم گیارہ سال کی عمر میں بھی دڑیں اس کی شجاعت کو دیکھ کر علی کی شجاعت کا اندازہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کی شجاعت کو دیکھ کر اس ماں کی ہمت کا اندازہ ہوتا ہے جس کا انتخاب مولانا کے کائنات نے

مقبل کے ذریعہ کیا تھا۔ یعنی عباسؓ دونوں طرف سے شجاعت کے وارث تھے۔ باپ کی طرف سے شاہ لافتمی کے بیٹے تھے اور ماں کی طرف سے اس خاندان کے خیمہ چراغ تھے جو خاندان عرب میں شجاعت میں، ہمت میں، طاقت میں، نبوت میں ایک شہرت رکھتا تھا۔ لیکن اس کے بعد کمال معرفت کو بھی دیکھیں کہ باب امام حسنؓ کی صلح کا وقت آیا اور مولانا کے کائنات کی شہادت کے بعد امام حسنؓ نے صلح کرنا چاہی تو اگر مسلمانوں کا ہوتا تو امام حسنؓ اپنے مزاج کی نرمی کی بنا پر صلح کر بھی لیتے اور امام حسینؓ امام ہو کر خاموش رہ جاتے تو عباسؓ تو بہادر تھے وہ تو شجاع تھے۔ انھیں تو کم سے کم اپنی شجاعت اور اپنے غیظ و غضب کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ مگر وہ لوگ اور ہیں جن سے صلح پسند بھی برداشت نہیں ہو سکتی۔ یہاں تہا زور بازو نہیں ہے قوت ایمان بھی ہے۔ قوت عقیدہ بھی ہے کہ حسنؓ بن علیؓ امام ہیں جو کس کے دبیعت ہو گا۔ یہ موقع ہمت کے مظاہرہ کا نہیں ہے اتنا بڑا سنت معرکہ سامنے آگیا تو عباسؓ علحدہ اپنے زور بازو کو روکے رہے اس کے بعد صلح نامہ کو پھاڑ کر پھینک دیا گیا مگر اپنی ہمت و شجاعت کو روکے رہے۔ کیوں روکے رہے اس لئے کہ انھیں اس دن کے واسطے ہتیا نہیں کیا گیا ہے۔ ان کو بانے اس دن کے واسطے نہیں ہتیا کیا ہے اگر آج ان کی تلوار نہ اٹھنے تو کوئی عروج کی بات نہیں ہے۔ لیکن جس دن کے واسطے ہتیا کیا گیا ہے اس دن شجاعت کے جوہر بہر حال دیکھے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ عاشور کی رات جب زبیر بن عقیل نے آگرا دزدی۔ عباسؓ آپ سے کچھ کہنا ہے فرمایا بتائیے کیا کہنا ہے؟ کہا زرا میرے ساتھ آئیے۔ دو قدم الگ لے گئے۔ کہا آپ کو تو خود ہی معلوم ہے کہ آپ کے بانے اپنے بھائی عقیل سے کہا تھا کہ ایک ایسے بہادر خاندان کی عورت کا پتہ بتائیے جس سے میں عقد کروں تو جو اولاد ہو گا میں میرے حسینؓ کے کام آئے تو عباسؓ جس دن کے واسطے آپ کو آپ کے بانے ہتیا کیا تھا وہ دن آگیا ہے۔ روایت کہتی ہے کہ بس یہ سننا تھا کہ ایک مرتبہ شیر نے انکڑائی کی، آستینیں اٹھ گئیں۔ فرمایا اَشْتَعِبُ فِي وَشْلِ هَذَا الْيَوْمِ يَا رَهْبَانُ، زہیر آج

مجھے شجاعت کا جوش دل رہا ہے۔ بس یہ رات درمیان میں ہے۔ کل کا دن آنے دور
سحر کا راز قائم ہو جائے۔ جنگ کا بازار گرم ہو جائے پھر دیکھنا جدو کر کا لال کس
طرح لڑتا ہے۔

بس عزیز! ایک لفظ میری زبان پر آگیا اور ایک روایت مجھے یاد آگئی۔
آج ہی میں عباسؓ عمار کے حالات کا مطالعہ کر رہا تھا مجھے یہ فقہ یاد آگیا کہ بچپن میں
عباسؓ کو سولہ گودیں بٹھائے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیا شجاعت کا ذکر آگیا کہ جیسے ہی یہ
ذکر آیا دیکھو عباسؓ نے دھیرے دھیرے آستینوں کو الٹنا شروع کیا، اور جیسے ہی
عباسؓ نے آستینوں کو الٹا مولانے دیکھا کہ ہاتھ کھلا ہوا ہے۔ ابھی تو شجاعت و بہمت کی
بات ہو رہی تھی۔ ام البنین بیٹھی ہوئی یہ منظر دیکھ رہی تھیں کہ عباسؓ نے آستین الٹ لی
اور یہ دیکھ کر مولا کی آنکھ میں آنسو آگئے۔ ام البنین پریشان ہو گئیں کہ روئے کا سبب
کیا ہے۔ ابھی پوچھنا ہی چاہتی تھیں کہ روکیوں رہے ہیں کہ ایک مرتبہ ام البنین نے
ایک اور منظر دیکھا کہ جہاں تک عباسؓ نے آستینوں کو الٹ لیا تھا۔ علیؓ نے آستینوں کو اور الٹ لیا،
جیسے ہی آستینوں کو الٹا اور بازو سامنے آگئے، ٹھکے علیؓ نے بازوؤں کے بوسے لے لئے۔ اور جیسے ہی
علیؓ نے بازوؤں کو چوم دیا جیسے ہی ام البنین نے دیکھا کہ آنسوؤں کا ایک سیلاب ہے۔ اب رداشت
نہ ہو سکا۔ بیکار ہو کے کہا۔ مولا پہلے یہ بتائیے کہ اس بچے نے آستین الٹی تو آپ روئے کیوں؟ پھر آپ
نے بازوؤں کے بوسے کیوں لئے؟ اور آپ رو کیوں رہے ہیں؟

فرمایا۔ ام البنین تم ان باتوں کو دیکھ رہی ہو۔ مجھے دو باتوں کا خیال آ رہا
ہے۔ آج یہ میرے لال کا حوصلہ ہے کہ آستین الٹ رہا ہے۔ کہ باا جب وقت
آئے گا تو دیکھئے گا کہ آپ کا بیٹا کیسے جنگ کرتا ہے۔ عباسؓ کو کیا خبر کسب کو تلوار
چلانے کا موقع ملے گا مگر اس کے حوالہ مستقانی کا کام کیا جائے گا۔

تو مولا بازوؤں کا بوسہ کیوں لے لیا؟

فرمایا۔ ام البنین میری آنکھیں وہ منظر دیکھ رہی ہیں جب میرا لال فرات سے
پانی لے کے چلے گا اور اس کے شانے قلم ہو جائیں گے۔ میں ان جگہوں کو بوسہ

دے رہا ہوں اور ان بازوؤں کو چوم رہا ہوں جو میرے حسین کی محبت میں کام
آجائیں گے۔

ام البنین نے روزِ اول یہ سنا کہ میرے لال کے ہاتھ قلم ہو جائیں گے میرے
بچے کے شانے قلم ہو جائیں گے۔ اب ماں کے دل میں یہ خیال ہمیشہ کے لئے رہ گیا
جب کسی مصیبت کا خیال آیا تو عباسؓ کے بازو یاد آگئے۔ جب کسی مصیبت کا خیال
آیا تو عباسؓ کے شانے یاد آگئے۔ یہاں تک کہ کربلا کا واقعہ تمام ہو گیا۔

جب اہل حرم شام سے چھٹ کر مدینہ سے واپس آئے اور بشیر نے آگے نگیوں میں
آواز دینا شروع کی۔ مدینہ والو! کیا بیٹھے ہو، نبیؐ کا مدینہ آہوا گیا۔ حسینؓ کربلا میں آئے
گئے۔ یہ خبر پھیل رہی تھی کہ کسی نے پوچھ لیا، ارے کیا واقعہ پیش آیا؟ کیا ہوا؟ کہا
آؤ قبر پیغمبر پر بیان کر دوں گا۔ "اَلْحَبَشَةُ كَذَبَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ" سارے مدینہ
کے لوگ قبر پیغمبر کے پاس جمع ہو گئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک منظر ہاتھ میں
عصا لے ہوئے مسجر پیغمبر کے ایک گوشہ میں آکر کھڑی ہو گئیں۔ جیسے ہی بشیر نے
یہ اعلان کیا کہ مدینہ والو! غضب ہو گیا کہ کربلا میں حسینؓ مارے گئے۔ ویسے ہی منظر
نے روح کیا بجھت کا۔ یا علیؓ! آپ تو کہا کرتے تھے کہ یہ آپ کا لال آپ کی شجاعت
کا دارش ہے۔ یہ عباسؓ کہاں چلا گیا تھا کہ میرا حسینؓ مارا گیا۔ ایک مرتبہ بشیر نے
کہا بی بی ذرا خاموش رہیے، یہ نہ کہیے۔ جب تک آپ کا عباسؓ سلامت رہا حسینؓ
پر آنچ نہ سکی۔ مگر جب آپ کا شیر نہ رہ گیا تو زہراؓ کا لال زہراؓ اعداؤں بکھر گیا۔
منظر نے کہا اچھا میرا لال میرے مولا پر قربان ہو گیا؟ شاہد میرے عباسؓ!
میرے لال تو نے ماں کو سرخو کر دیا۔ تو نے ماں کو شہزادی کا منت کے مرنے
شرمندہ نہیں ہونے دیا۔

اچھا جلدی بتا کہ میرا لال کیسے قربان ہوا؟

کہا بی بی آپ کا لال فرات سے پانی لے کر آ رہا تھا کہ ایک شانہ قلم ہو گیا اور
آگے بڑھا تو دوسرا ہاتھ کٹ گیا۔ اس کے بعد سرگرداں اور پشت فرس سے زمین

پر آگیا۔ یہ سنا تھا کہ ایک مرتبہ بیقرار ہو کر کہا۔ یا علیؑ فریاد۔ یا علیؑ فریاد۔
 مولا یہ تو بتائیے کہ جب ہاتھ کٹ گئے تھے۔ سر زخمی تھا تو میرا لال گھوڑے
 سے کیسے گرا ہوگا؟ ہائے کس نے سنبھالا ہوگا۔ نہ کوئی ناصر نہ مددگار۔ مجھے کوئی بتائے
 کہ کیا یہ صحیح ہے کہ میرا عباسؑ جب گھوڑے سے گرا تو اس کے ہاتھ کٹ چکے تھے۔
 اسے ہر گز نہ والا اپنے ہاتھوں کا سہارا لیتا ہے۔ مگر میرے عباسؑ تھہر کر گدگد گئی
 ہوئی بیٹا۔ تیرے تو ہاتھ بھی سلامت نہیں تھے تو کس طرح گرا ہوگا اور تیرے دل پر
 کیا گدگد گئی ہوگی۔

سَبِّحْهُمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيْ مُقْلِبٍ يَنْقَلِبُونَ



دسویں مجلس صبر امام حسین علیہ السلام

”حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ اس سے محبت
 کرے جو میرے حسینؑ سے محبت کرے۔“

سرکارِ دو عالمؐ کے ارشادِ گرامی کی روشنی میں جو سلسلہٴ کلامِ عرفانِ حسینؑ کے
 ذیل میں آپؑ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا اس کے دسویں مرحلے پر کچھ باتیں ضرور اہم ہیں
 سے تعلق گذارش کرنا ہیں۔

اگرچہ یہ موضوع دیکھنے میں مصائب سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اگر آپؑ اس کی
 گہرائیوں پر غور کریں گے تو آپؑ کو اندازہ ہوگا کہ صبر کا تعلق تنہا مصائب سے نہیں ہے
 اور صبر کے کمالات کا اظہار تنہا منزلِ مصائب میں نہیں ہوتا ہے۔
 اصل موضوع کو گذارش کرنے سے پہلے چند لفظیں خود صبر کے بارے میں۔
 ہماری زندگی میں کبھی مصائب کو برداشت کر لینا ضرور کہا جاتا ہے اور کبھی
 مصیبتوں کو برداشت کرنے ہی کا نام ہوتا ہے بے غیرتی۔

ایسے مواقع بھی آتے ہیں جہاں آپؑ کسی مصیبت کو برداشت کر لیں تو آپؑ کو
 صابر کہا جائے گا اور ایسے مواقع بھی آتے ہیں جہاں آپؑ کسی مصیبت کو برداشت کر لیں
 تو آپؑ کو بے جا و بے غیرت کہا جائے گا کوئی صابر کہنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔
 لہذا سب سے بڑا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کس جگہ پر قوتِ برداشت کو صبر کہا جائے

jabir.abbas@yahoo.com

اور کہاں تو بت برداشت کو بے غیرتی کا نام دیا جائے۔

اگر اسرارِ ملکہ جذبات کے حوالے کر دیا جائے تو جذبات تو انسان کو کہیں صبر نہیں کرنے دیتے۔ جذبات کا تقاضا ہر جگہ یہی ہوتا ہے کہ انسان لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ جذبات کی دنیا میں جب تک جنگیں ہوتی رہتی ہیں کسی کو موت میں شک نہیں ہوتا ہے اور جیسے ہی صلح کی فوج آتی ہے وہاں بڑے بڑوں کو رسالت میں شک ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے جذبات کی دنیا دیکھی ہے، مذہب کی دنیا نہیں دیکھی ہے اور مذہبی دنیا میں یہ دونوں مرحلے الگ الگ ہیں۔ جذبات الگ ہیں اور مذہبی فیصلے الگ ہیں۔ لہذا یہ طے کرنا ہوگا کہ کس جگہ پر صبر کا نام ہے برداشت اور کس جگہ صبر اس منزل میں پہنچ جاتا ہے جہاں انسان کو بے غیبت کر دیا جاتا ہے۔

علمائے اخلاق نے اس کا بہترین فیصلہ یہ کیا ہے کہ انسان کو اپنے جذبات کے بجائے اپنی عقل یا قانون مذہب کا سہارا لینا چاہیے اور جہاں عقل بشر برداشت کرنے کی دعوت دے وہاں برداشت کا نام صبر رکھا جائے، اور جہاں عقل بشر برداشت کرنے سے روک دے وہاں برداشت کرنے کا نام بے غیرتی رکھا جائے۔ یعنی ملکہ جذبات سے طے نہ ہو بلکہ عقل سے طے ہو۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ جو صاحبانِ عقل ہیں یعنی ہم اور آپ، ہماری زندگی کا بھی یہی حال ہے کہ کبھی ہماری عقل ہمارے جذبات پر غالب آتی ہے اور کبھی ہمارے جذبات ہماری عقل پر غالب آجاتے ہیں۔ ہم یہی نہیں سمجھ پاتے کہ کہاں عقل بول رہی ہے اور کہاں جذبات بول رہے ہیں۔ لہذا اگر یہ ملکہ ہمارے اور آپ کے حوالے کر دیا گیا تو یہ طے کرنا بھی مشکل ہوگا کہ یہ جذبہ کہہ رہا ہے کہ چپ رہ جاؤ یا عقل کہتی ہے کہ چپ رہ جاؤ۔ ضرورت ہے کہ عقل کے فیصلوں کو ان افراد کے حوالے کر دیا جائے کہ جن کی زندگی میں خواہشات کا گزر نہیں ہوتا ہے کہ وہ اگر کسی جگہ پر برداشت کی

دعوت دیں تو برداشت کرنے ہی کا نام صبر ہے اور اگر وہ کہیں برداشت کرنے سے روک دیں تو برداشت کرنے کا نام صبر نہیں ہے بلکہ بے غیرتی ہے۔

اگر بات یہاں تک آگئی ہے کہ ملکہ جذبات سے نہیں طے ہوگا عقل سے طے ہوگا اور ملکہ ہر صاحبِ عقل طے نہیں کرے گا بلکہ وہ طے کریں گے جن کی عقل پر وحیِ خدا کا پہرہ ہے۔ تو میں اس مقام پر ایک لفظ کہہ کے سلسلہ کلام کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔

دنیا میں کون سا انسان ایسا ہے جو جذباتی اعتبار سے رونا چاہتا ہو۔ جذباتی اعتبار سے سب ہنسنا چاہتے ہیں، سب خوش رہنا چاہتے ہیں۔ ماں بچے کو دعا دیتی ہے خدا کرے زندگی بھر خوش رہو۔ بزرگ نے چھوٹے کو دعا دی خوش رہنے کی۔ ہر آدمی دوسرے کے لئے دعا کرتا ہے خوش رہنے کی یا دعا دیتا ہے خوش رہنے کی۔ نہ کوئی روئے کی دعا کرتا ہے اور نہ کوئی کسی کو روئے کی دعا دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جذبات ہمیشہ خوشی چاہتے ہیں، رونا نہیں چاہتے۔ تو اگر کسی مقام پر وہ اللہ کا بندہ جو جذبات سے بات بھی نہ کرتا ہو۔ رو دے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ رونا جذباتی نہیں ہے یہ رونا عقلی ہے اور ہر وہ بات جو عقل کے مطابق ہو اس کا نام صبر ہے، بے صبری نہیں ہے۔ لہذا دنیا کی ہر مصیبت پر رونابے صبری کہا جاسکتا ہے مگر غمِ حین میں رونابے صبری نہیں ہے، عین صبر ہے۔ غمِ حین میں پیغمبرِ روئے ہیں، اور پیغمبر کا کوئی کام جذباتی نہیں ہوتا ہے۔ پیغمبر کا ہر کام عقل کے مطابق اور وحی کا ترجمان ہوتا ہے۔ صلوات

یہ جو ہمیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ آپ سال بھر روتے ہی رہتے ہیں، رونا کوئی اچھا کام نہیں ہے۔ رونا تو برداشت کی کمزوری کا نام ہے۔ انسان کو صبر مزینا چاہیے اللہ صبر کی تعریف کرتا ہے۔

یہ پیچھے سے ہی نہیں جانتے ہیں کہ صبر اور بے صبری میں فرق کیا ہے صبر لے کہتے ہیں اور بے صبری کسے کہتے ہیں۔ اگر رونا غمِ حین میں بے صبری ہوتا تو ساری دنیا روتی مگر پیغمبر نہ روتے۔ مگر فراقِ یوسف میں یعقوب کا رونا اور ولادتِ محمد

سے لے کر شہادت حسین تک پیغمبر کا رونا یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہر غم میں رونا بے صبری ہو سکتا ہے، مگر ناسودہ پروردگار کے غم میں رونا بے صبری نہیں ہے۔ چاہے زندگی میں روئے جیسے نبی روئے ولادت کے موقع پر۔ یا یعقوب روئے فراق یوسف میں۔ یا مرنے کے بعد روئے جیسے پیغمبر روئے کبھی ام سلمہ کے خواب میں اور کبھی ابن عباس کے خواب میں۔ صلوات عربان محترم! یہ پہلا مرحلہ تھا کہ صبر کے معنی طے ہو جائیں کہ اگر برداشت کرنا مطابق عقل ہے تو صبر کر لینے کا نام ہے کمال۔ صبر کرنا ہے شرف انسانیت اور اگر برداشت کرنا خلاف عقل ہے تو برداشت کرنے کا نام ہے بے غیرتی اور بے حیائی۔

اب اس کے بعد آئیے اصل موضوع کے بارے میں کچھ باتیں گزارش کی جائیں کہ صبر کا کمال کیا ہے اور صبر کا فائدہ کیا ہے۔ اگر انسان قوت برداشت پیدا کر لے جو تین مقامات پر دیکھنے میں آتی ہے

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نفس انسان اطاعت سے روکتا ہے اور انسان نفس کے خلاف اطاعت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

کبھی نفس گناہ کی دعوت دیتا ہے اور انسان نفس سے ٹکرا کے گناہ کو چھوڑ دیتا ہے۔ مثال کے طور پر دو بجے رات کو سوئے اور کوذن نے علی الصباح آواز دی "حی علی الصلوٰۃ"۔ کس کا دل چاہتا ہے اٹھنے کے لئے۔ کسے یہ برداشت ہے کہ ابھی خاموشی نیند کو چھوڑ دے۔ مگر یہ جگہ ہے برداشت کرنے کی کہ خدا آواز دے رہا ہے۔ تو حکم خدا کی بنا پر نیند کو ٹھکرا کے صبر کرنا ہے۔ صبر ہر صبر۔ مفت کا مال حرام میں مل رہا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے جیکے قبضہ کر لیا جائے۔ قدرت نے آواز دی بندے! تیرے واسطے اس مال کو ہاتھ لگانا بھی حرام ہے۔ اب اگر ہاتھ کو روک لیا تو یہ ہے قوت برداشت اور اس کا

کہتے ہیں صبر تو صبر کبھی اطاعت کی منزل میں ہوتا ہے اور کبھی مصیبت کی منزل میں ہوتا ہے اور کبھی مصیبتوں کی منزل میں ہوتا ہے۔ ان سب کی مثالیں ابھی آپ کے سامنے گزارش کر دی گئیں۔ جہاں داستان صبر قرآن مجید کی روشنی میں بیان ہوئی۔ پہلے صبر کے فوائد سن لیجئے۔

اے اللہ کے بندو! صبر کے ذریعے سے مدد مانگو اور نماز کے ذریعے مدد مانگو۔ جب کوئی مصیبت آئے تو مصیبتوں سے ٹکرانے کے ذریعے ہیں۔ ایک کا نام ہے صبر اور ایک کا نام ہے صلوة (نماز)۔ جس کی ہم نے قدر نہیں پہچانی اور بجائے اس کے کہ نماز کا سہارا لے کے مصیبتوں سے مقابلہ کرتے نماز ہی کو مصیبت سمجھنے لگے۔ دیکھئے انسانیت کی بدبختی کہاں تک ہے اور انسان کی نالائقی کس منزل پر ہے کہ مصیبتوں کا ہجر ہو گیا ہے کہ ہمارا باپ مر گیا اور آپ کو نماز کی پڑی ہوئی ہے۔ ہمارا بیٹا مر گیا اور آپ کو نماز کی پڑی ہوئی ہے۔ ہماری نوکری چلی گئی اور آپ کو نماز کی پڑی ہوئی ہے۔ یہ بچاؤ یہی نہیں جانتا ہے کہ مصیبتوں کا مقابلہ نماز سے ہوتا ہے۔ اسے یہی نہیں معلوم ہے کہ مصیبتوں کے مقابلے میں بہترین سہارے کا نام ہے نماز۔ بہترین طاقت کا نام ہے نماز۔ بندہ اور خدا کے رابطے کا نام ہے نماز۔ خدا سے ملاقات کرنے کا براہ راست ذریعہ ہے نماز۔ "ایمان مستعین" لہذا نماز بہترین ذریعہ ہے مدد مانگنے کا۔ اور دوسرا ذریعہ ہے صبر۔ پہلے صبر کرو، برداشت کرو اس کے بعد خدا تمہارا ساتھ دے گا۔ لیکن پہلے تمہیں بھی کچھ کرنا ہو گا۔ صبر کرنا ہو گا کہ صبر ذریعہ ہے مانگنے کا۔ صبر سے مدد مانگو۔ صبر کے ذریعے مدد مانگو۔

معصوم سے پوچھا گیا کہ صبر کسے کہتے ہیں؟

فرمایا، آدھے ایمان کا نام ہے صبر۔

دوسری روایت میں ارشاد ہوتا ہے۔ ایمان کے دو حصے ہیں۔ آدھے آدھے دو برابر کے حصے ہیں۔ آدھا ایمان ہے صبر اور آدھا ایمان ہے شکر۔ تو نصف ایمان ہے۔ مگر خدا کہتا ہے جو نصف ایمان ہے اس سے مدد مانگو۔

jabir.abbas@yahoo.com

تو مسلمانو! اگر نصف ایمان سے مدد مانگی جاسکتی ہے تو کُل ایمان سے کیوں نہیں مانگی جاسکتی ہے اور اسے وسیلہ کیوں نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ صلوات
صبر کے ذریعہ مدد مانگو، نماز کے ذریعہ مدد مانگو، کیوں؟ فائدہ کیا ہوگا؟ اللہ
صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ پورے قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ اللہ ملوہ کھانے
والوں کے ساتھ ہے۔ اللہ فرسٹ کلاس کھاڑیوں میں چلنے والوں کے ساتھ ہے۔ اللہ
بہترین مخلوق میں رہنے والوں کے ساتھ ہے۔ نہیں اللہ صابرین کے ساتھ ہے۔ تو
اگر یہ طے ہو جائے کہ ہماری زندگی میں کوئی مصیبت ہی نہیں آئی تو ہم سب کچھ ہو سکتے
ہیں صابر نہیں ہو سکتے۔ اور اگر صابر نہیں ہو سکتے ہیں تو خدا ساتھ کیسے دے گا وہ تو
کہتا ہے کہ میں صابروں کے ساتھ ہوں۔ لہذا عزیزو! اگر خدا کو ساتھ لینا ہے تو مصیبتیں
کوٹالنے کی فکر نہ کرو، مصیبتوں کو برداشت کرنے کی دعا کرو۔ اس لئے کہ مصیبت ملتی ہی
تو صابر بن سکو گے۔ مصیبت آجائے اور برداشت کر لو تاکہ صابر بن جاؤ۔

یہی وجہ ہے کہ خدا جاننے ہمیشہ دعا کی ہے۔ پروردگار! ہم صبر کو تائید
دے۔ یعنی صبر کی فراوانی چاہیے۔ مصیبت کا طمانناہ نہیں چاہیے۔ کہ جن کی مصیبتیں مل گئیں
وہ صابر بن سکیں۔ جو دنیا کی ہر مصیبت سے ٹکرائے وہ سیدھا صابر بن کہلائے ہیں۔

صلوات

یہ ہمارے ایمان کی کمزوری ہے کہ دراز لڑ ہو اکہا آپ حضرت دعا فرمائیے
نزلہ چلا جائے۔ کیوں چلا جائے رہنے دیجئے مہمان آیا ہے۔ تھوڑی دیر تو رہے؛ ایک
آزمائش کا لمحہ آیا ہے کوئی تو امتحان دیجئے؛ ایک صبر کا وقت آیا ہے کچھ تو صبر کیجئے۔
مگر نہیں۔ اگرچہ ہمارے یہاں روایات میں ہے کہ جب بیماری آئے تو انسان کو چاہئے
کہ دو تین دن تک پہلے اس بیماری کو برداشت کرے۔ اس کے بعد اگر دیکھتا ہے
کہ قوت برداشت جواب دے رہی ہے اور ایمان خطرے میں ہے، تو ایمان کو
خطرے میں ڈالنے سے بہتر یہ ہے کہ دوا کھالے۔ مگر پہلے کچھ تو قوت برداشت کا مظاہرہ
کرے۔ ورنہ جو بقدر نزلہ بھی صابر نہیں ہو سکتا اس کے صبر پر ہی نزلہ گر سکتا ہے۔

صبر کا پہلا فائدہ ہے "إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ" خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے
یعنی صبر کرنا ہمارا کام ہے اور ساتھ دینا خدا کا کام ہے۔
میں ایک مقام پر یہ بات سمجھا رہا تھا تو ایک جوان کی سمجھ میں نہیں آیا اور کہنے لگا
کہ مولانا عجیب بات ہے، آپ کہتے ہیں آپ برداشت کر لیجئے خدا ساتھ دے گا۔ تو
ساتھ دے کے فائدہ کیا ہوگا۔ جب ہم نے مصیبت کو برداشت ہی کر لیا تو اب ساتھ
دینے کا کیا فائدہ ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ خدا ساتھ دے اور مصیبت ٹل جائے۔ درجہ
ہم صابرین ہی جائیں گے تو پھر ساتھ دینے کا فائدہ کیا ہوگا۔ گویا ہم ساتھ دینے کے ایک
ہی معنی چلتے ہیں کہ مصیبت ٹل جائے اور مصیبت ٹل جانے کی مصیبت یہ ہے کہ اس طرح انسان
صابر نہیں بن سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کو کیسے جمع کیا جائے۔ کوئی
ایسا منظر ہمارے سامنے چاہئے۔ جہاں بندے کا صبر بھی سامنے آجائے اور خدا کا ساتھ
بھی سامنے آجائے تاکہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ صبر کرنا کسے کہتے ہیں اور ساتھ دینا کسے کہتے ہیں۔
بس ایک منظر آپ کے سامنے گذارش کر رہا ہوں کہ بندہ مقام صبر میں آیا، وعدہ خدا پر
اعتبار کر کے خدا ساتھ دے گا اور بندہ نے صبر کا مظاہرہ شروع کیا کہ یہ ساتھی مارا گیا
صبر کیا۔ وہ جان نثار مارا گیا صبر کیا۔ یہ ناصرب کیا صبر کیا۔ وہ بیٹا گیا برداشت کیا۔ یہ بھائی مارا گیا
برداشت کیا۔ سب صبر ہی صبر ہو رہا ہے یہاں تک کہ گنگے پر خنجر چل گیا اور صبر کا پڑھنا
نے آواز دی کہ اب میرے ساتھ کو دیکھو میں کیسے ساتھ دیتا ہوں۔ ظالم کا ارادہ یہ تھا کہ
اسی سال کے نوڑھے سے لے کے چھ مہینہ کے بچے تک کا خاتمہ کر دیا جائے اور بندہ نے
صبر کیا تو اب میں بندہ کا ساتھ دوں گا اور اس طرح کہ چودہ صدیاں گزر جائیں مگر ظالم کا نام
نہ آنے پائے گا صرف مظلوم ہی زندہ رہ جائے گا۔

یعنی خردا رہ نہ کہنا کہ زندگی چلی گئی۔ ہماری راہ میں مرنے والوں کو مردہ نہ
کہنا، ان کی زندگی کہیں نہیں گئی، یہ سب زندہ ہیں، ان کی زندگی کو ہم نے دوام دیدیا
بقا دے دی۔ جو زندگی گئی وہ ستر سال، اسی سال پر ختم ہونے والی تھی اور یہ زندگی
قیامت تک رہنے والی ہے۔ صلوات

تو عزیران محرم! یہ صبر کا پہلا فائدہ ہے کہ خدا بندہ کا ساتھ دیتا ہے۔ اور خدا سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہے۔

دوسرا فائدہ صبر کا، خاصانِ خدا نے دعا کی: *يُكَفِّرُ عَنْكَ مَا صَبَرْتَ*۔ پروردگار! ہمیں صبر فرما اور ان عطا فرما۔ ہم پر صبر کو انڈیل دے۔ ہمیں بے پناہ صبر دے۔ *وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَنَا* اور ہمارے قدموں کو ثابت بنائے۔ یعنی اگر خدا صبر سے گا تو ثابت قدم بھی عنایت کرے گا۔

صبر کرنے والے ہی ثابت قدم رہتے ہیں۔ جن کے پاس صبر نہیں ہوتا ہے وہ ثابت قدم نہیں رہ سکتے ہیں۔

وہ بے صبر سے ہوتے ہیں جو میدان میں آکے چلے جاتے ہیں۔ لیکن جن کے پاس کمال صبر ہوتا ہے وہ آنے کے لائق نہیں بھی ہوتے ہیں تو باپ کے ہاتھوں پر آجاتے ہیں کہ جہاں ثابت قدم نہیں ہے وہاں صبر نہیں ہے۔

صبر کا تیسرا فائدہ وہ ہے جو آخرت میں نظر آتا ہے۔ دیکھئے آل محمدؑ نے روزہ کی نذر کی اور روزہ رکھے، یتیم و یتیم کو کھانا کھلایا، پانی سے افطار کیا پروردگار عالم نے ان کی اس قوت برداشت کی داد دی کہ جنت ان کی ہو گئی، حریر جنت ان کا ہو گیا اور آواز آئی: *جَزَاؤُكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ وَجَنَّةٌ وَحَرِيرٌ*۔ خدا نے جنت اور حریر جنت انھیں دے دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ انھوں نے صبر کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا حریر جنت کوئی الگ چیز ہے، اور اگر نہیں تو جب جنت دے دی تو اس کے اندر جتنی نہیں ہیں، جتنے پھل ہیں، جتنے میوے ہیں، جتنے باغات ہیں، جتنے قسم کے کپڑے ہیں سب ہی تو دے دے، اب پچا کیا کہ خدا کہتا ہے تم نے جنت بھی دی اور حریر جنت بھی دے دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ نگاہ پروردگار میں جنت کی الگ ایک قیمت ہے اور لباس جنت کی الگ ایک قیمت ہے۔ پروردگار نے دو نعمتیں دیں۔ جنت اور لباس جنت۔ اس کا مطلب اتنا تو واضح ہو گیا کہ مالک کی نگاہ میں جنت ایک نعمت ہے اور لباس جنت دوسری نعمت ہے اور جو صبر

کر لے گا اسے یہ بھی دیں گے اور وہ بھی دیں گے۔

پروردگار! صبر کرنے والوں کو تو ہم نے پہچان لیا کہ روزہ دکھا یتیم کو کھلایا۔ مسکین کو کھلایا۔ اسیر کو کھلایا۔ اب جنت کو دیکھئے کانتفاضا تو ہم نہیں کرتے کہ وہ وہاں جا کر دکھائی دے گی۔ لیکن اگر جنت نہیں دکھلا سنا تو کم سے کم لباس جنت ہی دکھلا دے۔ آواز آئی یہ بھی کسی اور گھر میں نہیں دکھائی دے گا صابرین ہی کے گھر میں دکھائی دے گا۔ جب عید کے دن چل جائیں تو دیکھ لیں کہ میں رضوان کو کس طرح درزی بنا کر بھیجتا ہوں۔ صلوات

اب ذرا اور آگے بڑھ جائیے صبر کا ثواب دیکھئے:

”*جَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا*“۔ یہ انبیاء سب ہمارے

ہی بنائے ہوئے نبی ہیں۔ ان میں سے کوئی نہ خود سے بنا ہے اور نہ تم نے کسی کو بنایا ہے۔ مگر ہم نے سب کو نبی بنایا ہے، امام نہیں بنایا ہے۔

دیکھئے امامت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک امامت ہے جس کا سلسلہ پیغمبر کے بعد شروع ہوا ہے۔ پیغمبر اسلام کی نیابت، وزارت اور خلافت جس کا نام رکھا گیا ہے ”امامت“۔

اور ایک امامت وہ ہے جو پروردگار نے انبیاء کو دی ہے جہاں انبیاء قوموں کی قیادت کر رہے تھے مگر یہ امامت اس دور میں بھی تھی جب انبیاء امام بنائے جا رہے تھے ہمارے انبیاء اس کے قابل نہیں تھے کہ سب کو امام بنا دیا جاتا۔ *يَجْعَلُنَا مِثْلَهُمْ* ان میں سے کچھ ہیں جن کو ہم نے امام بنا دیا ہے، *لَمَّا صَبَرُوا* اس لئے کہ انھوں نے صبر کیا تھا تو اب اندازہ ہوا کہ نبی ہو جانا آسان ہے مگر امام ہو جانا آسان نہیں ہے۔ پروردگار انبیاء میں سے بھی کسی کے صبر کو دیکھے بغیر امام نہیں بناتا ہے جس کی ایک مثال خدا نے بیان کر دی ہے۔

”*إِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ*“ جب خدا نے ابراہیمؑ کو آزمایا اور ابراہیمؑ امتحان میں کامیاب ہو گئے تو ہم نے کہا *إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا*۔

اسے ابراہیم! ہم تم کو امام بنارہے ہیں۔ یہ نتیجہ صبر کرنے کا۔ یعنی ابراہیم نبی تھے امام نہیں تھے۔ رسول تھے امام نہیں تھے۔ خلیل تھے امام نہیں تھے صاحبین تھے امام نہیں تھے۔ ان سب کے بعد جب صبر کا مظاہرہ کیا تب خدا نے امام بنادیا۔ ہم نے اگر یہ کہہ دیا کہ امام کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے تو کہنے لگے غضب ہو گیا دیکھئے نبی سے بڑھا دیا۔ حالانکہ ہم نے نہیں خدا نے خود ہی نبوت سے بڑھاکے دکھا ہے۔ رسالت سے بڑھاکے دکھا ہے۔ خلافت سے بڑھاکے دکھا ہے۔ صحیفوں سے بڑھاکے دکھا ہے اور جب خدا نے خود ہی اتنا بڑھا دیا ہے تو ہمیں آپ کو بڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں امامت کو بڑھانا نہیں ہے ہمیں امام کو ڈھونڈنا ہے۔ جب خدا کسی کو بڑھا دے گا تو ہم سمجھ لیں گے کہ یہ خود ہی بڑھا ہوا ہے۔ صلوات بڑھانے کا کیا کام ہے جس کو بڑھایا جائے گا وہ اتنی دیر رہے گا جس کو ہم آپ مل کے آگے بڑھائیں گے وہ کتنی دیر بڑھے گا۔ قرآن مجید کی ایک تعبیر ہے جہاں پروردگار عالم نے منافقوں کی مثال دی ہے کہ یہ منافقین کا ٹھکانہ خشک مسندہ جیسے سوکھی لکڑی دیوار سے لگا کے کھڑی کر دی جائے۔

لکڑی کی دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک لکڑی وہ ہے جو زمین میں گاڑ دی جائے جو پائیدار ہے۔ چاہے دیواریں رہیں یا گر جائیں یہ رہے گی۔ اور ایک لکڑی وہ ہے جو دیوار سے لگا کے کھڑی کر دی جائے کہ جسے ہی دیوار گری لکڑی بھی گر گئی۔

تو جو ایمان ثابت تھے وہ سب ثابت رہ گئے۔ اور جو کسی سہارے سے قائم تھے جیسے ہی سہارا ہٹا سب گر گئے۔ صلوات تو میں یہ گزارش کر رہا تھا کہ پروردگار عالم نے فرمایا کہ ہم نے ان انبیاء میں سے کچھ کو امام بھی بنا دیا ہے۔ لیکن یہ امامت کب دی ہے جب انھوں نے صبر کا مظاہرہ کیا۔ ان کے کلمات کے بعد بھی منصب امامت کے لئے کمال صبر درکار ہے اس کے

بغیر پروردگار عالم کسی کو امام نہیں بناتا ہے۔ کسی کو قوم کا قائد نہیں بناتا ہے۔ جب خدا بنائے گا تو کمال صبر کو دیکھنے کے بعد ہی بنائے گا۔ یہاں تک آنے کے بعد اب دو لفظوں میں ایک مختصر تاریخ صبر سن لیجئے اور صبر امام حسین کو پہچان لیجئے۔ عنوان اور سرخی بیان کرنا میرا کام ہے، منطبق کرنا آپ کا کام ہے۔

پروردگار عالم نے صابرین کی ایک فہرست بیان کی ہے جن کا ذکر خود قرآن مجید میں کیا ہے کہ یہ ہمارے صابر بندے تھے۔

جناب ایوبؑ۔ اللہ کہتا ہے ہم نے ایوبؑ کو صابر پایا ہے۔ بہترین بندہ ایوبؑ ہے۔ تو اللہ نے جناب ایوبؑ کو صابر ہونے کی سند دی ہے۔ صبر ایوبؑ تو سنا ہوا ہے آپ کا مثل مشہور ہے:

"کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوبؑ لے ساقی"

جناب ایوبؑ کی زندگی میں جب مسئلہ ناموس سامنے آگیا، تو جناب ایوبؑ ٹھہر گئے اب قدم آگے نہیں بڑھتے تو جس کو خدا نے صابر قرار دیا ہے اس کے صبر کی صحیحی بتا دی ہے۔

ایک منزل ہے کہ جہاں صبر ایوبؑ رکا ہوا ہے۔

دوسری منزل صبر۔ جناب ابراہیمؑ فرماتے ہیں،

بیٹا! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تمھیں ذبح کر رہا ہوں۔ بتاؤ تمھاری برائے کیا ہے؟

کہا۔ بابا! جو خدا نے کہا ہے وہ آپ کریں۔ انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

وہ صبر ایوبؑ تھا جو ناموس کے مرحلہ پر ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ صبر ساعیل ہے جہاں کہتے ہیں۔ بابا، میں صبر کروں گا۔ مگر کیسے؟ باپ بیٹے کو منزل تسلیم میں لے آیا اور دونوں نے اپنے کو خدا کے حوالے کر دیا۔ لیکن جب ذبح کرنے کا وقت آیا تو قرآن کہتا ہے قلہ

لَجِبِينَ ابراہیم نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔

دیکھئے عام طور سے ذبح کرنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جو جانور بھی ذبح کیا جاتا ہے اسے سیدھے سیدھے لٹا کر گٹھے پر چھری پھیر دی جاتی ہے۔ مگر جب جناب ابراہیمؑ اور جناب اسماعیلؑ کا واقعہ قرآن مجید نے بیان کیا تو کہا کہ ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ کو لٹا یا مگر پیشانی کے بل لٹا یا۔ کیوں؟۔ مفسرین نے اس کی توجیہ کی ہے کہ شاید اسماعیلؑ نے کہا بابا! آپ مجھے سیدھا لٹا کے ذبح نہ کریں۔ اس لئے کہ آپ باپ ہیں، میں بیٹا ہوں اور باپ کے دل میں بیٹے کی بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ اگر میرا آپ کا سامنا ہے گا تو کہیں آپ کی قوت صبر جواب نہ دے جائے، لہذا آپ مجھے منہ کے بل لٹا دیجئے تاکہ آپ اطمینان سے چھری چلا سکیں اور میں اطمینان سے گلا کٹا سکوں۔ ابراہیمؑ نے لٹا دیا اور گٹھے پر چھری دکھادی۔ تو پروردگار نے آواز دی وَنَاصَتْ السَّوْدُیَا ابراہیمؑ! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ یہی تو خواب دیکھا تھا کہ میں ذبح کر رہا ہوں۔ تو تم نے چھری چلا دی۔ ذبح کرنے کا کام ہو گیا۔ اب ذبح ہو جانا شرط نہیں ہے۔ اب ہم ہر دوک رہے ہیں کہ ہم نیک عمل کرنے والوں کو یہ بھی جزا دیتے ہیں۔ مالک نے ابراہیمؑ کا ہاتھ پکڑ لیا تو صبر اسماعیلؑ بھی چھری چلنے پر روک گیا اور گلا نہیں کٹنے پایا۔

تو عز و اوجب قرآن کے دونوں صابروں کو پہچان لیا تو بتاؤ کہ اس صابر کو کیا کہا جائے جو گلا کٹنے کو بھی برداشت کرے اور ناموس کی معصیت کو بھی برداشت کرے۔ اس مقام پر تو اگر کہنا پڑے گا کہ جہاں سارے انبیاء کا صبر نہ پہنچ سکا وہاں صرف صبر حسینؑ ابن علیؑ تھا۔ اور یہ حالی دعویٰ نہیں ہے اس کا قرآنی ثبوت ہے اور ثبوت کے لئے میں ایک نئی بات عرض کرنا چاہتا ہوں اسے نگاہ میں رکھئے گا۔

اسماعیلؑ بچ گئے۔ پروردگار عالم نے اپنے حکم کو منسوخ کر دیا اور کہا بس ابراہیمؑ اتنا ہی کافی ہے، اب مزید بیٹے کا گلا کاٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اب جو ابراہیمؑ نے آنکھوں سے پٹی کھولی اور دیکھا اسماعیلؑ زندہ ہیں تو رنجیدہ ہو گئے۔ خدا یا! میں نے بچانے کے واسطے نہیں لٹا یا تھا، میں نے قربانی کے واسطے لٹا یا

تھا۔ شاید میری قربانی میری بارگاہ میں مکمل نہ ہو سکی۔ حالانکہ اگر یہ قربانی مکمل ہو جاتی تو مجھے جزد و آب زیادہ ملتا۔

پروردگار نے کہا کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے اس کے بدلے میں ایک بڑی قربانی رکھ دی ہے۔ اگر صبر ہی کرنا ہے تو اسماعیلؑ کی قربانی پر نہیں۔ جو بڑی قربانی نہیں ہونے والی ہے اس پر صبر کرنا۔ تو قربانی حسینؑ ہے بڑی قربانی۔ اور قربانی اسماعیلؑ ہے اس کے مقابلے میں ابتدائی قربانی۔ وہ پہلا مرحلہ تھا جو نامکمل رہ گیا اور یہ آخری مرحلہ ہے جو مکمل ہو گیا ہے تو چونکہ قربانی حسینؑ کو بڑا بنا نا تھا لہذا قربانی اسماعیلؑ میں کوئی بات الٹی نہ رہ جائے جو قربانی حسینؑ میں نہ ہو۔ یعنی جتنی باتیں یہاں ہیں وہ سب قربانی حسینؑ میں ہونی چاہئیں اور کچھ زیادہ بھی ہونا چاہیے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ ابتداء کی قربانی ہے اور وہ بڑی مکمل قربانی ہے۔

اگر یہ نکتہ آپ کے ذہن میں ہے تو آئیے دیکھئے قربانی اسماعیلؑ میں اسماعیلؑ کو پیشانی کے بل لٹا یا گیا۔ یعنی قربانی ابتدائی منزل میں تھی۔ تو کسی دوسرے نے لٹا یا۔ لیکن جب آخری مرحلہ آئے گا تو کسی دوسرے کی ضرورت نہ ہوگی۔ میں سوچ رہا تھا کہ حسینؑ نے قربانی کے لئے سجدہ کا انتخاب کیوں کیا۔ گویا حسینؑ آواز دے رہے تھے کہ خود سجدہ کروں گا اور میں خود پیشانی کو خاک پر رکھ کر راہ خدا میں سرفراں کروں گا۔ اب صبر کا آخری نتیجہ۔ اُولَئِکَ عَلَیْہِمْ صَلَواتٌ مِّن رَّبِّہِمْ وَرَحْمَۃٌ جو صبر کرنے والے ہیں ان کے لئے پروردگار کی طرف سے صلوات بھی ہے اور رحمت بھی ہے۔

پروردگار انہیں تین طرح کے انعامات سے نواز رہا ہے۔ صلوات، رحمت اور ہدایت۔ وہ ہدایت یافتہ بھی ہیں اور قابلِ رحمت بھی ہیں اور تحفا صلوات بھی ہیں۔

تو جہر کی آپ نے؟ اگر انبیاء کرام صلوات کے قابل ہیں تو جس کا صبر انبیاء کرام سے بڑھ جائے۔ رحمت قابل صلوات نہ ہوگا۔

ہم سے پوچھتے ہیں کہ حسین کو علیہ الصلوٰۃ والسلام کیوں کہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ ہم نہیں کہتے ہیں پروردگار کہتا ہے کہ جو صبر کرنے والے ہیں ان کے لئے صلوات ہے۔ تو یا حسین جیسے صاحبِ صلوات پر صوبہ یا قرآن کا انکار کر دو۔ ورنہ اگر قرآن پر ایمان رہے گا تو جو ابرہہ صابر ہوگا اسے صلوات کے قابل کہنا ہوگا۔ رحمت کے لائق ماننا ہوگا۔ ہدایت یافتہ تسلیم کرنا ہوگا۔ صلوات

بس عزیزی محترم! میں بیان کو آخری منزل تک لے آیا۔

ایک وہ باپ ہوتا ہے جو بیٹے کی قربانی پر یوں صبر کرتا ہے کہ بیٹا منزلِ ذبح میں آگیا اور پھر زندہ رہ گیا۔ اور ایک وہ باپ ہوتا ہے جو منزلِ صبر میں یوں قدم رکھتا ہے کہ آواز دیتا ہے بھئی نفذ تم بیٹا چاہئے والے کام آچکے۔ میرے لال اصرار بے انصار مارے گئے۔ اب بی بی ہاشم کی قربانی کا مرحلہ ہے۔ میرے لال اب تم جاؤ کہ تمھارے میدان میں جلتے ہیں میرا جذبہ صبر بھی ہے اور تمھارا جذبہ قربانی بھی ہے اور پھر دشمن کے سامنے اتمامِ حجت بھی ہے کہ تم سے زیادہ پیغمبر سے مشابہ کوئی نہیں ہے بیٹا تم جاؤ۔ علی اکبر کب سے منتظر کھڑے ہوئے ہیں کہ بابا اجازت دیں اور میں مرنے کے لئے میدان میں جاؤں۔

علی اکبر تیار ہوئے میدان میں جلتے کے لئے۔ کون جلتے کہ باپ کے دل کا کیا عالم ہے۔ عزیزو! آج کی اس مجلس کے امتیازات میں سے یہ ہے کہ امیرِ ائمہ ہزار ہا ہزار سامعین میں اگر آپ حساب لگائیں تو اس پوسے مجمع میں بڑھے افراد تو شاید انگلیوں پر گنے جلتے کے قابل ہوں گے۔ اسٹی فیصد مجمع تو جواؤں کا ہے۔ یہ تو قدر جوائی جانتے ہیں۔ یہ تو جوائی کے حوصلے جلتے ہیں۔ یہ جوائی کی انگلیں جانتے ہیں۔ یہ بچا میں کہ وہ کڑیل جواں کیسا تھا۔ جو مادہ خدا میں اپنی جوائی قربان کر رہا تھا۔

حسین نے کڑیل جواں کو میدانِ جنگ کے لئے آمادہ دیکھا تو فرمایا بیٹا! تم میدان میں جانے کے لئے تیار ہو گئے، پہلے جا کے پھوپھی سے رخصت ہو کے آؤ۔ علی اکبر چلے آئے۔ خیمہ میں آئے اور آگے ایک منظر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

اجازت دیدیجئے۔

فرمایا، میرے پاس کیوں آئے ہو۔ بالاتواغصوں نے ہے۔ زحمتیں تو انھوں نے برداشت کی ہیں۔ مشقتیں تو انھوں نے برداشت کی ہیں۔ ان کے پاس جاؤ۔

علی اکبر آدھر مڑ گئے۔ پھوپھی اماں! اب مرنے کی اجازت دیدیجئے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ میرا بابا مصائب میں گھرا ہوا ہے۔

ثنائی زہرا نے بیٹے کو سرسے پر تنک دیکھا۔ علی اکبر! کیا میں نے اسی دن کے واسطے تم کو بلا تھا کہ تم مجھ سے مرنے کی رضائے لئے آؤ گے؟

کہا پھوپھی اماں اگر آپ اجازت نہ دیں گی تو میں نہ جاؤں گا۔ لیکن ایک بات آپ بتادیجئے کہ اگر محشر میں دادی نے پوچھا کہ علی اکبر کی زندگی زیادہ عزیز تھی یا میرا حسین، تو میں تو کچھ نہ کہوں گا دادی کو آپ ہی جواب دیدیجئے گا۔

بس یہ سننا تھا کہ ثنائی زہرا نے فرمایا۔ جاؤ میرے لال جاؤ۔ جاؤ بیٹا جاؤ۔

پھوپھی نے اجازت دے دی۔ ہر منظر نے رخصت کر دیا۔ اب علی اکبر چلنا چاہتے ہیں مگر جیسے ہی خیمہ سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ ایک مرتبہ بیسیاں آگے بڑھیں۔ علی اکبر! ایک لمحے کے لئے ٹھہر جاؤ ہم قطار بنالیں تم ہمارے درمیان سے گزر جاؤ تاکہ ہم سب تمہیں الوداع کہہ دیں۔

علی اکبر درمیان میں آئے، سیدائیں نے حلقہ بنا یا۔ ایک مرتبہ بیسیوں نے کہا علی اکبر! جلتے تو ہو مگر ہماری غربت کا خیال رکھنا۔ ہماری کیسی کا خیال رکھنا۔

علی اکبر نے آواز دی بیسیو! تمہیں اپنی غربت کا خیال ہے اور میرے بابا کی غربت کا خیال نہیں ہے۔

ہر طرف سے آواز آئی۔ الوداع۔ الوداع۔ جاؤ اکبر جاؤ۔

سنو سنو اولاد والو! اکبر آگے بڑھے۔ خیمہ کے دروازہ کے قریب پردہ اٹھایا۔ جیسے ہی نکلے گا ارادہ کیا کسی نے دامن پکڑ لیا۔ اکبر کہاں جا رہے ہو؟ پلٹ آئے، دامن چھڑا یا، پھر خیمے کا پردہ اٹھایا۔ نکلنا چاہا پھر کسی نے دامن تھام لیا۔ بائیں

وقت کس کی زندگی میں آیا ہوگا۔ کون اس مصیبت کو پہچانے گا۔ مگر میرے عزیزو! ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے روایت میں بہت دیکھا مگر کوئی نام نہ ملا کہ کون ہے جو علی اکبر کو بار بار روک لیتا ہے۔ مگر میرا ایک اندازہ ہے کہ اگر کسی منظر نے روکا ہوتا تو بازو ٹھما ہوتا۔ یہ دامن ہکا کو کون کھینچ رہا ہے۔ عجیب نہیں کہ چھوٹی بہن یہ کہہ رہی ہو جیسا۔ بیٹا علی اکبر کہاں جا رہے ہو۔

خیمہ کا پردہ اٹھا۔ علی اکبر باپ کے سامنے آئے۔ حسین نے سہا یا، کمرے تلوار لٹائی۔ بازو تھام کے گھوڑے پر بٹھایا۔ اسے میرے لال جاؤ، مگر جب تک سامنا ہے مڑ مڑ کے دیکھتے رہنا۔

بس آخری مرحلہ۔ اکبر چلے تھوڑی دور۔ پڑھے تھے کہ آہٹ محسوس کی۔ اب جو مڑ کے دیکھا تو کیا دیکھا کہ ضعیف باپ کھٹکے چلا کر رہا ہے۔

باا، آپ نے تو رخصت کر دیا تھا، اب آپ کیوں اسے ہیں؟
فرمایا، بیٹا اگر تم صاحب اولاد ہوتے تو تمہیں اندازہ ہوتا کہ جو ان بیٹے کو رخصت کرنے کے بعد باپ کے دل کا کیا عالم ہوتا ہے۔

جاؤ اچھا جاؤ بیٹا۔

علی اکبر میدان میں آئے۔ جہاد کا ایک مرحلہ تمام ہوا۔ ماں کی دعا مستجاب ہوئی۔ پلٹ کر درخیمہ پر آئے۔

بابا پیاس مارے ڈال رہی ہے۔

حسین نے کہا بیٹا اپنی زبان میرے دہن میں دے دو۔

علی اکبر نے زبان دہن میں رکھی اور کھینچ لی۔

کہا اے بیٹا یہ کیا؟

کہا بابا! آپ کی زبان میں تو کانٹے پڑے ہوئے ہیں۔

حسین نے کہا اچھا بیٹا اب جاؤ۔ اب تمہیں ساتھی کوڑیاب کریں گے۔

بس آخری مرحلہ، دو منٹ اور مجلس تمام ہو رہی ہے۔ اسے جاؤت علی اکبر!

اٹھانے والو! حسین کا کرپل جوان معروف جہاد ہے۔ جب زخموں سے چور ہو سکے گرنے لگا تو باپ کو زحمت نہیں دی۔ آواز دی بابا میرا آخری سلام لے لو۔

حسین بیٹے کی آواز سن کے چلے۔ آواز دیتے جا رہے ہیں بابا علی۔ گرتے پڑتے کرپل جوان کے سرھانے پہنچے۔ سر اٹھا کے زانو پر رکھا۔ دیکھا جوان بیٹے کا سارا جسم تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ چاہتے ہیں کہ خیمہ میں لیجائیں مگر اب جو اٹھانے کا ارادہ کیا تو طاقت نے جواب دے دیا۔ آواز دی بی بی ہاشم کے بچو، آؤ مجھے ہمارا دو۔ خیمے سے اور تو کوئی نہ آیا۔ البتہ چادر بٹھالے ہوئے بہن آگئی۔ بیٹیاں آگئی۔ حسین نے کہا زینب! تم کیوں آگئیں؟ کہا بھتیجا! میں پالنے والی ہوں، گودی میں اٹھاؤں گی۔

حسین نے کہا زینب! پلٹ جاؤ ابھی میں زندہ ہوں۔ میرے بعد خیمے چلیں گے، چادریں چھینیں گی اور تمہیں بے شمع و چادر خیمہ سے نکلتا ہوگا۔

وَاعْلَمِ الْكِبَرُ، وَاعْلَمِ الْكِبَرُ
إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ

تحفہ رضویہ

گیارہویں مجلس عبادت امام حسین علیہ السلام

”حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ اس سے محبت کرے جو میرے حسینؑ سے محبت کرے۔“

سرکارِ دو عالمؐ کے اس ارشادِ گرامی کی روشنی میں عرفانِ حسینؑ سے متعلق جو سلسلہ کلام آغازِ محرم سے آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔ اس کے آخری مرحلہ پر کچھ باتیں آج کی رات کی مناسبت سے عبادتِ سید الشہداء کے بارے میں گزارش کرنا ہیں۔ یہ رات درحقیقت عبادت کی رات ہے۔ امام حسینؑ نے عصر عاشوراء میں سعد کی طرف سے حملے کا حکم دے جانے کے بعد اپنے عزیز بھائی علیداؤدؑ کو بلا سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا تھا:

”عباس! تم سوار ہو کر فوجِ یزید کی طرف جاؤ اور جا کر دریافت کرو یہ یزیدیں چاہتی کیا ہیں؟ ان کا ارادہ کیا ہے؟“

علیداؤدؑ کو بلا مولا کا حکم پانے کے بعد میں سواروں کو لے کر ابنِ سعد کے پاس آئے اور پوچھا تیرا ارادہ کیا ہے؟ تو چاہتا کیا ہے؟

اس نے کہا ہاشمی جوانو! امیر ابنِ زیاد کا حکم ہے جو شمرؑ کے آئیے کہ اب حسینؑ کے کسی طرح کے صلح کی گفتگو نہیں کرنا ہے بلکہ ان کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا بھی انہی کا بیعت، یزید کریں اور یا حملہ کر دیا جائے اور ان کا سر کاٹ کر حاکمِ وقت کے

علامہ سید فیضانِ حیدر جوادؑی اعلیٰ اللہ مقامہ

عصمہ پبلیکیشنز

بنی۔ او بکس نمبر۔ 18168 کراچی 74700 پاکستان

jabir.abbas@yahoo.com

رمانے بھیج دیا جائے۔

علمدار کر لائے ساری گفتگو سنی اور بلٹ کر امام حسینؑ کی خدمت میں آئے اور کہا مولانا ملوں کا یہ کہنا ہے کہ اگر حسینؑ بیعت نہیں کرتے ہیں تو جنگ اسی وقت ہوگی۔ امام حسینؑ نے فرمایا عباسؑ جاؤ اور اپنی محنت تمام کرو اور تمام محنت کے لئے ان کو سمجھاؤ کہ اگر تم گمنام ہو تو اس جنگ کو ایک رات اور دو گئے بٹھا دیا جائے اس لئے کہ ہم اس رات کو عبادت الہی میں گزارنا چاہتے ہیں اور دشمن یہ جانتا ہے کہ ہمیں عبادت الہی سے کتنی محبت ہے۔ اس رات کو ہم تم کاموں میں گزارنا چاہتے ہیں۔ نصیحت کرتا اپنے پروردگار کے لئے نماز بٹھانا چاہتے ہیں۔ مالک کی بارگاہ میں دعا کرنا چاہتے ہیں اور اس رات کو استغفار میں گزارنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ ساری دنیا یہ جانتی ہے کہ حسینؑ کو عبادت الہی سے کتنی محبت ہے۔

عبداللہ نے اگر پیغام پہنچایا۔ ابن سعد کو ساری پریشانی یہ ہے کہ دشمن اس کے ہاتھوں سے فوج کی کمان لینا چاہتا ہے اور اسی نے ابن زیاد کو بھیخہر پہنچایا ہے کہ ابن سعد حسین سے صلح و مصالحت کی گفتگو کر رہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ آپ کے انکشاف پر عمل کرنے والا نہیں ہے اور یہ سمجھنے کے بعد ابن زیاد سے نیا فرمان لے کر مشر مشر و محرم کو کہلائی دوبارہ وارد ہوا ہے۔ اب ابن سعد کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ کیا وہ جنگ چھڑے اور ابھی حملہ کرے یا فوج کی کمان شمر کے حوالہ کرے۔

ابن سعد فوج کی قیادت چھوڑنا بھی نہیں چاہتا ہے اور حالات ایسے ہیں کہ جنگ چھیننا بھی نہیں چاہتا ہے۔ لہذا اس پیغام کو سننے کے بعد اس نے فوج کی طرف دیکھا اور کہا حسینؑ ایک رات کی ہلکت چاہتے ہیں عبادت الہی کے لئے، کیا خیال ہے؟ فوج نے یہ چاہتا ہے کہ اس مسئلہ کا کردار اس فوج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لوں اور خیام حسینؑ پر حملہ کر دوں، اس لئے اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف یہ کہا کہ آپ رئیس ہیں۔ آپ امیر ہیں۔ آپ فوج کے سربراہ ہیں۔ آپ ذمہ دار ہیں۔ یہ فیصلہ آپ کریں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟ منظر ہے ابن سعد کے جواب کا۔ ابھی گنگوٹو شہر

اور ابن سعد میں ہوری تھی کہ فوج کے دوسرے افسروں بڑے، یہ تو ابن نبیہؓ کی ہے۔ جینؓ تو فرزندِ فاطمہؓ ہیں۔ اگر ہمارے مقابلے میں ترک و دہلیز کے غلام ہوتے تو وہ وہی ہم سے کہتے کہ عبادت کے لئے پہلے چلتے ہیں تو ہم بھی منہ نہ کرتے۔ کس قدر شرم کی بات ہے۔ اللہ کا بندہ اپنے خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہے اور ہم اس کے غیموں پر حملہ کر دیں یہ شرافت کے خلاف ہے، یہ انسانیت کے خلاف ہے۔

ابن سنیو کو سہارا مل گیا، اُس نے کہا ہاں تم لوگ ٹھیک کہتے ہو۔ ایک رات کی مہلت بے دری جائے۔ شہر نے پھر پھسپھسایا ایسا تو نہیں ہے کہ حسین رات بھر نہ کوئی نئی تیاری کر لیں اور صبح کو لڑنا مشکل ہو جائے۔ شاہد ابن مسعود کے سامنے شہر کی اس حالت کا بھی ایک جواب تھا جو فرزند رسولؐ نے شب عاشورا اعلان کیا تھا۔ جو جانا چاہتا ہو وہ چلا جائے۔ ہم نے مہلت دو جن کو اٹھا کرنے کے واسطے نہیں لی ہے۔ ہم نے مہلت صرف عبادت الہی کے لئے لی ہے کہ زندگی کی آخری رات بھی عبادت الہی میں گزر جائے حسینؑ کی ساری زندگی عبادت الہی میں گزری ہے۔

عزیز و اہل رات عبادت کی رات ہے۔ اس رات کو اصحابِ حین نے اس حالت میں گزارا ہے کہ موٹخ کر بلا ہوتا ہے کھنہ کو کھنہ کی گدوئی اٹھل۔ خیامِ حینی سے تسبیح و تہلیل و ذکر خدا و عبادت و تلاوت قرآن کی آوازیں ایسے بلند ہوتی ہیں جیسے شہد کی مکھی کے چھتے سے آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ فوجِ دشمن میں جنگ کی تیاری اور خیامِ حینی میں عبادتِ الہی۔ یہی فرق ہے اُن افراد کے درمیان جو دنیا داری کے لئے لڑا کرتے ہیں اور اُن کے درمیان جو دین کی بقا کے لئے جہاد کا کرتے ہیں۔

یہ اس موضوع کی بنیاد ہے جس کے بارے میں چند جملے مجھے گذارش کرنا ہیں۔ دوسری بات اس سے زیادہ تفصیل کی محتاج نہیں ہے اور ایک بات بطور یاد دہانی اگرچہ آپ حضرات کو معلوم ہے۔ اور مسلسل روزانہ اسے اعلان ہو رہا ہے لیکن ہر حال کچھ ضروریات ایسی بھی ہیں اس لئے یہ دو لفظیں گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس ملک میں رہتے ہیں اور ایک عرصہ سے رہتے ہیں۔ اس معنی میں وہ بھی جو اس سال آئے

ہیں، اوزوہ بھی ہیں جو اشار اللہ دس میں سال سے یا اس سے زیادہ زمانے سے اس ملک میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جتنا تعاون عوامی کو اس ملک میں حاصل ہے، کم سے کم اس پاس جہاں تک نظر جاتی ہے کہ اتنا تعاون ہمیں نظر نہیں آتا ہے۔ مومنین کی بیٹیوں کا ذکر نہیں ہے۔ اتنا تعاون کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اس ملک میں کوئی سرکاری اجتماع بھی ملگ پر نہیں ہوتا ہے چہ جائیکہ مجلس عزا۔ تو اگر حکومت ہمارے ساتھ اتنا تعاون کرتی ہے، ہمارے واسطے اتنے اسباب فراہم کرتی ہے، ہمارے واسطے اتنی رحمتیں برداشت کرتی ہے ایک فریض عزا کے لئے، تو اس فریض عزا کی بقا کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی آپ کو بھی دینا ہوگی۔ ظاہر ہے کہ کوئی اسلامی حکومت کوئی ایسی بات کسی سے نہیں کہہ سکتی ہے جو اس کے مذہب کی بنیادوں کے خلاف ہو یا اس کے واجبات کے خلاف ہو۔ نہ کوئی کہنے والا ہے، نہ کوئی اس کا منہ والا ہے۔ ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان، مسلمان سے مطالبہ کرے کہ توجید خدا چھوڑ دو۔ ایسا کہنے والا کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا ہے، نہ حاکم نہ عوام۔ لیکن وہ باتیں جو فرائض میں شامل نہیں ہیں، صرف ہمارے جذبات کے اظہار کے لئے ہیں تو اگر حالات سازگار ہوتے ہیں تو جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے، اور اگر حالات اجازت نہیں دیتے ہیں تو جذبات کو روکا جاتا ہے اس فریض عزا کی بقا کے لئے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمارے جذبات کہیں چلے گئے ہیں، نہیں، بلکہ ہمارے جذبات جیسے تھے ویسے ہی ہیں، اور جب بھی وقت آئے گا تو راہ خدا جس کو بلا دلوں کے نام پر جان دینے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اگر ابھی جان دینے کا وقت نہیں آیا ہے تو ہماری مالی قربانی بھی جین کی بارگاہ میں برکت رکھتی ہے۔ ابھی جین ہم سے جان کا مطالبہ نہیں کر رہے ہیں، ابھی مذہب ہم سے ٹکرائے کا تقاضا نہیں کر رہا ہے۔ ابھی ہمارے فرائض میں خون بہانا شامل نہیں ہے۔ ابھی ہمارے فرائض میں فریض عزا کا قیام ہے۔ جان دینے کے بجائے مال خرچ کیجئے۔ جیب میں ہاتھ ڈالئے، پیسے نکالئے تاکہ یہ فریض عزا جیسے قائم ہے ویسے ہی قائم رہے اور اس سے بہتر طریقہ سے قائم رہے۔ آپ یقین کریں کہ آپ کی برادری کے

مومنین بھی آپ کے جذبہ پر غبطہ کرتے ہیں۔ جو مومنین کرام ہیں، جو خود عزادار سید الشہداء ہیں، وہ بھی اس کو دیکھ کے تعجب کرتے ہیں کہ اتنے مومنین ماشار اللہ ایک مقام پر جمع ہو جاتے ہیں فرزند فاطمہ کا غم منانے کے لئے۔

میرا تعلق چوتھے ہر حال ہر برادری سے رہتا ہے لہذا میں جانتا ہوں۔ اور آپ کے لئے یہ ایک بہترین خبر ہے جو میں آپ کو سن رہا ہوں۔ جتنی قویں ہیں۔ یہاں جتنی برادریاں ہیں۔ جتنی قسم کی زبانیں بولنے والے ہیں، جن سے میرا کوئی بھی تعلق ہے، ہر آدمی نے اتفاقاً کلہ ایک ہی بات کہی ہے کہ عزائے سید الشہداء کی رونق اور عزائے حسین کا واقعی قیام اگر ہے اس ملک میں، تو آپ کی برادری کے دم سے ہے کہ جن کو دیکھ کے دنیا کی ہر قوم پہچان رہی ہے کہ یہ ہیں حسین کے عزا دار۔ ورنہ سب تو بند کروں میں ذکر حسین کرنے والے ہیں، سب تو بند مکانات میں حسین کا ذکر کرنے والے ہیں۔ تو عزیزو! اگر ہماری اس عزاداری ہی سے رونق عزا ہے۔ یہی ہماری دنیا کی عزت بھی ہے اور یہی ہماری آخرت کی عزت بھی ہے۔ تو کوئی ایسا کام نہ ہونے پائے جس سے اس فریض عزا پر حرف آجائے۔ ایسے جذبہ کی کوئی قیمت نہیں ہے جو فاطمہ کی بارگاہ میں جواب دہ بنا دے۔ لہذا ہر اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے جس سے خدا نہ کر دے اس فریض کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھئے گا۔

آج آپ کے پاس ایک چھوٹی سی جگہ ہے، ایک چھوٹی سی عمارت ہے جو عزا خانہ کے نام پر ہے۔ اگر خدا نہ کر دے یہ عزا خانہ بھی باقی نہ رہ گیا، یہ جسک بھی باقی نہ رہ گئی تو پھر آپ کو اس جگہ پر کون فریض پھانے دے گا۔ لہذا ہماری پہلی ذمہ داری ہے کہ ایک لاکھ چالیس ہزار روپے کیلئے اگر دو چار لاکھ بھی دینا پڑے تو ہم اتنا خرچ کریں گے۔ اپنے اوپر جبر کریں گے، زحمت برداشت کریں گے اور بہر حال اس فریض عزا کے قیام کا انتظام کریں گے۔ اگر آپ کو تھوڑی تکلیف پہنچ جائے، کچھ اپنے اخراجات کو روکنا پڑے، اپنے گھرانے کو کم کرنا پڑے

اپنے بچوں کے آرام کا انتظام نہ کر سکیں۔ نہ کچھے، فرش عزا کو قائم کیجئے، عرا حسیں کو قائم کیجئے۔ بچوں کو بہلا لینا بہت آسان ہے، گھر والوں کو سمجھا لینا بہت آسان ہے، فاطمہ زہرا کو جواب دینا آسان نہیں ہے۔

مرکز حسی کے خادین (دانشیروز) آپ کے سامنے آ رہے ہیں۔ یہ شب عاشور ہے اس کے کارخیز کی عظمت الگ ہے۔ جیسے نازوں کے لئے شب قدر، نمازوں کے لئے شب عاشور ہے۔ جیسے ہی حینیت کی خدمت کے لئے شب عاشور ہے۔ اور یہ بات بھی میں اپنے عزیز سامعین کے سامنے، اپنے جوانوں، بچوں اور لڑکوں کے سامنے کہنا چاہتا ہوں کہ الحمد للہ آپ کے جذبہ کی بنا پر۔ آپ کے تعاون کی بنا پر یہ جو آپ نے چھوٹا یا بڑا تعاون کیا ہے۔ سودو ہم دے ہیں یا پچاس درہم دے ہیں یا دس درہم دے ہیں یا دو سودو ہم دے ہیں یا پانچ سودو ہم دے ہیں جو کچھ بھی آپ نے دیا ہے۔ ہم دو سال سے اس منزل سے گزر رہے ہیں بلکہ زیادہ ہو گئے جب پہلی مرتبہ مرکز کرایہ پر لیا گیا تھا تو جس نے سنا کہ ایک لاکھ چالیس ہزار درہم کیا ہے تو جو میرے لئے والے صاحبان حشیت تھے، صاحبان شخصیت تھے انھوں نے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ اتنا سرمایہ ایک لاکھ چالیس ہزار درہم آپ کہاں سے فراہم کریں گے؟ مجالس کا خرچ الگ۔ دیگر انتظامات الگ۔ اور دوسرے کام الگ۔ تبرکات الگ اور بھی جتنے کام ہوتے ہیں وہ سب الگ۔ آپ کے لئے تو وہی بہت بڑی بات ہے۔ آپ اتنا بڑا کرایہ کہاں سے لاکے دیں گے۔ تو میں نے اپنے تمام لئے والوں سے جو یہاں کے اہل وطن بھی ہیں، پیسے والے بھی ہیں، حیثیت والے بھی ہیں، شخصیت والے بھی ہیں سب کو ایک ہی جواب دیا تھا۔ گستاخی معاف، جس دن آپ کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے یہ ہاتھ حاضر ہے کاٹ دیجئے گا۔ اور ہمارے مرکز کی انتظامیہ اس بات کی گواہی دے گی کہ میں نے پہلے دن زبانی بھی کہا تھا اور منبر سے بھی اعلان کیا تھا کہ خبردار کوئی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے نہ چلے اور اگر کوئی کسی کے گھر پر پیسہ مانگ کے لائے گا تو میں واپس کر دوں گا۔ میری قوم فقیر ہے حق نہیں ہے۔

یہ مزدور ہیں ذلیل نہیں ہیں۔ یہ ہاتھ پھیلانے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ اپنی محنت کرتے ہیں اور محنت کا پیسہ کھاتے ہیں۔ نہ گدا کی کرتے ہیں نہ فقیری کرتے ہیں۔ جب اپنے بچوں کے لئے گدا کی نہیں کرتے ہیں تو کیا حسین ابن علیؑ کے لئے گدا کی کریں گے اور الحمد للہ میں کسی اور کا نہیں ان غریبوں کا ان مزدوروں کا ان مومنین کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میرا سر اونچا رکھا ہے۔ اور الحمد للہ کہ اس گردن پر کسی بڑے آدمی کا احسان نہیں ہے کہ کوئی کہے کہ ہم نے چندہ نہ دیا ہوتا تو مرکز نہ ہوتا، فرزند نہ ہوتا۔ الحمد للہ یہ قائم ہے انھیں غریبوں سے اور انصار اللہ قائم رہے گا انھیں غریبوں سے۔ بلکہ ایک بات جو گستاخی میں میری زبان سے نکل گئی تھی، میں اُسے دہرا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن کیا کروں بات آہی گئی ہے۔ میں نے بعض لوگوں سے یہ بھی کہا تھا کہ الحمد للہ کام ٹھیک چل رہا ہے۔ لیکن اگر میری گستاخی کو معاف کر دیں تو میں ایک بات کہوں کہ آپ بھی جیٹ والے ہیں، ہم بھی جیٹ والے ہیں۔ آپ بھی مومن ہیں، ہم بھی الحمد للہ مومن ہیں۔ آپ بھی انھیں کے ماننے والے ہیں ہم بھی انھیں کے ماننے والے ہیں۔ آپ پیسے والے ہیں ہم غریب ہیں مگر الحمد للہ ان کے نام پر آپ کرایہ لیتے ہیں اور ہم کرایہ دیتے ہیں۔ آپ سمجھ رہے تھے کہ ہم آپ کے سامنے دست سوال پھیلا دیں گے۔ الحمد للہ کہ اس کی نوبت نہیں آئی لیکن یہ نوبت نے محسوس کر لیا کہ آپ نے ہم سے پیسہ لیا ہے ہم نے آپ کو پیسہ دیا ہے۔ وہ دن چلے گئے جب لوگ سوچا کرتے تھے۔ غریب ہمارے پیسوں پر بیکل رہے ہیں اب تو حسینؑ نے ہمیں اتنا اونچا کر دیا ہے کہ پیسہ لے لے ہمارے پیسے پر مل رہے ہیں۔ صلوات

اب کوئی یہ نہ سوچے کہ ہم کسی کے محتاج ہیں، کسی کے دست نگر ہیں، کچھ نہیں ہے۔ فرزند عزا کا ذکر آہی گیا ہے تو ایک بات اور گزارش کر دوں کہ جہاں آپ بیٹھے ہوئے ہیں اسی کے پیچھے ایک مرد مومن کا مکان ہے۔ اتفاق سے وہ بیمار تھے۔ میں ان کی عیادت کے لئے گیا تو انھوں نے مجھ سے ایک بات یاد دلانی اور کہا کہ جب وہ بیمار ہے بیمار تھے علاج کے لئے باہر گئے ہوئے تھے لندن کے اطراف میں۔ تو وہاں سے انھوں نے

jabir.abbas@yahoo.com

مجھ کو ٹیلی فون کیا اور یہ کہا سید آپ سے ایک گزارش ہے کہ دعاؤں کی قبولیت کا مرکز آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں یہاں اسپتال میں داخل ہوں، میرا آپریشن ہونے والا ہے آپ سے ایک گزارش ہے کہ میری طرف سے آپ جاکے علم ابو الفضل تھام کے یہ کہہ دیں کہ علی کے لالہ مجھ غریب پر آپ رحم کریں۔ اپنے مالک سے آپ گزارش کریں پروردگار عالم ہم کو شفاء عابت فرمائے۔ اس کے بعد جو ہمارے امکان میں ہوگا ہم آپ کی ذمت کریں گے۔ میں نے ان کی طرف سے جاکے گزارش کر دی۔ الحمد للہ کہ یہاں کے سارے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا لیکن وہاں سے صحت باب ہو کے آگئے۔ جب میں ان سے ملنے کے واسطے گیا تو انھوں نے یہ بات بیان کی کہ ایک صاحب میرے پاس آئے اور آگے کے بعد انھوں نے کہا کہ میرا ملازمت میں ایک کام رکھا ہوا ہے اور ایک عرصہ سے میں ادھر سے ادھر وسائل تلاش کر رہا ہوں، مگر کبھی کام نہیں ہو رہا ہے۔ خالی ایک دستخط باقی ہے مگر وہ کام بھی نہیں ہو رہا ہے۔ اگر آپ اس شعبہ میں کسی سے کچھ تعلقات رکھتے ہوں تو آپ ذرا میرے واسطے وسیلہ فراہم کر دیجئے اتنے دن سے میرا کام ٹکا ہوا ہے۔ ہے آپ کے پاس کوئی واسطہ؟ انھوں نے کہا کہ ہاں ہاں میرے پاس واسطہ ہے۔ کہنے لگے کہ آپ کے تعلقات کس سے ہیں؟ میں نے کہا جتنے آدمی آپ سوچ رہے ہیں ان سب سے بڑے آدمی سے میرے تعلقات ہیں۔ تو اس نے کہا کہ ہم کو نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنے پہونچے ہوئے ہیں، ورنہ ہم پہلے ہی دن آپ سے کہتے۔ آج معلوم ہوا کہ آپ کے تعلقات اندر اندر بڑی شخصیتوں سے ہیں۔ اللہ ہمارا یہ کام کر دیجئے۔ کہا کہ میں کسی کے یہاں جاؤں گا نہیں۔ میرے تعلقات تو ہیں مگر میں جاؤں گا نہیں۔ کہا بھائی اگر آپ نہ جائیں گے تو کام کیسے ہوگا؟ کہا آپ چلے جائیے۔ کہا تعلقات آپ کے ہیں وہاں مجھے کون جانے دے گا۔ مجھے ان کے محل میں یا مکان میں یا مکان میں کون جانے دے گا، ارے آپ ہی چلے جائیں۔ کہا نہیں آپ چلے جائیے کام ہو جائے گا۔ کہا اچھا بتائیے آپ کا نام لے کر چلے جائیں گے شاید داخلہ مل جائے۔ کہا یہاں سے میرے گھر کے باہر نکلے، برابر میں جو مکان ہے اس میں ابو الفضل کا

ایک علم لگا ہوا ہے، ان سے بڑا کوئی نہیں ہے۔ آپ جائیے اور جاکے ان سے کہئے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ مرد مومن میرے پاس سے اٹھا اور اٹھ کے وہاں گیا اور جاکے نہایت ہی خصوص و خشوع اور توجہ کے ساتھ اس نے علم تھام کے حضرت ابو الفضل کی بارگاہ میں درخواست کی اور کہا میں کوئی بڑا آدمی تلاش کر رہا تھا۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ آپ سے بڑا کون ہے۔ میں ادھر سے غافل تھا اب میں آپ کے پاس آیا ہوں، اب یہ کام آپ کے حوالہ ہے۔

وہ شخص کہتا ہے کہ جب صبح کو میں پہونچا تو جیسے ہی میں دفن میں داخل ہوا وہی مجھ سے کلرک نے کہا مبارک ہو آپ کا ورق، آپ کا کاغذ دستخط ہو کے آگیا ہے۔ میں نے کہا بھئی ابھی تو آفس کھلا بھی نہیں ہے۔ کہا بھئی نہیں معلوم ہے یہ دیکھئے فیکس سامنے رکھا ہوا ہے۔

اس واقعہ کے بعد اس مرد مومن نے کہا کہ سید آپ لوگوں کو کیا پریشانی ہے۔ جب آپ کے پاس اتنی بڑی شخصیت ہے، تو لاکھ دو لاکھ اور پانچ لاکھ کی اوقات ہی کیا ہے۔ آپ کے پاس تو وہ ہیں کہ جب دنیا میں کوئی دینے والا نہ ہوگا تو وہ خود کیا کر ہیں۔ اسی لئے ہم نے یہ حساب لگایا ہے کہ وہ ہمیں دیں گے اور ہم پلاٹا کے انھیں کی راہ میں دیں گے۔ وہ ہمیں دیں گے یہ ان کے کرم کا تقاضا ہے۔ ہم ان کی راہ میں لگا دیں گے یہ ہماری غلامی کا تقاضا ہے۔ یہ کام یک طرفہ نہیں ہوتا ہے یہ کام ہمیشہ دوطرفہ ہوتا ہے۔ طاقتیں خدا دیتا ہے بندہ اسی طاقت سے بندگی کرتا ہے۔ مال خدا دیتا ہے بندہ اسی مال کو خدا کی راہ میں لگا دیتا ہے۔ آل محمد کا صدقہ کھاتے ہیں، آل محمد کی راہ میں لگاتے بھی ہیں صلوات بس عزیزیان محترم ذکر آگیا تھا تو میں نے گزارش کر دی۔ ورنہ یہ عبادت کی رات ہے اور اسلام میں عبادت کی دس قسمیں ہیں جو برابر آپ بڑھا کرتے ہیں۔ لیکن شاید بچے بچوں نہ پہچانتے ہوں، اس لئے کہ بچوں کو جب بڑھا یا جاتا ہے تو بڑا دیا جاتا ہے، وہ اس لفظ کے معنی بھی نہیں جانتے ہیں۔ بچوں کو بتایا جاتا ہے

اصول دین پانچ ہیں، فروغ دین دس ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دین کسی درخت کا نام ہے جس میں جڑیں پانچ ہیں اور شاخیں دس ہیں اس لئے کہ اصل کے معنی جڑ ہیں اور فروغ کے معنی شاخ۔ نہیں عزیزو! جو ہمارے بنیادی عقائد ہیں وہ ہیں پانچ اور جو ان عقائد کی روشنی میں بندگی کے طریقے ہیں وہ ہیں دس۔ جن کو آپ فروغ دین کہتے ہیں۔ یہ ہیں بندگی کے طریقے، عبادت کے طریقے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کوئی کام بغیر نیت قریبہ کے انجام نہیں پاسکتا ہے۔ عبادت کے معنی کیا ہیں۔ ہر وہ کام جو خدا کے لئے کیا جائے، وہی عبادت ہے۔ خدا کے لئے نہ ہو تو نماز نہیں ہے۔ خدا کے لئے نہ ہو تو روزہ نہیں ہے۔ خدا کے واسطے نہ ہو تو حج نہیں ہے۔ خدا کے واسطے نہ ہو تو زکوٰۃ نہیں ہے۔ خدا کے واسطے نہ ہو تو جہاد نہیں ہے۔ یہ سارے کام جو کہ خدا ہی کے لئے ہوتے ہیں اس لئے ان کا نام رکھا جاتا ہے عبادت۔! صلوات

اسلام میں عبادت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے نماز سے اور تمام ہوتا ہے رمضان خدا سے نفرت پر۔ باقی تو آپ کو یاد ہی ہے۔ روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، جہاد، نیکیوں کا حکم دینا، بُرائیوں سے روکنا، خاصانِ خدا سے محبت کرنا۔

میں چاہتا تھا کچھ تفصیل سے گزارش کرنا مگر وقت نہیں ہے صرف عنوانِ مشنچاں آپ کے حوالے کر رہا ہوں، جا کے سوچئے گا اسی روشنی میں تو بہت سی باتیں آپ کی سمجھ میں خود ہی آجائیں گی۔ یہ ہیں اسلام کی عبادتیں، جن کی دس قسمیں ہیں۔ اور اگر سیٹن چاہیں تو یوں پہچانیں کہ عبادتوں کی دو قسمیں ہیں۔ بعض عبادتیں مال کے ذریعہ ہوتی ہیں بعض میں مال کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ عبادت جو مال سے ہوتی ہے اس کا نام ہے خمس و زکوٰۃ، اور وہ عبادت جو بغیر مال کے ہوتی ہے اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔ کبھی اپنے گھر میں ہوتی ہے کبھی خدا کے گھر میں ہوتی ہے۔ جو عبادت خدا کے گھر میں ہوتی ہے اس کا نام ہے حج، اور جو عبادت اپنے گھر میں ہوتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ کبھی اندر اندر ہوتی ہے کبھی باہر آجاتی ہے۔ اندر اندر ہوجائے تو اس کا نام ہے روزہ، اور باہر آجائے تو اس کا نام ہے نماز۔ نماز دکھائی دیتی ہے، روزہ دکھائی نہیں دیتا ہے۔

عبادتیں اپنی ذات کی حدود میں رہ جائیں تو ان قسموں میں شامل ہوجاتی ہیں اور معاشرہ کے اندر آجائیں تو معاشرے کے اندر عبادت کے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ جو غلط ہے اسے ٹھیک کیا جائے، اور ایک یہ ہے کہ جو صحیح کام نہیں ہو رہا ہے اسے رائج کیا جائے۔ ایک کا نام ہے امر بالمعروف، اور دوسرے کا نام ہے نہی عن المنکر۔

ان دس موضوعات پر روشنی ڈالنے کے لئے تو شاید دس دن بھی کم پڑ جائیں گے لہذا میں نے شرحی آپ کے حوالہ کر دی ہے۔ اب شب عاشور کے حوالے سے حسین کی ساری عبادتوں میں سے ایک عبادت جس کا نام ہے نماز۔ نمازوں کی منزل میں جہاں امام حسینؑ ہیں، دنیا کا کوئی انسان نہیں ہے۔

نماز تین منزلوں سے گذرتی ہے:

نماز کے پہلے مرحلے کا نام ہے قیام۔

دوسرا مرحلہ ہے "رکوع"

آخری مرحلہ ہے "سجدہ"

تو ساری عبادتوں میں پہلا درجہ ہے نماز کا، اور نماز میں سب سے آخری درجہ ہے سجدہ کا۔ تو جس انسان کی شانِ عبادت کو پہچانا ہو، اسے باقی عبادتوں میں کیا دیکھو نماز میں دیکھ لو۔ اور اگر نماز میں دیکھنا ہے تو قیام میں کیا دیکھنا ہے، رکوع میں کیا دیکھنا ہے، سجدے میں آکے دیکھو وہ کہاں ہے۔

اب جو عظمتِ عبادتِ حسینؑ کو سجدہ سے پہچانا جائے تو دوسرا سانس آئے:

حسینؑ سجدے میں یا حسینؑ سجدہ گزار کی پشت پر۔

عظمتِ حسینؑ دونوں طرح دیکھی، جب نبیؐ سجدہ میں تھے اور حسینؑ پشت پر تھے۔ تو حسینؑ کی ایک عظمت سانسے آئی، اور جب حسینؑ سجدہ میں آئے تو حسینؑ کی دوسری عظمت سانسے آئی۔ صلوات

jabir.abbas@yaho

ہم نے عظمت حسین ابن علیؑ کو اس دن بھی دیکھا جب سرکارِ دو عالمؐ سجدہ میں تھے اور نواسر پشت پر تھا اور جب نماز تمام ہو گئی تو لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ ہَلْ نَزَلَ عَلَيْكَ الْوَحْيُ حُضُورًا كَمَا كُنْتَ وَحِي نَازِلٌ ہُوَ ہِی تھی جو آپؐ سجدے میں رہ گئے اور ہم بپارے مسلمان انتظار ہی کرتے رہ گئے؟ پیغمبرؐ نے کہا، نہیں۔ میرا نواسر پشت پر آگیا تھا۔

واقعہ آپؐ کا سنا ہوا ہے صبح وشام۔ پھر پوچھا تھا ہے۔ میں رونا بھی نہیں چاہتا۔ میں بیان کو آخری منزل تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک لفظ ہے جو کہنا چاہتا ہوں۔ چونکہ تاریخ میں یہ فقرہ ہے کہ لوگوں نے پوچھا حضورؐ کیا کوئی وحی نازل ہو رہی تھی؟ حضورؐ نے فرمایا نہیں۔ بات یہ ہے کہ میں سجدہ میں تھا اور میرا نواسر آگے پشت پر بیٹھ گیا تھا۔

یعنی لوگ یہ تو سمجھ سکتے تھے کہ وحی نازل ہو اور سجدہ کو طول ہو جائے، لیکن یہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی پھر آگے پشت پر بیٹھ جائے گا اور سجدہ کو طول دیدیں گے۔ تو پیغمبرؐ کے لئے کتنا آسان تھا کہ لوگوں کی نگاہ میں اپنی حیثیت بچانے کے لئے فرمادیتے ہاں! کسی کو کیا معلوم کہ وحی نازل ہوئی کہ نہیں یہ تو وہ جانے اور وہ جانے جو نازل کرنے والا ہے۔ فرمادیتے ہاں ہاں وحی نازل ہو رہی تھی تاکہ لوگوں کو اطمینان ہو جاتا، ورنہ لوگوں کو ہزار طرح کے اعتراضات ہوں گے کہ یہ کیسی ناز ہے۔ یہ آپؐ سجدہ کر رہے ہیں کہ بچوں کو کھلا رہے ہیں، یہ کیسا سجدہ ہے۔ مگر پیغمبرؐ نے صاف بتا دیا کہ میں وحی کے لئے نہیں ٹھہرا تھا، حسینؑ کے لئے ٹھہرا تھا۔ ہائے کیا عجیب نقشہ تھا کہ نبیؐ ٹھہرے تھے حسینؑ کے لئے اور ساری قوم ٹھہری تھی نبیؐ کے لئے۔ یہ سب اسٹالین تو نبوت سے انحراف ہو جائے، اور وہ سراٹھالے تو مرضی خدا کو کیا کرے۔

اب میں اپنی زبان میں کہہ سکتا ہوں کہ پوچھنے والو! کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ ارے یہی تو پوچھ رہے ہو کہ کیا قرآن نازل ہو رہا تھا؟ ہاں ہاں۔ ارے قرآن ہی درمیان میں آگیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ تم صامت کا

تصور کر رہے تھے اور نبیؐ ناطق کا انتظار کر رہا تھا۔ صلوات
تھارا خیال یہ تھا کہ قرآن صامت کے لئے سجدہ کو طول دیا جاسکتا ہے اور نبیؐ یہ سمجھا رہے تھے کہ جیسے قرآن صامت کے لئے طول دیا جاسکتا ہے ویسے ہی قرآن ناطق کے لئے بھی سجدہ کو طول دیا جاسکتا ہے۔ حسینؑ قرآن میں ہیں قرآن ناطق ہیں۔ جب قرآن ناطق پشت پر بیٹھ کر آگیا تو سرکارؐ نے سجدہ کو طول دے دیا اور یہیں سے دوسرا مسئلہ بھی حل ہو گیا اور عظمت حسینؑ کا دوسرا نکتہ بھی سامنے آگیا کہ دوسرا نکتہ یہ بھی کو ناز برداری کرتے ہوئے۔ ایک مرتبہ سجدہ میں، ایک مرتبہ نہ ہر کہ حسینؑ سامنے آگئے تو جیسے ہی پھر گرا، نبیؐ نے خطبہ توڑ دیا اور دو ٹوک کا ایک ہی سبب تھا نماز کی ہوئی تھی قرآن ناطق کے لئے، اور حدیث روک دی گئی تھی قرآن کے لئے۔ صلوات

بس عزیزانِ محترم زیادہ وقت نہیں ہے۔ اب میں بات کو آخری مرحلہ پر لے آیا۔ عبادتِ قربت خدا کے لئے ہے۔ بندہ مالک سے قریب ہونا چاہتا ہے۔ اس کے یہ ذرائع ہیں جو بدو روکار عالم نے معین کر دیے ہیں۔ جب ہم سے قریب ہونا ہو تو یہ ذرائع ہیں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ ان کے ذریعہ آگے تم مجھ سے قریب ہو سکتے ہو۔ یہ قربت خدا کا ذریعہ ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ اگر میری قربت کے لئے ہے تو وہی ذریعہ ہو گا جسے میں نے معین کیا ہے۔ یعنی نماز کے ذریعہ قریب ہونا ہے تو وہ نماز پڑھنا جو میں نے بنائی ہے۔ ورنہ تمہاری بنائی ہوئی تم سے قریب بنائے گی، مجھ سے قریب نہیں بنائے گی۔

اگر روزے کے ذریعہ مجھ سے قریب ہونا ہے تو ویسے ہی رکھنا جیسے میں نے کہا ہے "اتَّبِعُوا الصِّيَاةَ الَّتِي اَلَّلَيْلِ"۔ تمہارا کوئی روزہ مجھ سے قریب بنائے گا، وہی روزہ قریب بنائے گا جو میرا بنایا ہوا ہے اور یہ بات میں نے کہی ہے کہ بہت سے بندے ہیں جو خدا سے قریب ہونا چاہتے ہیں، بغیر اس کے کہ یہ اعمال قریب بنا بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ آج ہی ایک مرد کو میں نے

jabir.abbas@yahoo.com

ٹلی فون کیا اور پوچھا مولانا میں روزہ سے ہوں تو یہ بتائیے کہ یہ روزہ مغرب تک چلے گا یا بیچ میں توڑ دیا جائے گا؟
میں نے کہا یہ کون سا روزہ ہے؟
کہنے لگے۔ مناسہ کہ نو محرم اور دس محرم کا روزہ بہت اہمیت رکھتا ہے لہذا میں نے رکھ لیا ہے۔

کب ماہ رمضان گیا اور کب محرم آیا۔ پورا سوال گزر گیا روزہ نہیں یاد آیا۔ پورا ذی قعدہ کا مہینہ گزر گیا روزہ یاد نہیں آیا۔ ذی الحجہ کا مہینہ گزر گیا۔ تین مہینے سے زیادہ گزر گئے روزہ یاد نہیں آیا۔ اب یاد آیا تو خالی نو۔ دس محرم کو۔
بڑی فضیلت ہے مناسہ۔

اے بھائی کسی سے مناسہ ہے۔؟

آپ نے اگر نہیں سنا تو اب سن لیجئے۔ آج ہی میں دیکھ رہا تھا اور نہایت مختصر کتاب کا حوالہ دے رہا ہوں۔ یہ موضوع میرے ٹھہرنے کا نہیں ہے۔ لیکن چونکہ عبادتوں کا ذکر آگیا ہے تو ایک جملہ یاد رکھئے گا تاکہ مومنین کو معلوم ہو جائے، اور اگر کسی اور کو نہیں معلوم ہے تو آپ بتا بھی سکتے ہیں۔

آج ہی میں مطالعہ کر رہا تھا "صحیح مسلم" کا۔ میں کسی غلط کتاب کا حوالہ تو دیتا ہی نہیں۔ اس میں روزہ عاشور کے روزے کے بارے میں دو طرح کی روایتیں ہیں: ایک روایت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام جب مکہ میں تھے اس وقت سرکارِ دو عالم نے دیکھا کہ دو جہاںیت سے لوگ عاشور کے دن روزہ رکھ رہے ہیں، تو حضور نے کہا چلو ہم بھی شامل ہو جائیں۔ لہذا حضور بھی شامل ہو گئے سب کے ساتھ۔

آپ بغیر کسی تبصرہ کے یہ خبر سن لیجئے کہ حضور نے دیکھا کہ لوگ جہاںیت سے عاشور کے دن روزہ رکھتے چلے آ رہے ہیں۔ تو حضور نے بھی کہا چلو ہم بھی رکھ لیتے ہیں اور رکھ لیا۔ یہاں تک کہ پروردگار نے ماہ رمضان کے روزے نازل کر دیے۔
دیکھئے ماہ رمضان کے دو ذی قعدہ میں شروع ہوئے ہیں، یعنی بیڑہ، ال

تک حضور وہی کرتے رہے (معاذ اللہ) جو جہاںیت میں ہو رہا تھا۔
جب ماہ رمضان کے روزے نازل ہو گئے تو لوگوں نے پوچھا حضور اب اس روزہ کا کیا ہوگا؟

فرمایا، یہ والا تو ہو گیا ہے واجب، وہ والا ہے اختیاری۔ یعنی ابھی بھی اگر طریقہ جہاںیت کو زندہ رکھنا چاہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ پیغمبر جب مدینہ آئے ہجرت کر کے تو آپ نے دیکھا کہ عاشور کا دن آیا اور یہودیوں نے روزہ رکھ لیا۔ تو پوچھا یہودیوں سے کہ تم لوگ آج کے دن روزہ کیوں رکھتے ہو؟

کہا کہ اس دن موسیٰ نے فرعون کے مقابلے میں فتح پائی ہے۔ لہذا ہم اس کی خوشی میں روزہ رکھتے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ ہم تو موسیٰ سے زیادہ قربت رکھتے ہیں۔ اچھا ہوا تم نے بتا دیا ظاہر ہے کہ موسیٰ تو ہماری ہی برادری کے تھے۔ تو جب تم لوگ موسیٰ کی خوشی منائے ہو تو ہم بھی منائیں گے۔ ہم بھی روزہ رکھیں گے۔

مگر یہودیوں کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ تو ہمیشہ شرہ پر رہے ہیں، انھوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں کا پیغمبر بھی بالآخر ہمارے ہی راستہ پر آ گیا۔

ابن عباس دوڑے ہوئے آئے۔ کہا یا رسول اللہ! ایک کام اور کر دیجئے؟ فرمایا وہ کیا؟

کہا عاشور کا روزہ تو یہودی رکھتے ہیں، آپ نے اس کو اختیار کر لیا، تو وہ طعنے دے رہے ہیں، مذاق اڑا رہے ہیں۔ لہذا ایسا کیجئے کہ ایک روزہ اور جوڑ دیجئے یعنی نو اور دس دو دن رکھئے تاکہ ہم ان سے کہہ سکیں کہ نالائقو! بے ایمانو! یہ تمھاری پیروی نہیں ہے، یہ ہمارا اسپیشل قانون ہے۔ تمھارے یہاں ایک دن کا قانون ہے ہمارے یہاں دو دن کا قانون ہے۔

تو حضور نے فرمایا ٹھیک ہے۔ اگر تمھارے اگلے سال تک مجھ کو زندہ رکھا

jabir.abbas@yahoo.com

تو اگلے سال دو دن رکھوں گا۔ تو کو بھی اور دس کو بھی۔ تاکہ یہودی بے ایمان مسلمانوں کو ستا سکیں۔

اس کے بعد خود صاحب کتاب نقل کرتے ہیں کہ حضور اگلے سال زندہ ہی نہیں رہے اور دنیا سے چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روزہ ایک ہی رہ گیا اور ابن عباس کی حسرت دل کی دل ہی رہ گئی اور یہودیوں کو طعنے دینے کا موقع رہ گیا۔

میں نے عرض کیا کہ یہ خبر بلا تبصرہ ہے۔ اب جو سمجھ سکتے ہیں ان سے پوچھئے شاید سمجھا سکیں کہ کیا پیغمبر اسی دن کے لئے بھیجا گیا تھا کہ جو جاہلیت والے لے کر یں گے وہی کرے گا، اور جو یہودی کر یں گے وہ بھی کرے گا۔ مگر میں وہ کسے لگا جو جاہلیت والے کر یں گے۔ مدینہ میں وہ کسے لگا جو یہودی کر یں گے اور ابن عباس سمجھائیں گے تو کہے گا کہ ہاں اب قانون بنے گا یعنی قانون الہی بھی اب ابن عباس کے کشورہ سے بنے گا۔ سلسلہ ہماری میں حضور نے رحلت فرمائی ماہ صفر کے آخر میں یا ماہ ربیع الاول کے شروع میں۔ تو گویا یہ واقعہ دو مہینے پہلے کا ہے کہ جب حضور نے روزہ رکھا، اور ابن عباس نے گزارش کی کہ ایک روزہ اور رکھئے تو فرمایا کہ اگلے سال دیکھا جائے گا، اور پھر سلسلہ ہماری میں رکھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

یہ تاریخی نکتہ نوٹ کر لیجئے کہ حضور نے پہلا روزہ رکھا عاشور کے دن یہودیوں کو دیکھ کے، اور اگلے سال زندہ نہ رہے ورنہ دو رکھتے۔ اب اس روایت کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ذرا مسلمانوں سے پوچھئے کہ کیا سلسلہ تک مدینے میں کوئی یہودی رہ گیا تھا؟ خیر کی فتح کے بعد مدینے میں کوئی یہودی رہ گیا تھا کہ جن کو دیکھ کے حضور نے روزہ شروع کر دیا ہو۔ اور بتائیے کہ کیسے اس روزہ کو رفاقت کیا جائے اور کیسے توہین پیغمبر کو برداشت کیا جائے کہ مکہ میں رہے تو جاہلیت کے ساتھ رہے اور مدینہ میں آئے تو یہودیت کے ساتھ چلے۔ میں تو پیغمبر کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، انشاء درہاتہ جوڑ کے گزارش کروں گا کہ ابھی تک تو ہم سے کہا جاتا تھا کہ وہ کسے جو یہودی کرتے تھے، اب پیغمبر پر بھی یہی التزام شروع؟

ہو گیا۔ ۹ صلوات

یہ ہے کل تاریخی حقیقت جو کہ کتاب میں موجود ہے۔ اور جہاں بھی آپ جائینگے خود مطالعہ کر لیں گے اور آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ چونکہ ایک مومن نے سلسلہ پوچھا تھا تو میں نے چاہا کہ سارے مومنین پر سلسلہ کی وضاحت ہو جائے ورنہ ظاہر ہے کہ اس کا یہ موقع نہیں تھا۔

بس میں اپنے بیان کو آخری مرحلہ تک لے آیا۔ فرزند رسول اشعلین جب منزل عبادت میں آئے تو کوئی طریقہ عبادت ایسا نہیں تھا جس کو حسین نے مراجع زندگی تک پہنچا دیا ہو۔ ہر عبادت رضائے خدا کے لئے، نماز رضائے خدا کے لئے۔ روزہ رضائے خدا کے لئے، حج و زکوٰۃ رضائے خدا کے لئے۔ اسلام میں تو اتنی ہی عبادتیں تھیں رضائے خدا کے لئے۔ مگر حسین نے رضائے خدا کا ایک نیا راستہ نکالا۔ چھ مہینے کا بچہ ہاتھوں پر رہے جیسے سے باہر آئے اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آواز دی پروردگار! اِنَّكَ اَنْتَ الَّذِیْ تَخْذُلُ الْیَاسِرَ وَ تَرْزُقُ الْفَقِیْرَ! اگر تیری رضا اسی میں ہے کہ میرا بچہ چھ مہینے کا بچہ بھی کام آجائے تو میں لے کے آگیا ہوں۔ میں اس لال کو بھی قربان کر دوں گا۔ حسین کو فقط تیری رضا چاہیئے۔ حسین نے رضا کا ایک نیا راستہ اختیار کیا، جس پر نہ کوئی بی جلا تھا نہ کوئی ولی۔ یہ رضا کا نیا راستہ تھا جو حسین ابن علیؑ نے دکھلایا ہے۔ چھ مہینے کے بچے کو لائے ہیں راہ رضائے الہی میں قربان کرنے کے لئے۔

بس آئیے اسی راہ رضا پر چلیں اور بیان کو آخری منزل تک لیجائیں۔ وہ موقع جب سارے چاہنے والے کام آگئے۔ نہ اصحاب و انصار، نہ دل کے ٹکڑے، نہ گود کے پالے، نہ ہر اکال لال کیلا ہے۔ ایک ہندی پر آگے آواز دیتا ہے، ہَلْ مِنْ نَاصِیْ یَنْصُرُنَا۔ آج عاشور کی رات ہے۔ انشاء اللہ بہت روئیں گے ہوں گے۔

jabir.abbas@yaho

ایک خیال بہت دیر سے مجھے ترپا رہا ہے۔ کل کی مجلس میں میں نے یہ کہا تھا کہ میرے سامنے اتنے نوجوان بیٹھے ہیں ان سے کہوں گا علی اکبر کا ماتم کریں آج سوچ رہا ہوں کس سے کہوں، کسے دعوت دوں، کسے بلاؤں، کسے پکاروں۔ آدھی رات کا وقت آگیا ہے۔ اے میری بہنو! اگر تمہاری گودیوں کے بچے سو گئے ہوں۔ اے میری بیٹیو! اگر تمہاری گود کے بچے سو گئے ہوں تو بچوں کو جگا دو۔ علی اصغر کا ذکر ہو رہا ہے۔ اللہ تمہاری گودیوں کو آباد رکھے۔ کل کا دن آگے کا تو تمہارے بچے رہیں گے مگر رباب کا لال نہ رہے گا۔

ہائے وہ ہنگام جب حسین استغاثہ کی آواز بلند کر رہے تھے اور اکبر ترخیم میں کہرام برپا ہوا۔ جیسے ہی ترخیم سے کہرام کی آواز بلند ہوئی حسین دوڑ کے درخیم پر آئے۔

ہن زینب خیر تو ہے، کیا کوئی تازہ مصیبت گذر گئی، یہ رونے کی آوازیں کیوں آرہی ہیں؟

کہا بھیا کوئی اور مصیبت تو نہیں ہے مگر آپ کی آواز کو سن کے علی اصغر نے اپنے کو جھولے سے گرا دیا ہے۔

کہا ہن میں سمجھ گیا۔ لاؤ میرے بچے کو لاؤ۔

کہا مگر جیتا وہ کسی کی گودی میں اتا نہیں ہے۔

کہا ہن پھر مجھے لے چلو۔

ثنائی زہرا بھائی کو لے کے علی اصغر کے جھولے کے قریب آئیں۔ درجانی باپ نے کیا کہا، نہ جانے پوچھا۔ جیسے ہی حسین نے ہاتھ پھیلائے پھر بچے کے باپ کی گودی میں آگیا۔

بابا میں میدان میں جانے کے قابل نہیں تھا۔ اس لیے میں نے آپ کو زحمت دی ہے۔ آپ مجھے لے چلیں۔

حسین نے بچے کو لیا۔ لے کے چلے۔ جب درخیم پر پہونچے دیکھا رباب

سر جھکائے کھڑی ہیں۔

حسین نے کہا۔ رباب یہاں کیوں کھڑی ہو؟

کہا آقا میں دیکھ رہی ہوں کہ صبح سے جو کیا وہ پلٹ کے میدان سے نہیں آیا۔ میں چاہتی ہوں اپنے لال کو درخیم سے رخصت کر دوں۔

حسین نے رباب کو تسکین دی۔ رباب! اب تک جو میدان میں گیا اس کے بارے میں یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شائد لٹنے کے لئے آیا ہے جنگ کرنے کے لئے آیا ہے مگر تمہارا لال تو جنگ کرنے کے لائق نہیں ہے۔ میں لیجا رہا ہوں علی اصغر کی پیاس بجھانے کے لئے شائد ملاطوں کو دم آجائے۔

ماں کا دل ٹھہرا۔ حسین ایک بلندی پر لے کے آئے۔ آگے آواز دی۔

اے فوج جفاکار! اے قوم جفاکار! اے ظالمو! تمہیں معلوم ہے میرے بچے کا حال کیا

ہے؟ میرا بچہ تین دن سے پیاسا ہے۔ میرے اصغر کو پانی نہیں ملا ہے۔ اگر تمہارے خیال

میں میری کوئی خطا ہے تو مجھ پہنچنے کے بچے کی کوئی خطا تو نہیں ہے۔ اگر تمہیں میری بات کا اعتبار

نہیں ہے تو اسے خاک پر لٹائے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر جلتی ریت پر حسین نے لٹا دیا۔ مگر

اک مرتبہ گھبرا کے بچے کو پھراٹا لیا۔ اے بیٹا اصغر! یہ میری بات کو نہیں سمجھتے۔ اب تم

بتاؤ کہ تم کتنے پیاسے ہو۔ علی اصغر نے سوکھی زبان خشک ہونٹوں پر پھرائی۔ بیٹنظر دیکھنا

تھا کہ فوج دشمن میں اک کہرام برپا ہو گیا۔ فوج کا نقشہ بدلنے لگا۔ ابن سعد نے آواز دی

حولہ کہاں ہے؟ حولہ سامنے آیا۔ کہا حسین کے کلام کو قطع کر دے۔ ظالم نے دوش سے کمان

اتاری۔ بس اولاد والو دل بٹھاؤ۔ تیر چلا کمان میں جوڑا۔ علی اصغر کے گلے کو نشانہ بنایا۔

تیر چلا۔ بچہ کے گلے پر لگا۔ پھر باپ کے ہاتھوں پر پلٹ گیا۔ اب جو حسین نے ٹھیک کے

دیکھا تو کیا دیکھا کہ علی اصغر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ بابا میں مسکرا کے جا رہا ہوں،

اب پریشان نہ ہوں۔

حسین اصغر کو لے کے چلے درخیم کی طرف۔ درخیم کے قریب آئے۔ نہ جانے

کیا خیال آیا کہ ماں بچے کو اس عالم میں کیسے دیکھے گی۔ پلٹ آئے۔ پھر آگے بڑھے۔ پھر پلٹ

jabir.abbas@yahoo.com

اُسے۔ بار بار اُسے بڑھتے ہیں اور پٹ اُتے ہیں۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون
بس عزیزو! آخری مرحلہ اور مجلس تمام۔ باقی جو کچھ ہے وہ انشاء اللہ کل گزارش
کروں گا۔

اُسے درخیمہ پر اور اُسے آواز دی رباب اپنے لال کو لے جاؤ۔ ہاں رونے والو!
حین نے آواز دی۔ رباب اپنے لال کو لے جاؤ۔ خیمہ میں جیسے ہی آواز آئی۔ روایت کا
انداز کہتا ہے۔ ادھر سے رباب چلیں اور ادھر سے سکینہ۔ مگر مقتل کہتا ہے کہ سکینہ پہلا آئیں
رباب بعد میں آئیں۔ شائد راز یہ رہا جو کہ بھی دوڑ کے آگئی اور ماں کے قدم نہیں اٹھتے
ہیں۔ سنو سنو! درخیمہ پر اُسے سکینہ نے کہا بابا اصغر کو پانی پلا لائے؟ بابا بھیا کو پانی پلا
دیا؟۔ اُسے سکینہ نے بھی تو پانی ہی۔ حین چپ کھڑے ہیں۔ رباب اُسے بڑھیں۔ لائیے
آقا میرے بچے کو لائیے۔ اب جو تباہا کا دامن اُٹا، ماں نے دیکھا کہ گلے پر تیر کا نشان ہے۔
اُسے میرے لال، اُسے میرے علی اصغر۔ ارے اس عمر کے بچے بھی کیا اس طرح حرکتیں
جالتے ہیں۔ ماں تڑپ رہی ہے۔ حین سر جھکائے کھڑے ہیں۔ واعلیٰ اصغر۔ واعلیٰ اصغر۔
وَاَنَا لِلّٰهِ وَ اَنَا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ



ادعیہ و زیارات گوہر یگانہ امام عصر علیہ السلام

علامہ السید فرید الدین عظیمی راجاؤنی اعلیٰ اللہ تعالیٰ

عظیم پبلیکیشنز

ہدف۔ ادپاکس نمبر 18168 کراچی 74700 پاکستان

احادیث رسول اللہ

تحقیق و پیشکش

محترمہ صفی زیدی

(ایم اے، ایم ایڈ)

عصمہ پبلیکیشنز

بی۔ او باکس نمبر 18168 کراچی 74700 پاکستان

۲۷۳

سر جھکائے کھڑی ہیں۔

حسینؑ نے کہا۔ رباب یہاں کیوں کھڑی ہو؟
کہا آقا میں دیکھ رہی ہوں کہ صبح سے جو کیا وہ پلٹ کے میدان سے نہیں
آیا۔ میں چاہتی ہوں اپنے لال کو درخیمہ سے رخصت کر دوں۔

حسینؑ نے رباب کو تسکین دی۔ رباب! اب تک جو میدان میں گیا
اس کے بارے میں یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شائد لڑنے کے لئے آیا ہے، جنگ کے
کے لئے آیا ہے مگر تمہارا لال تو جنگ کرنے کے لال تو نہیں ہے۔ میں لیجا رہا ہوں
علیؑ صغریٰ پیاس بجھانے کے لئے شائد غلاموں کو رحم آجائے۔

ماں کا دل ٹھہرا۔ حسینؑ ایک بلندی پر لے کے آئے۔ آگے آواز دی۔
اے فوج جفا کار! اے قوم جفا کار! اے ظالمو! تمہیں معلوم ہے میرے بچے کا حال کیا
ہے؟ میرا بچہ تین دن سے پیاسا ہے۔ میرے اصغرؑ کو پانی نہیں ملا ہے۔ اگر تمہارے خیال
میں میری کوئی خطا ہے تو مجھ پہنچنے کے پتے کی کوئی خطا تو نہیں ہے۔ اگر تمہیں میری بات کا اعتبار
نہیں ہے تو اسے خاک پر لٹائے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کے جلتی ریت پر حسینؑ نے لٹا دیا۔ مگر
اک مرتبہ گھبرا کے بچے کو پھرا تھا لیا۔ اسے بیٹا اصغرؑ یہ میری بات کو نہیں سمجھتے۔ اب تم
بتاؤ کہ تم کتنے پیاسے ہو۔ علیؑ صغریٰ نے سوکھی زبان خشک ہونٹوں پر پھرائی۔ پیٹ نظر دیکھنا
تھا کہ فوج دشمن میں اک کہرام برپا ہو گیا۔ فوج کا نقشہ بدلنے لگا۔ ابن سمعہؓ نے آواز دی
حرم کہاں ہے؟ حرم سامنے آیا۔ کہا حسینؑ کے کلام کو قطع کرنے۔ ظالم نے دوش سے کمان
اتاری۔ بس اولاد داؤ دل بٹھا لو۔ تیر چلا کمان میں جوڑا۔ علیؑ صغریٰ کے گلے کو نشانہ بنایا۔
تیر چلا۔ بچہ کے گلے پر لگا۔ بچہ باپ کے ہاتھوں پر پلٹ گیا۔ اب جو حسینؑ نے جھک کے
دیکھا تو کیا دیکھا کہ علیؑ صغریٰ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ بابا میں مسکرا کے جا رہا ہوں!
آپ پریشان نہ ہوں۔

حسینؑ صغریٰ کو لے کے چلے درخیمہ کی طرف۔ درخیمہ کے قریب آئے۔ نہ جانے
کیا خیال آیا کہ ماں بچے کو اس عالم میں کیسے دیکھے گی۔ پلٹ آئے۔ پھر آگے بڑھے۔ پھر پلٹ

آئے۔ بار بار آگے بڑھتے ہیں اور پٹ آتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
بس عزیزو! آخری مرحلہ اور مجلس تمام۔ باقی جو کچھ ہے وہ انشاء اللہ کل گزارش
کروں گا۔

آئے دُخیر پر اور آگے آواز دی رباب اپنے لال کسے جاؤ۔ ہاں روئے والو!
حسین نے آواز دی۔ رباب اپنے لال کسے جاؤ۔ خیمہ میں جیسے ہی آواز آئی۔ روایت کا
اعجاز کہتا ہے۔ ادھر سے رباب چلیں اور ادھر سے سکینہ۔ مگر قاتل کہتا ہے کہ سکینہ پہلا نہیں
رباب بعد میں آئیں۔ شاید راز یہ رہا ہو کہ نبی دور کے آگئی اور ماں کے قدم نہیں اٹھتے
ہیں۔ سو سنو! دُخیر پر آگے سکینہ نے کہا بابا اصغر کو پانی پلا لائے؟ بابا بھیا کو پانی پلا
دیا؟۔ اے سکینہ بھی تو پانی ہی۔ حسین چپ کھڑے ہیں۔ رباب آگے بڑھیں۔ لائیے
آقا میرے بچے کو لائیے۔ اب جو تو کا دامن اٹا، ماں نے دیکھا کہ نگے پر تیرا نشان ہے۔
اے میرے لال، اے میرے علی اصغر۔ ارے اس عمر کے بچے بھی کیا اس طرح حرکت کئے
جالتے ہیں۔ ماں تڑپ رہی ہے۔ حسین سر جھکائے کھڑے ہیں۔ داعی اصغر۔ داعی اصغر۔
اَنَا لِلّٰہِ وَ اَنَا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ



ادعیہ و زیارات

گوہر یگانہ

امام عصر عجل اللہ فرجہ

علامہ السید فریدان جید جوادنی اعلیٰ القضاہ

عصر پبلیکیشنز

ہلی۔ ادو باکس نمبر ۱۸۱۶۸ موبائی ۷۴۷۰۰ پاکستان

jabir.abbas@yahoo.com

